بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۲ — مئی - جون ۲۰۲۵ء مطابق ذی القعدہ - ذی الحجہ ۱۴۴۶ھ — شمارہ نمبر ۱۳ تا ۱۶

اسلام کی حفاظت اور اس کی دعوت

یقیناً اسلام کی حفاظت اور اس کی دعوت یہی دو وہ بنیادی مقاصد ہیں جن کو بروئے کار لانے کے لیے مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے، اور انہی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مدارس کا نصاب مرتب کیا گیا ہے؛ لیکن حالات کی تبدیلی اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں دین کی حفاظت کے طریقہ کو بہتر، دین اور دعوت کے اسلوب کو مؤثر بنانے کے لیے نئے راستے تلاش کرنے ہوں گے، اور نئے سے نئے، اور بہتر سے بہتر وسائل کا استعمال کرنا ہوگا؛ لیکن یہ خیال رکھتے ہوئے کہ نصاب میں اضافہ اور طریقۂ کار کی یہ تبدیلی مدارس کے مزاج، ان کی روح اور ان کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہو، اور مقصد کی تکمیل میں معاون و مددگار ثابت ہو، اس سلسلہ میں ہمیں رائج زبانوں، وقت کے تقاضوں اور معاشرہ کی ضرورتوں سے بھی واقف ہونے کی ضرورت ہے، ابلاغ و ترسیل کے نئے ذرائع کے استعمال کی ضرورت ہے، کردار کو اس طرح اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا کردار، ہماری عادات و اطوار ہمارے مقصد میں حائل نہ ہو سکے، مقصد کی ایسی عظمت دل میں بٹھانے اور اس سے ایسا والہانہ تعلق قائم کرنے کی ضرورت ہے کہ پھر کوئی دوسرا مقصد ہمارے لیے کوئی کشش نہ رکھے، قوم کو اس وقت ان صفات سے آراستہ نوجوانوں کی ضرورت ہے، اور قوم اس طرح کے نوجوانوں کو سر پر بٹھانے، آنکھوں میں بسانے اور ان پر اپنی دنیا لٹانے کے لیے تیار ہے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبد العزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیر حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی و امریکی ممالک کے لئے	$100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر 30/= ₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اِس خصوصی اشاعت میں

۱	ایک چراغ اور بجھا......	محمد عمیر الصدیق ندوی	۷
۲	'وکان امر اللہ قدراً مقدوراً'	مولانا بلال عبد الحی حسنی ندوی	۹
۳	اسلاف کی امانتوں کے عملی پیکر	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۳
۴	ایک المناک حادثہ	مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی	۱۵
۵	میرے مخلص عزیز بھائی	مولانا سید عمار عبد العلی حسنی ندوی	۱۶
۶	ضمیر پاک، نگاہ بلند، مستی شوق	ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی	۱۸
۷	ستودہ صفات شخصیت	مولانا عبد القادر عارفی	۱۹
۸	آج تم یاد بے حساب آئے	مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی	۲۰
۹	شرافت ونجابت کا پیکر	مولانا محمد فضل الرحیم مجددی	۲۳
۱۰	ملت اسلامیہ کا عظیم خسارہ	ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خان ندوی	۲۴
۱۱	ایک بڑا ملی وعلمی سانحہ	انجینئر سید سعادت اللہ حسینی	۲۶
۱۲	آبروئے بزم	مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی	۲۷
۱۳	وہ عظمتِ اسلاف کی درخشندہ نشانی	مولانا شکیل احمد اعظمی ندوی	۲۸
۱۴	آہ! ایک اور فرزندِ ندوہ رخصت ہوگیا	جناب ضیاء عبد اللہ ندوی	۲۹
۱۵	ایک مخلص معلم، داعی اور مفکر کا داغِ جدائی	مولانا عبد المتین منیری	۳۰
۱۶	خوشبو اُن کی یادوں کی	پروفیسر قاضی عبد الماجد ندوی	۳۱
۱۷	عجب اِک سانحہ سا ہوگیا ہے	ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	۳۲
۱۸	ایک ہمدم ودیرینہ رفیق کی رحلت	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۳۴
۱۹	رفتید ولے نہ از دلِ ما	مولانا اقبال احمد ندوی	۳۶
۲۰	خوش خلق، درافشاں	مولانا خورشید انور ندوی	۳۸
۲۱	ہائے رے چشم تصور تو نے کیا......	مفتی راشد حسین ندوی	۳۹

۲۲	علم و دانش کی متاعِ بیش بہا	مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی	۴۰
۲۳	باتوں سے پھول جھڑتے ہیں	ڈاکٹر سراج الدین ندوی	۴۳
۲۴	دل میں اتر جانے والا ہنر مند	ڈاکٹر ولی الدین ندوی	۴۶
۲۵	ایک سورج تھا کہ تاروں......	مولانا سید احمد ومیض ندوی	۴۷
۲۶	درویش صفت عالم دین کی رحلت	پروفیسر عبدالواسع ندوی	۵۰
۲۷	علم و ادب کی آبرو	ڈاکٹر محمد انس ندوی	۵۱
۲۸	یاد آتی ہیں تری باتیں	مولانا اسماعیل بھولا ندوی	۵۲
۲۹	لیکن تو چیزے دیگری	مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی	۵۴
۳۰	فکر و نظر کے آئینہ میں	مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی	۵۷
۳۱	مولانا جعفر حسنی جوارِ رحمت میں	حافظ عتیق الرحمٰن طیبی	۶۳
۳۲	دعوت فکر و نظر: ایک تعارف	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی	۶۴
۳۳	مولانا جعفر مسعود حسنی کی یاد میں	جناب فیروز عطا ندوی	۶۵
۳۴	علمی و روحانی ورثہ کی ایک نمایاں کڑی	مولانا وحید احمد ندوی ازہری	۶۶
۳۵	چراغِ راہ	مولانا محمد حسن ندوی	۸۱
۳۶	کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں	مولانا ناصر الدین مظاہری	۸۳
۳۷	مولاناؒ کی زندگی کے کچھ اہم پہلو	مولانا محمد عثمان ندوی	۸۴
۳۸	کاروانِ عزیمت کی ایک کڑی	ڈاکٹر محمد ہارون رشید ندوی	۸۷
۳۹	ملت کے لیے ایک عظیم خسارہ	مولانا سید کلیم اللہ ندوی	۹۱
۴۰	ندوہ کا ایک گل صد بہار	مولانا ادیب الرحمٰن ندوی	۹۴
۴۱	تمہاری نیکیاں زندہ......	مولانا محمد شمیم ندوی	۹۶
۴۲	'خیرکم خیرکم لأ ھلہ'	مفتی مسعود حسن حسنی ندوی	۹۹
۴۳	آہ! جعفر بھائی	ڈاکٹر محمد وثیق ندوی	۱۰۱
۴۴	فکر و عمل کے نقیب	ڈاکٹر محمد فرمان ندوی	۱۰۳

۴۵	برسے بغیر ہی جو گھٹا......	محمد جمیل اختر جلیلی ندوی	۱۰۵
۴۶	علمی وفکری روایت کے امین	عبد الرشید راجستھانی ندوی	۱۰۷
۴۷	علم وعمل کے حسین پیکر	محمد کلام الدین ندوی	۱۰۹
۴۸	بچھڑا کچھ اس ادا سے......	ارشاد علی افریقہ	۱۱۱
۴۹	کامیاب منتظم وصالح عالم دین	محمد ابو عامر ندوی	۱۱۳
۵۰	چند باتیں، چند یادیں	طلحہ بن ابوسلمہ ندوی	۱۱۴
۵۱	ایک شمع تھی دلیل سحر......	ڈاکٹر محمد اعظم ندوی	۱۱۵
۵۲	ماموں جی - کچھ یادیں، کچھ باتیں	منصور حسن حسنی ندوی	۱۱۹
۵۳	ایک متواضع عالم دین	ڈاکٹر محمد عزیر	۱۲۱
۵۴	چمن میں دیدہ ور پیدا	محمد قمر عالم ندوی	۱۲۲
۵۵	ابی - امتیازات وخصوصیات	خلیل احمد حسنی ندوی	۱۲۳
۵۶	ہمارے استاد محترم کی باتیں	محمد معین الدین ندوی قاسمی	۱۳۰
۵۷	ابی - کچھ یادیں، کچھ باتیں	محمد امین حسنی ندوی	۱۳۱
۵۸	مرا افسانہ رہے گا	محمد سلمان بجنوری ندوی	۱۳۵
۵۹	زندگی کی بے ثباتی آشکارا کرگئی	محمد اعظم شرقی ندوی	۱۳۸
۶۰	ملنسار اور خورد نواز چچا کی رحلت	سید شعیب حسینی ندوی	۱۴۱
۶۱	اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی......	محمد سعد خاں ندوی	۱۴۲
۶۲	مولانا کا اسلوبِ نگارش	محمد فہیم عبد الخالق ندوی	۱۴۳
۶۳	استادِ محترم کی انفرادیت	سید محمد عفان ندوی	۱۴۵
۶۴	اخلاق وکردار کے آئینہ میں	قیس خان جالونی	۱۴۶
۶۵	آہ! جعفر چچا - کچھ یادیں، کچھ باتیں	محمد معاذ مصباح	۱۴۹
۶۶	بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل	محمد نفیس خان ندوی	۱۵۱
۶۷	منظوم خراجِ عقیدت	ادیب الرحمٰن غزالی ندوی	۱۵۳

☆☆☆☆☆

اداریہ

ایک چراغ اور بجھا، اور بڑھی تاریکی

محمد عمیر الصدیق ندوی☆

دیکھتے دیکھتے دن ہفتوں اور پھر مہینوں میں بدلتے گئے، زندگی اپنی بے نیازانہ رفتار سے مقررہ سفر کے تقاضے پوری کرتی رہی اور خدا جانے باغ بہشت سے سفر کرتے رہنے کا یہ اذن وحکم کب تک ہجر وفراق کی منزلوں سے بنی آدم کو گزارتا رہے گا، اور ایک انسان کو زندگی کی اس آخری حقیقت کا اقرار کراتا رہے گا کہ ہم کو جانے والے کے فراق کا غم برداشت کرنا ہی ہوگا۔

اسی سال کے ابتدائی عیسوی مہینے کے عین وسط میں جب قیامت تک کے لیے جعفر مسعود حسنی کے لیے اچانک دنیا کی نظروں سے دوری ومستوری کی حقیقت' مشیت الٰہی کی صورت میں نمودار ہوئی تو درد وغم کی فطری انسانی سرشت بھی جیسے بے پناہ بن کر دل ودماغ کی ہر کیفیت پر چھا گئی۔

موت کا دوسرا نام یقین ہے؛ لیکن جعفر شہید کے حادثہ فاجعہ کے لیے جیسے یہ لفظ کچھ دیر کے لیے اپنے معانی سے آگے بڑھ کر اس معمے میں بدل گیا جو نہ سمجھ میں آئے اور نہ سمجھانے میں آئے، بس کسی دیوانے کے خواب کی طرح ہر تعبیر سے بے نیاز ہو کر رہ جائے۔

جعفر شہید کی موت پر یقین کا لفظ آج بھی جب کہ یادیں' مہینوں پر محیط ہوگئی ہیں، اپنی معنویت ثابت کرنے میں جیسے دل کو آمادہ کرنے پر قاصر ہے۔ ان سے جو ملتا، جب بھی ملتا، جہاں ملتا، وہ ملاقاتی کے لیے ناقابل فراموش یاد کی صورت میں ڈھل جاتا۔ جماعت اسلامی ہند کے امیر سید سعادت اللہ حسینی نے ایک ہی ملاقات کو یاد کرتے ہوئے لکھا کہ: ''اس ملاقات کی حسین یادیں اب تک ذہن ودماغ کے نہاں خانوں میں نقش ہیں اور ان کی اچانک وفات سے یقین نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے ہیں''۔ یہ احساس جس طرح ہر شخص کے دل وزبان سے ادا ہوتا رہا، وہ بھی جذبات کے اظہار میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

''تعمیر حیات'' نے ان کی وفات پر دل کے داغ دکھانے میں عجلت وتاخیر سے پرے ہو کر یہی سمجھا کہ جب دل کو کچھ قرار آئے تو پھر جعفر شہید کی یادوں کی دنیا بسائی جائے۔ جنوری سے اب تک کے عرصے میں ''پیام عرفات'' اور ''الرائد''

☆ نائب مدیر ''تعمیر حیات''، ندوۃ العلماء لکھنؤ

جیسے رسائل وجرائد نے جامع اور ضخیم خصوصی شمارے تیار کیے۔ خصوصاً ''پیام عرفات'' نے سینکڑوں تحریروں کو حاصل و یکجا کر کے نہایت مفصل خصوصی نمبر تیار کیا، جس کے بارے میں صحیح کہا گیا کہ اہل تعلق نے اس میں وسیع پیمانے پر جس محبت و اپنائیت کے ساتھ مضامین لکھے، اس سے جعفر شہید کی محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چار سو صفحات پر مشتمل یہ شمارہ ہر موضوع پر مکمل تھا؛ لیکن جعفر شہید کی محبوبیت کو صفحات کی تعداد میں محدود بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے ادارہ ''تعمیر حیات'' نے ان کی یاد میں اپنی خصوصی اشاعت کے خیال کو ترک نہیں کیا، مضامین کے حصول اور انتخاب کی کوششیں ہوتی رہیں، اور وقتی تاثرات کے ساتھ جعفر شہید کی زندگی کی ہمہ گیری بھی ملحوظ رہی، ہجر وفراق کی لہروں کے ساتھ صبر وثبات کے ساحلوں کی تلاش کا درد وکرب اپنی جگہ؛ لیکن یہی ساحل تو رضائے الٰہی کا اصل مقصود بھی ہے۔

خصوصی شمارے کی اشاعت میں صرف یہی جذبہ ہمہ وقت شامل رہا کہ ایک مسعود ومبارک زندگی کو باقیوں کے لیے مطلوب ومقبول شکل میں پیش کر دیا جائے، زبان وادب، انشاء پردازی اور قلم گیری کا اظہار کچھ زیادہ مقصود نہ ہو۔ الحمدللہ اسی نیت سے یہ شمارہ تیار کیا جاتا رہا، مدیروں کے نام ضرور ہیں؛ لیکن اصل محنت اور شبانہ روز کی کاوشیں ہمارے نوجوان معاونین مولانا محمد جاوید اختر ندوی، مولانا اصطفاء الحسن ندوی، مولانا نفیس خان ندوی اور ان کے رفقاء واحباب کی ہیں۔

بعض مضامین ماخوذ ومنقول بھی ہیں اور یہ ان کی افادیت کے باعث ہیں، ایک جگہ شاید زیادتی کا احساس ہو کہ ایک ہی ماتم گسار کی متفرق تحریروں کو جمع کر دیا گیا، اس کو تحریروں کے جمع ہونے سے زیادہ میر تقی میر کی زبان میں ''درد وغم کتنے جمع کیے تب دیوان ہوا'' کی مجذوبانہ کیفیت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہنا گو جملہ زائدہ ہے، تاہم وہ بہر حال ضروری ہے کہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی اور ''تعمیر حیات'' کے مشفق مدیر مولانا شمس الحق ندوی کی توجہات اور توقعات نے بھی ادارہ کی مستقل دست گیری کی۔

اصل غرض وغایت تو ایک نیک نفس انسان کی زندگی سے روشنی حاصل کرنا اور نئی نسل کی راہوں کو منور کرنا ہے۔ وہ جو پیکر زہد وعمل، صاحب ضمیر پاک ونگاہ بلند تھا، جس کی شخصیت کو ستودہ صفات اور یادگارِ کمالاتِ رابع و واضح، علم وادب کی آبرو اور علم ودانش کی متاعِ بے بہا، رجل رشید، مرد قلندر، ہمہ جہت اور بے شمار صفات وتعبیرات سے یاد کیا گیا کیونکہ وہ انسان ان لفظیات کا واقعی مستحق تھا۔

اسلامی فکر وثقافت میں صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت اور حسن رفاقت کو فضل من اللہ سے یاد کیے جانے کا پیغام ملتا ہے، یہی پیغام ''تعمیر حیات'' کی اس کاوش کی غرض وغایت ہے۔

☆☆☆

"وکان امر اللہ قدراً مقدوراً"

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی ☆

بدھ کی رات وہ خبر لائی جس نے دل ودماغ اور اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، کان خبر سننے کے لیے تیار نہیں تھے اور دل اس کو ماننے پر آمادہ نہیں تھا، مگر فیصلۂ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ دماغ میں گونجنے لگے: "يا ابراهيم! إنا بفراقك لمحزونون ولا نقول إلا بما يرضى به ربنا."

جعفر بھائی مرحوم ہم سے نو سال بڑے تھے، ان کی پیدائش دسمبر ۱۹۶۰ء کی ہے، ان کی والدہ ہماری حقیقی پھوپھی تھیں، ہمارے والد مرحوم سے بڑی لیکن پانچوں بہنوں میں سب سے چھوٹی، بڑی فرزانہ خاتون تھیں، دل فکر آخرت میں ڈوبا ہوا، انکار منکر میں سب سے آگے، حق شناس ہی نہیں ادائیگی حقوق میں فرد فرید۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور پھوپھی صاحبہ میں صرف دو سال کا فرق تھا اور بہنوں کی شادیاں ہوگئیں تھیں، لیکن دہلی پھوپھی کا' والد صاحب کا بہت ساتھ رہا، ہمارے پھوپھا مولانا واضح صاحب چونکہ دہلی چلے گئے تھے اور سالوں وہاں قیام رہا اور پھوپھی بھی دہلی میں ان کے ساتھ رہیں، اس لیے ہم سب بھائی ان کو دہلی پھوپھی کہا کرتے تھے، ہمارے دادا مرحوم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو جعفر بھائی مرحوم کے نانا تھے' حسن ظاہر و باطن سے آراستہ تھے، مولانا گیلانی اور مولانا دریابادی دونوں نے لکھا ہے کہ ان کو دیکھ کر فرشتوں کا گمان ہوتا تھا، جعفر بھائی کی ولادت ان کی زندگی میں ہوئی اور انہوں نے اپنے نانا کی نظر شفقت پائی، دادا مرحوم جناب سید رشید احمد صاحب تھے، ان کے پانچ فرزند ہوئے، بڑے صاحب زادے سید محمود حسن صاحب کا بھری جوانی میں انتقال ہوا، تیسرے محمد کا بچپن میں، دوسرے، چوتھے اور پانچویں کو اللہ تعالیٰ نے آفتاب و مہتاب بنا کر چمکایا اور ایک عالم نے ان سے فیض اٹھایا، سید خلیل الدین صاحب جوان حضرات کے دادا تھے، محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سرشار تھے، انہوں نے طے کیا تھا کہ جتنے پوتے ہوں گے سب کے نام محمد رکھوں گا۔

بڑے پوتے محمود کے نام سے پہچانے گئے، ان کا نام محمد الاول تھا، ان کا انتقال بھری جوانی میں ہوا، دوسرے مولانا محمد ثانی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو بڑے مصنف، مؤرخ، ادیب وشاعر اور سب سے بڑھ کر صاحب دل تھے، حضرت شیخ کے مجاز بیعت وارشاد تھے، ان تمام صفات کے باوجود بڑائی کا احساس چھو کر نہیں گیا تھا، تبلیغ میں مولانا یوسف صاحب کے ساتھ ان کا بڑا وقت لگا تھا، سوانح یوسفی ان کی شاہکار کتابوں میں ہے، والدہ کے لیے جان نچھاور کرنے والے، رائے بریلی اور اطراف میں ان کے ذریعہ سے دعوت وارشاد اور اشاعتِ علم کا بڑا کام ہوا، اپنی والدہ کی زندگی میں انہوں نے وفات پائی، تیسرے نے بچپن میں وفات پائی، چوتھے مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ تھے جو اس لڑی میں واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو طویل عمر دی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ جانشین ہوئے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک عالم کو فیض یاب کیا، اخلاق کی بلندی، اخلاص وتواضع میں ان کی مثال ملنی مشکل ہے، اخیر میں وہی مرجع علماء و مشائخ تھے، خواص وعوام کو وہیں دل کی تسکین کا سامان ملتا تھا، ۹۳/سال کی عمر میں رمضان کے مبارک مہینے میں وفات پائی، ان بھائیوں میں سب سے چھوٹے مولانا محمد واضح رشید تھے جن کا اصل نام محمد الخامس تھا، لیکن واضح کے نام سے شہرت پائی، اللہ تعالیٰ نے مولانا کو "مجمع البحرین" بنایا تھا، ایک طرف رسوخ فی العلم، دینی پختگی اور دوسری طرف بالغ نظری، دیدہ وری، چیلنجز سے صرف واقفیت ہی نہیں' ان کا مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت، اللہ نے ان کو ایسا دل دیا تھا جو آئینے کی طرح شفاف تھا، اس میں وہ دوسروں کا عکس محسوس کر لیا کرتے تھے اور امت کے لیے درد و بے چینی، حالات کی چبھن نے ان میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی جو خاصان خدا کی خاصیت ہوا کرتی ہے۔

جعفر بھائی مرحوم مولانا کے اکلوتے فرزند تھے، بچپن دہلی میں گزرا، وہیں حفظ کا آغاز ہوا، تقریباً ۱۰/ پارے ہوئے تھے کہ والد صاحب حضرت شیخ کے ایما پر سب کچھ چھوڑ کر ندوہ تشریف لے آئے، یہ قربانی معمولی نہیں تھی، تنخواہ میں آٹھ دس گنا کا فرق تھا، مگر اللہ کے لیے انہوں نے سب تج دیا، معمولی تنخواہ پر ندوہ کے ہو رہے، جعفر بھائی

☆ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مرحوم نے ندوہ میں حفظ مکمل کیا اور تراویح کا پہلا دور تکیہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا، ان کو قرآن اچھا یاد تھا اور خوب پڑھتے تھے، پھر جب ہمارے بڑے بھائی مولانا سید عمار حسنی صاحب کا حفظ مکمل ہوا تو وہ تراویح سنانے میں شریک ہو گئے پھر حضرت مولانا کے اخیر دور تک یہی دونوں تراویح سناتے رہے۔

وہ ذہین بھی تھے اور حافظہ بھی قوی تھا، اس لیے تعلیم کے دوران کامیابی کے ساتھ آگے بڑھے، مختلف کھیلوں کی ان کو اچھی مشق تھی، غالباً ۱۹۸۵ء میں فراغت ہوئی اور مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں استاذ مقرر ہوئے، اس زمانے میں یہ مدرسہ مسجد خدا بخش میں تھا، اس مدرسے میں تقریباً ۳۸ سال انہوں نے یکسوئی کے ساتھ تدریس میں گزارے، اس کے لیے وہ بڑی محنت کرتے، اہتمام سے مطالعہ کر کے جاتے، ابتدائی کتابوں سے لے کر منتہی کتابوں تک انہوں نے درس دیا، اخیر میں سالوں مشکوٰۃ شریف ان کے زیر درس رہی، اس دور کے طلباء ان کے انداز تدریس سے بہت متاثر ہوتے تھے، عربی ان کی شروع سے بہت اچھی تھی، متعدد طلبہ مختلف اوقات میں ان سے انشاء پڑھنے آیا کرتے تھے اور وہ بڑی خوش دلی سے ان کو پڑھایا کرتے تھے۔

ان کے اخلاق سے مدرسہ کے اساتذہ اور منتظمین ہمیشہ متاثر رہے، ان کا مزاج دوسروں کے کام آنے اور مدد کرنے کا تھا، یہ چیز اخیر میں تو اتنی بڑھی کہ اللہ کے خاص بندوں کو یہ بلند صفت حاصل ہوتی ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کو اپنے پوتوں نواسوں میں ان سے خاص تعلق تھا، حضرت ان کو اپنے ساتھ بیرونی سفر پر بھی لے گئے، جس میں ان کی اہم علماء و ادباء سے ملاقاتیں رہیں، مختلف جلسوں میں وہ شریک ہوئے، پھر حضرت کی وفات کے بعد انہوں نے ۲۰۰۰ء میں سفر حج کیا، ان کی والدہ بھی ساتھ تھیں اور ہم تینوں بھائی؛ مولانا عبداللہ صاحب، مولانا عمار صاحب اور ہم ساتھ تھے، پورے سفر میں انہوں نے والدہ کی بھرپور خدمت کی اور خوب دعائیں لیں، اس سفر میں حضرت مولانا یونس صاحب جونپوریؒ سے ان کی ملاقات ہوئی اور ان کی بڑی شفقت ان کو حاصل ہوئی۔

اخیر میں حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب کے یہاں دو مرتبہ حاضر ہوئے، وفات سے چند دن پہلے جو سفر علی گڑھ کا ہوا، اس میں رات کا قیام حکیم صاحب کے یہاں ہوا اور حضرت نے خصوصی توجہ فرمائی، وفات کے بعد حکیم صاحب کا جو خط آیا اس سے ان کے تعلق خصوصی کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۹۰ء میں وہ ٹیچر ٹریننگ کورس میں شریک ہونے کے لیے کئی ماہ کے لیے ریاض بھی گئے اور وہاں کے علماء و ادباء سے ان کو استفادہ کا موقع ملا۔

ہمارے مربی اور ولی نعمت برادر اکبر مولانا عبداللہ حسنی صاحبؒ نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے جو حج کیا تھا، اس میں جعفر بھائی مرحوم بھی تھے اور عزیزی محمود حسنی مرحوم تھے اور یہ گنہگار بھی، سب کے گھر والے ساتھ تھے، آٹھ نفری قافلہ تھا، وہ وقت بھی انہوں نے بہت اچھا گذارا۔

اس سے پہلے ایک سفر انہوں نے اپنے عم نامدار حضرت مولانا رابع صاحب حسنی ندویؒ کی رفاقت میں بھی کیا، جس میں رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس میں شرکت ہوئی اور عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی، اس میں ان کے والد ماجد حضرت مولانا واضح رشید صاحبؒ بھی تھے، انہوں نے دونوں حضرات کی خدمت کی، خدمت میں ان کا ذوق اجتہادی تھا، راحت پہنچانے کے وہ طریقے تلاش کر لیا کرتے تھے۔

انہوں نے اپنے والدین کی مثالی خدمت کی، خاص طور پر جب والدہ کی بیماری معذوری کی حد تک پہنچ گئی تو تقریباً سال بھر یہ سلسلہ رہا اور معذوری کا ان کا بڑا زمانہ رائے بریلی میں گذرا تو جعفر بھائی نے روزانہ لکھنؤ سے رائے بریلی آنے کا معمول بنایا، سردی ہو، گرمی ہو، بارش ہو، ایک دن بھی ان کے معمول میں فرق نہیں آیا، سخت موسم میں روزانہ بس سے آنا اور جانا آسان کام نہیں تھا، پھر ان کی راحت رسانی کے لیے ہر طرح وسائل مہیا کرنے کی کوشش کرتے، ہماری پھوپھی صاحبہ بڑی ولی صفت خاتون تھیں، اپنے اکلوتے فرزند کے لیے انہوں نے جس طرح دعائیں کیں، اس کے اثرات کھلے ہوئے جعفر بھائی کی زندگی میں ظاہر ہوئے۔

والدہ ماجدہ کی حیات میں بھی والد صاحب کی ساری ضروریات کا خیال بھی رکھتے تھے، والدہ کی وفات کے بعد تو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا ان کو دھیان رہتا تھا، پھر دونوں بھائیوں کی مثالی یکجائی ایسی تھی کہ جعفر بھائی والد صاحب کے ساتھ اپنے عم نامدار کا بھی ویسے ہی خیال رکھنے لگے، مولانا واضح صاحب کی وفات ہوئی تو یہ سنت بھی ادا ہوئی کہ ان کا سر جعفر بھائی کی گود میں تھا اور وہ خود کہہ رہے تھے کہ پڑھو پڑھو، جعفر بھائی کہتے تھے کہ ہم نے اور تمام حاضرین نے سورۂ یاسین شروع کی، وہ مکمل ہو رہی تھی اور والد صاحب کے ہونٹ ہل

رہے تھے کہ روح پرواز کرگئی۔

والد صاحب کی وفات کے بعد ان کے لیے عم نامدار ہی سب کچھ تھے، پھر ان کی وفات تک جس طرح جعفر بھائی نے پوری تندہی کے ساتھ ایک اطاعت شعار فرزند کی طرح خدمت کی، وہ بھی ایک مثال ہے، یہ زمانہ تیزی کے ساتھ ان کے عروج کا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو قلم کی طاقت عطا فرمائی تھی، عربی اور اردو میں یکساں، ان کی تحریریں بڑی ادبی اور مؤثر ہوتی تھیں، اردو میں ان پر مولانا عبد الماجد دریابادی کا رنگ نظر آتا تھا اور عربی میں انہوں نے خود بڑا خوبصورت اسلوب اختیار کیا تھا جو آسان بھی تھا اور مؤثر بھی۔

پندرہ روزہ "الرائد" میں ان کو شامل کیا گیا اور برادر اکبر مربی و مشفق مولانا عبد اللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد وہ مدیر التحریر متعین کیے گئے، شروع میں "براعم الایمان" کے نام سے جو کالم انہوں نے شروع کیا وہ بہت مقبول ہوا، بعض اہل تعلق نے بتایا کہ "الرائد" آتا ہے تو سب سے پہلے ہم یہی کالم پڑھتے ہیں، الحمد للہ اس کا مجموعہ ان کی زندگی ہی میں "أخي العزيز" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا، پھر مولانا واضح صاحب کی وفات کے بعد وہ رئیس التحریر منتخب ہوئے تو اداریے ان کے قلم سے آنے لگے، اس میں متنوع مفید موضوعات پر جس سادگی اور ادبیت سے بھرپور مؤثر اسلوب میں انہوں نے مضامین لکھے، وہ بھی شاہکار ہیں، اپنی وفات سے پہلے انہوں نے وہ اداریے بھی جمع کر دیے تھے اور ان کی زندگی ہی میں وہ کتاب پریس میں چلی گئی تھی جو "خواطر" کے نام سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی: "وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَراً مَّقْدُوراً".

وہ اپنے کام کے دھنی تھے، جب کسی کام کو شروع کرتے تو پوری توجہ کے ساتھ کرتے، تقریباً تیس پینتیس سال پہلے انہوں نے حضرت رحمہ اللہ کی تقریروں کو جمع کرنا شروع کیا، وہ موبائل کا زمانہ نہیں تھا، انہوں نے نہ جانے کس کس طرح کیسٹوں کے ذریعہ تقریریں جمع کیں اور پھر ان کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا، خاتون منزل کے اپنے گھر میں اوپر کے کمرہ کو انہوں نے اس کا مرکز بنالیا، دیر دیر رات تک وہ تقریریں سنتے، شروع میں تعارف کراتے اور سینکڑوں کی تعداد میں اس کی کیسٹیں تیار کر کے ان کو عام کرنے کی کوشش کرتے، اس طرح حضرت رحمہ اللہ کی پچاس سے زائد تقریریں محفوظ ہوگئیں اور بعض بہت قدیم تقریریں بھی حاصل ہوئیں، اگر ان کی یہ کوشش نہ ہوتی تو شاید بہت کم تقریریں آج موجود ہوتیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کاموں کو ان کے لیے بہترین صدقہ جاریہ فرمائے۔

برادر محترم مولانا سید محمد حمزہ حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد دوسرے دن جعفر بھائی ہم کو الگ کمرے میں لے گئے اور کہا کہ تمہارا نام ناظر عام کے لیے تجویز ہوا ہے، ہم نے بہت اصرار کیا کہ اس کے لیے آپ زیادہ موزوں ہیں، لیکن اصرار کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

مولانا واضح صاحب کی وفات کے بعد ان کو ندوہ کی انتظامیہ اور نظامت کا رکن منتخب کیا گیا تھا، اس کے بعد ان سے بہت مفید مشورے ملنے لگے، حضرت مولانا کی وفات کے بعد جب نظامت کے لیے اس گنہگار کا نام طے کر دیا گیا تو سب ہی نے متفقہ طور پر جعفر بھائی کا نام ناظر عام کے لیے تجویز کیا، جس کو اصرار کے بعد انہوں نے قبول کیا، پھر ان دو سالوں میں ہر حیثیت سے انہوں نے جو خدمت کی ندوہ کی، ملت کی، دینی اداروں کی، وہ مثال ہے۔ دو سالوں میں انہوں نے دسیوں سال کا کام کر ڈالا، وہ ابتداء میں مقرر نہیں تھے، لیکن انہوں نے جب دین کی خدمت کے لیے اس کو ضروری سمجھا تو محاذ سنبھال لیا اور اللہ نے ان کی زبان کو ایسا رواں کر دیا کہ حیرت ہوتی تھی، پھر دل کی جس حرارت اور جذبے سے وہ بات کہتے، وہ دلوں میں اترتی جاتی تھی، ان دو سالوں میں انہوں نے سینکڑوں خطاب کیے، ہندوستان کے مختلف شہروں کے دورے کیے اور ایک طویل سفر امارات اور حجاز مقدس کا کیا اور وہاں بھی ان کی تقریروں کو سن کر لوگ دنگ رہ گئے اور خاص اثر مختلف طبقات میں محسوس کیا گیا۔

وہ جس تیزی کے ساتھ کام نمٹانا چاہتے تھے، لگتا تھا کہ کسی نے ان کے کان میں صور پھونک دیا ہو کہ وقت کم ہے، جس طرح جہاز رن وے پر دوڑتا ہے پھر اچانک پرواز کر جاتا ہے، یہی صورت حال ان کے ساتھ نظر آتی تھی۔

وہ خود کہتے تھے کہ سب سے بڑی چیز اخلاق کی بلندی ہے جو اسوۂ رسول ہے اور عمو جان کو اللہ نے یہ بلندی عطا فرمائی، ہم نے بھی طے کرلیا ہے کہ انہی کے راستے پر چلنا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے کر کے دکھا دیا، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے ملنے والوں کے ساتھ انہوں نے جس اخلاق و محبت اور اپنائیت کا معاملہ کیا' حیرت ہوتی تھی کہ وہ کس طرح اپنی مشغولیت کے باوجود وقت نکال لیتے تھے، گھروں میں جانا، تسلی دینا، غمی وخوشی میں شریک ہونا اور صرف اس لیے کہ یہ حکم

شریعت ہے، وفات سے ایک دن پہلے جب وہ رائے بریلی جانے لگے تو ڈاکٹر ناصر صاحب کے یہاں ملنے گئے، وہ عمرہ کرکے آئے تھے، پھر ڈاکٹر نسیم صاحب کے گھر گئے، انہوں نے ہم کو پوچھا تو کہا کہ بلال کا انتظار کرتے تو نہ آپاتے، پھر حبیب لانڈری والے جن کا حضرت سے بہت تعلق تھا، ان کے یہاں گئے اور کپڑوں کی دھلائی کا حساب کیا، ندوہ کی گاڑی کا حساب کیا، نہ جانے کیا ان کے دماغ میں تھا، لگتا تھا کہ ہر چیز سے فارغ ہوکر جانا چاہتے ہیں۔

ادھر ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا تھا، اپنے بچوں سے کہتے تھے کہ گھر بار تم لوگ سنبھالو، ہم کو ندوہ کے کام سے فرصت نہیں، مزاج میں سادگی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر میں کبھی اس کی اجازت نہیں دی کہ پرکاری کی جائے، ٹائلز لگیں، اے سی جو اب وقت کی ضرورت ہے اس کو لگانا بھی گوارا نہیں تھا، ان کے فرزند اکبر عزیز القدر مولوی سید خلیل احمد سلمہ نے زبردستی لکھنؤ کے گھر میں اے سی لگوادیا تو ان کو عام طور پر چلانا بھی گوارا نہ ہوتا تھا۔

ملازمت میں ان کو اچھا مشاہرہ ملتا تھا، مگر اس کا بڑا حصہ دوسروں پر صرف ہوجاتا تھا، ان کا ہاتھ بہت کھلا تھا، لکھنؤ میں بھی اور رائے بریلی میں بھی اہل تعلق آتے اور وہ کسی کو خالی نہ بھیجتے بلکہ اکثر تحقیق کرکر کے لوگوں کے کام آتے، کوئی بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کو جاتے اور علاج معالجے کی فکر کرتے۔

کوئی ملنے آتا تو اس کی خاطر تواضع کرتے، باہر تک رخصت کرنے جاتے اور انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے، لاک ڈاؤن کے بعد جب رائے بریلی حضرت سے ملنے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ایک کے کھانے پینے کا اہتمام ایسا کرتے کہ پریشان ہوجاتے، آنے والوں کا ایک تسلسل تھا، بالآخر ہم نے کہا کہ جعفر بھائی آپ جو کررہے ہیں یہ اس حد تک بہت مشکل ہے، آپ اپنے اوپر رحم کھائیے، مگر وہ چیز ان کے مزاج میں داخل تھی، رمضان المبارک میں بھی آنے والوں میں اہل تعلق کو گھر لے جاتے اور الگ سے ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے۔

لیے دیئے رہنے کا مزاج ان کا کبھی نہیں رہا، بچوں کے ساتھ دل لگی کرتے اور خوش ہوتے، اپنے دوستوں سے بے تکلف رہتے اور عام لوگوں سے بھی ایسی بے تکلفی سے ملتے کہ کہیں سے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ کسی منصب پر فائز ہیں۔

وہ ہم سے بہت بڑے تھے، ہم ان کو اپنے سرپرستوں میں شمار کرتے تھے، لیکن وہ حد درجہ لحاظ رکھتے تھے، ندوہ کے معاملات میں اگر کوئی ان کی رائے ہوتی تھی تو بغیر مشورے کے کبھی اس پر عمل نہ کرتے۔

عجیب بات ہے کہ رائے بریلی کے آخری سفر کے ایک روز پہلے ہمارے کمرہ میں تشریف لے آئے، ہمارے محترم مولانا اسماعیل بھولا بھی تشریف رکھتے تھے، دیر تک مسائل پر گفتگو رہی اور مشورے کیے، بہت سی تجاویز تحریر میں لائی گئیں، کیا پتہ تھا کہ یہ ان کی آخری وصیتیں ہیں، اسماعیل بھائی کو جانا تھا عمرے کا ارادہ تھا، ان کو رخصت کرنے ایئرپورٹ تک گئے، پھر گھر آئے، دوپہر کے کھانے میں شرکت رہی، باتیں بھی ہوتی رہیں، پھر ہم جاکر اپنے کمرے میں لیٹ گئے اور وہ عصر سے پہلے سلام کرتے ہوئے رائے بریلی تشریف لے گئے۔ کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے، رائے بریلی پہنچ کر اسی دن وہ بعد مغرب شہر جانا چاہتے تھے، حافظ عبدالقادر جو مولانا عبدالباری صاحب، سابق مہتمم مدرسہ فلاح المسلمین کے فرزند تھے، ان کو کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا، گھر والوں نے روکا کہ سردی بہت ہے، مغرب بعد جانا مناسب نہیں، ڈاکٹر نے شاید مغرب بعد ہی کا وقت دیا تھا، اس لیے دوسرے دن مغرب بعد شہر گئے اور حافظ عبدالقادر کو بائک پر بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس جارہے تھے، سردی بہت تھی، ہائی وے پر رکے اور اتر کر مفلر ٹھیک کرنے لگے، اسی اثنا میں ایک تیز رفتار کار آئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ قریب سے ایسی گذری کہ دونوں کو دروازہ کی مار لگی اور منٹوں میں وہ سب کچھ ہوگیا جس کا دور دور سے تصور نہیں تھا: ''وَ كَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَراً مَّقْدُوراً''۔

اولاد کی تربیت کا ان کو ہمیشہ خیال رہا، اللہ نے ان کے تینوں بیٹوں اور بیٹی کو عالم بنایا جو ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے، محبت کبھی روک ٹوک میں مانع نہیں بنی، الحمدللہ ان کے فرزندان اپنے باپ دادا اور نانا ہی کے راستے پر ہیں، تدریس، تصنیف و تالیف سے تعلق ہے اور الحمدللہ دعوت و ارشاد کا کام بھی کررہے ہیں، ماشاء اللہ سب کی شادیوں سے وہ بہت پہلے فارغ ہوچکے تھے اور تینوں بیٹوں کی اولاد کو انہوں نے دیکھا، اللہ تعالیٰ سب کو صحت و عافیت کے ساتھ عمر طویل عطا فرمائے اور اپنے اسلاف کا حقیقی معنوں میں جانشین بنائے اور جعفر بھائی کے درجات بلند فرمائے اور ان کو اپنے بلند پایہ اسلاف کے ساتھ شامل فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

اسلاف کی امانتوں کے عملی پیکر

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ☆

خانوادۂ علم اللہی میں متعدد نمایاں افراد ہیں، جنہوں نے پوری زندگی دین کی تبلیغ واشاعت میں لگادی ہے، یہ خانوادہ مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے ساتویں ہجری میں ہندوستان آیا، اس کے پیش رو حضرت قطب الدین مدنی تھے، جن کی قبر ”کڑا“ میں موجود ہے، اس کے اخلاف میں حضرت شاہ علم اللہ حسنی کی شخصیت بڑی مشہور رہی ہے، وہ اپنے وطن نصیرآباد سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کے لئے رخت سفر باندھ چکے تھے کہ ایک اللہ والے کے کہنے پر انہوں نے تکیہ میں قیام کا فیصلہ کیا، ان کا اصلاحی و تربیتی تعلق حضرت سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، جو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے خلفاء میں تھے، اس سے پہلے ان کی زندگی ایک فوجی افسر کی حیثیت سے رہی، اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی تھی، ان کی سنت نبوی کی پیروی کی مثال دی جاتی تھی، لوگ ان کی شخصیت سے بہت متأثر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تکیہ کی سرزمین کو آباد کرنے کا ذریعہ بنایا، ان کی قبر وہیں ہے۔

ان کے بعد حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کی شخصیت اس خانوادہ میں نمایاں رہی ہے، حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے دین کے شعائر کی تجدید کے لئے قبول فرمایا، انہوں نے مشرکانہ رسومات کا قلع قمع کیا، بدعات وخرافات کو مٹایا، ان کے ذریعہ ہزاروں لوگوں کو توبہ کی توفیق حاصل ہوئی اور وہ گناہوں سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں شامل ہوئے، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فریضہ حج کا احیاء کیا، جس کو لوگ چھوڑ چکے تھے، اور سمندری راستہ کے خطرناک ہونے کی وجہ سے اس کی عدم فرضیت کے سلسلہ میں فتویٰ دے چکے تھے، لیکن حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑے قافلہ کے ساتھ حج کا سفر کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سلامتی کے ساتھ واپس آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاد فی سبیل اللہ جیسے مبارک عمل کو بھی زندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی، انہوں نے مجاہدین کی جماعت کے ساتھ بالاکوٹ کو سفر کیا اور وہاں مجاہدانہ سرگرمیاں جاری رکھی اور شہید راہ وفا قرار پائے۔

اس خانوادہ کی نمایاں شخصیتوں میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ہیں جو ہند میں سرمایہ ملت کے نگہبان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ان کی شخصیت ہشت پہل تھی، وہ ندوۃ العلماء کے ناظم، مسلم پرسنل لا کے بورڈ کے صدر، دینی تعلیمی کونسل کے صدر، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے قافلہ سالار اور عالم اسلام کی منتخب شخصیت تسلیم کئے جاتے ہیں، وہ جامع الکمالات شخصیت تھے، جن سے نسلیں فیض یاب ہوتی رہیں گی۔ ان کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر رہے اور ملت کی رہنمائی اور دست گیری کرتے رہے۔

انہیں اسلاف کی امانتوں کے عملی پیکر عزیز گرامی مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی تھے، وہ مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کے فرزند تھے، وہ زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں تو دہلی میں رہے، جہاں وہ اپنے والد کے ساتھ مقیم رہتے تھے، پھر وہ بیسویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی میں اپنے والد کے ساتھ ندوہ آئے اور پہلے حفظ کی تعلیم مکمل کی، ان کے استاذ حافظ حشمت اللہ صاحب رہے، جنہوں نے ان پر خاص توجہ دی، اس کے بعد وہ معہد دار العلوم منتقل ہوئے، اور اس میں ثانویہ کی تعلیم حاصل کی، پھر عالمیت اور فضیلت کی بھی تعلیم حاصل کی، دوران تعلیم ایک نمایاں طالب علم کی حیثیت سے رہے، ان کے مضامین ”الرائد“ میں بھی شائع ہوتے تھے، جن سے ان کی علمی وادبی صلاحیت کا اندازہ ہوتا تھا، اسی کے ساتھ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے ایم اے بھی کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ریاض، سعودی عرب کے دورہ تدریبیہ میں شرکت کا موقع بھی دیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ وہاں کا سفر بھی کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا جعفر مسعود ندوی جناب قاری مشتاق احمد پرتاپگڑھی کے مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے وابستہ ہوگئے، اور وہیں علوم اسلامیہ وادبیہ کی کتابیں پڑھاتے رہے، جو طلباء وہاں سے پڑھ کر آتے وہ ان کی صلاحیت ولیاقت کے بارے میں بتاتے، اس طرح معلوم ہوا کہ وہ طلباء میں تدریس کی وجہ سے مقبول تھے، ان کی تدریس کا زمانہ کئی دہائیوں پر مشتمل ہے، اور شروع سے اخیر تک اس مشن کو دعوتی واصلاحی ذمہ داری سمجھ کر انجام دیتے تھے، عرفانیہ میں تدریس کے زمانہ سے ان کا الرائد سے ادارتی تعلق ہو گیا تھا، وہ ۲۰۰۳ء سے اس میں بچوں کا گوشہ لکھتے تھے، وہ گوشہ بڑا مقبول رہا، اس کا مجموعہ ابھی کورونا کے بعد شائع ہوا تو انہوں نے مجھ سے بھی مقدمہ کے لئے کہا، میں نے چند کلمات

☆ مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء و رئیس التحریر مجلہ ’البعث الاسلامی‘، لکھنؤ

لکھے، وہ کتاب شائع ہو چکی ہے ، اور اس میں چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں ، جو عربی زبان کے طلباء کے بیحد مفید ہیں ،انہوں نے اردو میں بھی کچھ مضامین لکھے ہیں ،جن کا مجموعہ ’’دعوت فکر ونظر‘‘ کے نام سے شائع ہوا ہے ،اس پر بھی مجھ سے مقدمہ کے لئے کہا، میں نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے:

’’اس کتاب کے مؤلف ومرتب جناب مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی ہیں، سادات حسنیہ رائے بریلی کے معروف عالم دین ، اور عربی واردو کے ادیب کی حیثیت سے ایک بلند مقام کے مالک ہیں، ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے عربی جریدہ کے مدیر اور ادب اطفال کے خصوصی کالم نگار ہیں، ہر شمارہ میں ان کے لئے عربی زبان وادب کا ایک گرانقدر تحفہ پیش کرتے ہیں ، اور ادب الاطفال میں عربی زبان کے ایک خاص اسلوب تعبیر میں ان سے ہم کلام ہوتے ہیں ۔اسی کے ساتھ اردو زبان وادب میں ان کے مقالات ایک خاص وزن رکھتے ہیں ، ملک کے مختلف رسالوں اور جرائد میں ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں اور وہ طرز تحریر میں جداگانہ رنگ رکھتے ہیں، واقعات کا تجزیہ اور اس سے مثبت و منفی دونوں پہلوں کو اجاگر کرنا اور اس کے لئے نہایت موثر اور عبرت انگیز نتائج کا نکالنا، ان کی خاص پہچان ہے ، میں جہاں تک سمجھتا ہوں ان کے منفرد اسلوب بیان کی ، یہی دراصل امتیازی شان ہے، ان کے اسلوب تحریر میں میں نے محسوس کیا کہ اس ملک کے صاحب طرز ادیب مولانا دریابادی کا رنگ بھی کسی حد تک شامل ہے‘‘ (مقدمہ کتاب)۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی تحریر کے ساتھ تقریر وخطابت میں بھی امتیاز رکھتے تھے ، وہ ندوۃ العلماء کے ناظر منتخب ہونے کے بعد متعدد جلسوں میں شریک ہوتے اور ان میں اپنے بیانات سے سامعین کو مستفید کرتے تھے ، میں نے ان کے انتقال پر ایک پیغام میں کہا ہے: کہ مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی ایک باکمال ادیب ، اچھے خطیب ، کامیاب استاذ اور کہنہ مشق صحافی تھے ، انہوں نے اپنے والد کی نگرانی میں عربی صحافت میں کمال پیدا کیا تھا ، وہ صحافیانہ مہارت کے ساتھ عربی رسالہ نکال رہے تھے ، ان کے اخلاق میں نرمی اور تواضع تھی ، وہ جب بھی ملتے محبت واپنائیت کے احساس کے ساتھ ملتے ، ان کا حادثہ وفات میرے لیے اور ندوۃ العلماء کے لیے گہرے صدمہ کا باعث ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے ، اور ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا عظیم خسارہ

قاری سید حبیب احمد باندوی☆

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری

حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی صاحب کا سانحہ ارتحال قوم وملت کا عظیم خسارہ ہے، اس دور قحط الرجال میں رہنمایان قوم ایک ایک کر کے اللہ کے دربار میں اپنے اخلاص وعمل کا صلہ لینے کے لیے حاضر ہوتے جارہے ہیں۔

حسنی خانوادے سے میرے خاندانی تعلقات رہے ہیں؛ اس لیے صدمہ بھی زیادہ محسوس کیا جارہا ہے، موصوف ادیب شہیر عالم بافیض حضرت مولانا واضح رشید صاحب کے فرزند ارجمند اور مرشد الامت حضرت مولانا رابع الحسنی صاحب کے داماد تھے اور حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی صاحب کے ناظم ندوہ طے ہونے کے بعد ندوہ کے ناظر عام ہوگئے تھے جو انتہائی حساس ذمہ داری ہے، ندوہ کا ناظر عام ہونا مولانا موصوف کے بیدار مغز منتظم اور مدبر ہونے کی روشن دلیل ہے۔

موصوف متنوع کمالات کے مالک تھے، کئی زبانوں پر عبور تھا، عربی اور اردو زبانوں کے صاحب طرز ادیب اور قلم کار تھے؛ چنانچہ پندرہ روزہ "الرائد" [عربی] کے ایڈیٹر تھے، کامیاب مدرس اور معتمد خطیب تھے، اخلاص کا نور ان کے چہرے پر چمکتا تھا، مولانا کا درس قرآن بہت مقبول تھا، شیریں اور شگفتہ مزاج تھے، اصول پسند، وقت کے قدرداں، نسل نو کے لیے آئیڈیل اور نمونہ تھے۔

مدتوں زمانہ موصوف کو یاد رکھے گا، ان شاء اللہ ان کے حسنات کا سلسلہ تا ابد رہے گا، ملک اور بیرون ملک ان کے پھیلے ہوئے ہزاروں شاگرد بہترین صدقہ جاریہ ثابت ہوں گے اور ان کی خیر کی مہمات کو آگے بھی جاری رکھیں گے۔

میں ندوہ اور مولانا موصوف کے پس ماندگان کو تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہشت بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا اس کو پُر فرمائے:

☆☆☆☆☆

☆ ناظم جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ، یوپی

ایک المناک حادثہ

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی ☆

افسوس کہ یہ ناچیز ۱۴/جنوری ۲۰۲۵ء کو شیخ طحنون اسپتال میں ایک حادثے سے دوچار ہونے کی وجہ سے داخل ہوا کہ اچانک ۱۵/جنوری کو یہ خبر کانوں میں پہنچی کہ مولانا جعفر مسعود اچانک اس دنیا سے رحلت فرما گئے، انا للہ وإنا إلیہ راجعون.

عزیز گرامی کا اس ناچیز سے خصوصی تعلق ندوۃ العلماء کے فضلاء میں سے رہا ہے، مولانا رحمہ اللہ ہمارے دوست مولانا سید محمد واضح رشید حسنی رحمۃ اللہ علیہ ادیب اریب اور مشہور صحافی کے فرزند تھے۔ ان کے عظیم والد نے ان کی خصوصی تربیت، اخلاقی وادبی اور مترجم کی حیثیت سے کی تھی۔ وہ ۲۰۲۳ء سے ۲۰۲۵ء اپنی وفات تک ندوۃ العلماء کے ناظر عام رہے؛ بلکہ ناظم ندوۃ العلماء کے دست راست اور قوت بازو تھے۔ اس ناچیز کا اتصال ٹیلیفون کے ذریعہ عام طور پر انہی سے رہا۔

اس وقت میں اس حال میں نہیں ہوں کہ کچھ ان کی خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈال سکوں، ہمارے صاحبزادہ ڈاکٹر ولی الدین ندوی جو محمد بن زاید یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، وہ ان کے خاص دوستوں میں ہیں، ان کا اصرار ہوا کہ چند کلمات لکھوا دیں۔

مولانا جعفر مسعود ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو علمی وروحانی اور دعوتی میدان میں ہندوستان میں نمایاں کردار ادا کرتا رہا، وہ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب نور اللہ مرقدہ اور اپنے والد کے تربیت یافتہ تھے، انہوں نے آخری مقالہ جے پور میں پڑھا، مجھے اس سے خوشی ہوئی، میں نے ان کو مبارک باد دی۔

وہ عرصہ دراز تک مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں حدیث وادب کے استاذ رہے ہیں، انہیں ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام شائع ہونے والے پندرہ روزہ عربی رسالہ "الرائد" کا مدیر مقرر کیا گیا اور اخیر میں اس کے مدیر اعلیٰ بنے۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے سکریٹری کے طور پر بھی خدمت انجام دی، ان کے قلم سے چند مشہور تصنیفات شائع ہوئیں، جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی "فی مسیرۃ الحیاۃ" جو "کاروان زندگی" کا عربی ترجمہ شامل ہے۔ میں نے ان کے والد صاحب سے درخواست کی کہ سوانح یوسفی کا عربی میں ترجمہ ہونا ضروری ہے، یہ حضرت مولانا محمد ثانی حسنی رحمہ اللہ کی اردو میں کتاب ہے، چنانچہ انھوں نے اس کا ترجمہ بھی کیا، اور میری سرپرستی میں یہ کتاب دار البشائر بیروت سے شائع ہوئی اور بہت سے باحثین وعلماء نے لکھا کہ تبلیغی جماعت کو سمجھنے کے لئے، اس کی اعتدال پسندی، صحابہ وتابعین کا منہج اس میں یہ کتاب بڑی دلیل ہے، یہاں یونیورسٹیوں اور مراکز اسلامیہ میں یہ کتاب دعوت وتبلیغ کے سمجھنے میں اچھا موقع فراہم کر رہی ہے۔ دوسری کتاب میری خواہش پر " الإمام المحدث الشیخ محمد زکریا الکاندھلوی ومآثرہ العلمیۃ" ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی اردو میں تالیف ہے، مجھ سے بہت سے علماء نے جب اوجز المسالک اور دیگر کتابیں شائع ہوئیں تو اصرار کیا کہ مستقل کتاب حضرت شیخ الحدیث پر تالیف کیجیے، غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ حضرت مولاناؒ کی کتاب بہت جامع ہے اور مولانا جعفر صاحب سے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کے لیے کہا اور مولانا ڈاکٹر ولی الدین ندوی کے مقالہ جس میں حضرت شیخ الحدیث کی کتابوں کا تعارف تھا، اسے شامل کر کے بیروت سے شائع کرایا۔ میں نے ان سے کہا کہ حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کی خصائل نبویؐ جو اردو میں ہے، اسے عربی میں منتقل کرا دیں، چنانچہ انہوں نے اس کام کو مکمل کر لیا، طباعت کا انتظار ہے، ان شاء اللہ آئندہ شائع ہوگی۔

وہ صحافتی میدان میں کام کرنے کے لئے پیش پیش تھے، افسوس کہ ۱۵/جنوری ۲۰۲۵ء کو شہر رائے بریلی میں ایک سڑک حادثہ میں انتقال فرما گئے، انہوں نے ۵۹/سال کی عمر پائی، ان کی تدفین ۱۶/جنوری کو تکیہ رائے بریلی میں ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی، مولانا بلال عبدالحی حسنی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، اس وقت بولنا مشکل ہو رہا ہے؛ لیکن ان کے حادثے پر افسوس ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان " کل من علیہا فان" کسی چیز کو بقا نہیں ہے؛ لیکن اس کے اعمال حسنہ اس کے ساتھ جائیں گے اور اس کو زندہ رکھیں گے، مولانا جعفر ندوی کی ندوہ کی خدمات، مدرسہ عالیہ عرفانیہ کی خدمات اور ان کی تصنیفات ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی اور ان کی آل اولاد کے لئے شمع راہ بنیں گی۔ بعض بزرگوں کا قول ہے کہ جب کوئی مخلص اس دنیا سے جاتا ہے تو اس کے جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کام کی حفاظت کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق دیتا ہے۔

سب سے پہلے ناظم ندوۃ العلماء مولانا بلال حسنی کو سلام مسنون کے بعد تعزیت پیش کرتا ہوں، ندوہ کے اساتذہ واراکین کو بھی سلام مسنون کے بعد تعزیت پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

☆ معتمد تعلیم ندوۃ العلماء وپروفیسر حدیث شریف جامعہ محمد بن زاید للعلوم الانسانیہ، ابوظہبی

میرے مخلص عزیز بھائی

مولانا سید عمار عبد العلی حسنی ندوی ☆

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم سے ہمارا تقریباً پچاس سالہ تعلق رہا ہے۔ انھوں نے حفظ دہلی میں شروع کیا، لیکن آٹھ دس پاروں کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حفظ کی تکمیل کی اور اس وقت ہم بھی حفظ کر رہے تھے، تراویح بھی ایک ہی مسجد میں ہم دونوں نے پڑھائی، کھیل کے زمانے میں ساتھ میں کھیلے، ہمیشہ ایک دستر خوان پر کھانا کھایا اور ایک ساتھ اٹھے بیٹھے، لیکن ہمیں یاد نہیں ہے کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی نا اتفاقی کا معاملہ ہوا ہو، کیونکہ ان کے اندر نرمی تھی اور معاملہ حل کرنے کا سلیقہ تھا، بہت خوش اسلوبی سے معاملہ نپٹا لیا کرتے تھے۔

دوسری طرف مہمان کے اکرم کو بہت اہمیت دیتے تھے، جب کوئی مہمان گھر میں آجاتا تو گھر میں ایک ہلچل سی ہو جاتی اور بہتر سے بہتر ضیافت کی فکر کرنے لگتے تھے۔ غرض اللہ تعالی نے ان کو بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا، ایک ان کی جو خوبی تھی وہ تواضع، انکساری اور ان کا خلوص تھا۔ فکر میں اعتدال اور توسع تھا، ہر ایک کو عزت دینا، ہر ایک کی عزت کرنا اور چھوٹوں پر شفقت کرنا، یہ ان کا امتیازی وصف تھا۔ سب کو عزت دی پھر اللہ تعالی نے ان کو بھی خوب عزت دی۔ حدیث میں آتا ہے: "ما تواضع أحد لله إلا رفعه الله" یعنی جو کوئی اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے، اللہ اسے بلند کر دیتا ہے۔ جو آپ سے مل لیتا تھا، وہ آپ کے اخلاق و سادگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا تھا۔ آپ بہت زیادہ راحت والے کاموں سے اجتناب کرتے تھے، فضول خرچی آپ کو بلکل ناپسند تھی۔ اسی کے ساتھ ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا آپ کی عادت تھی، اسی لیے آپ اس طرح کے لوگوں سے بہت زیادہ تعلق رکھتے تھے۔ آپ اپنے والدین اور چچا کے بڑے سعادت مند اور معتمد تھے۔ آپ نے ان لوگوں کی بڑی طویل عرصے تک خدمت کی خاص طور پر والدہ جو چند ماہ تک صاحب فراش رہیں تو آپ نے ان کی خوب خدمت کی اور دعائیں لیں۔ والدہ رائے بریلی میں تھیں اور خود لکھنؤ میں ایک مدرسہ کے استاد تھے تو اس طویل عرصہ میں لکھنؤ سے رائے بریلی آمد و رفت شروع کر دی تھی اور ہمیں خوب یاد ہے کہ سخت جاڑے میں وہ صبح فجر کی نماز کے بعد رائے بریلی سے نکل کر مدرسہ وقت سے پہنچ جاتے اور وہیں سے پڑھا کر سیدھا رائے بریلی آجاتے، اسی طرح عزیز و اقارب کے ساتھ آپ کا حسن سلوک بہت ممتاز تھا، خاندان کا ہر شخص آپ کی عزت کرتا تھا، آپ دوسروں کے گھر بھی تشریف لے جاتے، خیر خیریت معلوم کرتے اور اپنے گھر بھی آنے کی دعوت دیتے، آپ کے اخلاق کا ہر شخص قائل و گرویدہ تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن المؤمن ليدرك بحسن خلقه درجة الصائم القائم" "یعنی یقیناً مومن اپنے حسن اخلاق کے ذریعے روزے دار اور تہجد گزار کے درجے کو پا لیتا ہے۔

آپ کا تدریسی دور بھی بہت زریں ہے کیونکہ آپ اپنے شاگردوں میں اپنے علم کی پختگی اور مشفقانہ تدریس کی وجہ سے بہت مقبول اور محبوب تھے اس لیے کہ تدریس کا انداز ایسا تھا کہ طلبا کو اسباق آسانی سے سمجھ میں آجاتے، تدریس کے زمانے میں طلبا آپ سے گھر پر پڑھنے آتے رہے اور آپ بہت آسانی سے عصر کے بعد کا وقت اس کے لیے دے دیا کرتے تھے، ہزار اصرار کے باوجود کسی بھی طالب علم سے ٹیوشن فیس نہیں لی۔

آپ ایک مضبوط قلم کار تھے۔ عربی و اردو دونوں یکساں لکھتے تھے۔ آپ کی تحریریں موثر ہوا کرتی تھیں۔ مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی نے کئی اہم کتابوں کا اردو سے عربی میں ترجمہ کیا، ان میں ایک نمایاں کتاب "في مسيرة الحياة" ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تصنیف "کاروان زندگی" کا عربی ترجمہ ہے، دوسری کتاب "الشيخ محمد يوسف الكاندهلوي حياته ومنهجه في الدعوة" ہے جو مولانا محمد ثانی حسنی کی اردو تصنیف کا عربی ترجمہ ہے۔ تیسرا ترجمہ "الإمام المحدث محمد زكريا الكاندهلوي وآثاره العلمية" ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ ہے اور چوتھا ترجمہ "بصائر" ہے مولانا ابوالحسن علی حسنی کی عربی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ سب ان کی علمی کاوشیں ہیں جو قدر کی نگاہ سے علمی میدان میں دیکھی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مخلصانہ محنت کو قبول فرمائے اور انکے کاموں کو صدقہ جاریہ بنا دے۔

ایک بات تھی کہ وہ اپنے علم میں اضافہ کے لیے مستقل لگے رہتے تھے اور عرب ادباء و علماء کی کتابیں زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ آپ انہیں ادباء و علماء کی ڈبیٹ سنتے تھے اور فائدہ اٹھاتے تھے، عربی چینلوں سے بھی خبریں سنتے، اسی لیے عالم عرب کے حالات سے پورے طور پر

☆ ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ

باخبر رہتے تھے، پھر اس کے بعد تبصرہ کرتے کہ اسرائیل و امریکہ نے عالم عرب کو کیسا جکڑ رکھا ہے۔

جب سے آپ ندوۃ العلماء کے ناظر عام بنے تو اس کی ترقی کے لیے آخر تک کوشاں رہے اور کچھ اقدامات ایسے بھی کیے جو بہت مفید ثابت ہوئے۔ تعلیم وتربیت پر آپ کی خاص توجہ تھی، تعلیمی معیار کو کیسے اور بلند سے بلند تر کیا جائے اور طلباء کو تہذیب کے دائرہ میں رکھ کر ترقی کی منازل تک کیسے پہنچایا جائے، اللہ تعالی نے آپ کی فکر میں بلندی وسلامتی رکھی تھی اور یہ چیز آپ کو حاصل ہوئی تھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور خود اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ سے جن کو انھوں نے خوب قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ اپنے بڑوں کی خوبیوں کو انھوں نے اپنے اندر اتارنے کی کوشش کی تھی۔

محلّہ کی مسجد میں آپ کا درس قرآن مہینہ میں ایک بار ہوتا تھا جس میں تقریباً قرآن پاک مع تفسیر مکمل ہونے والا تھا، آپ کے درس قرآن کو لوگ کافی دور دور سے آکر سنتے تھے، پسند کرتے تھے کیونکہ وہ درس آسان زبان میں دیتے تھے تاکہ لوگ سمجھ سکیں۔ آپ نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو کام کی بات کے عنوان سے سوشل میڈیا پر ڈالا کرتے تھے جو واقعی کام کی بات ہوا کرتی تھی۔ تقریریں بھی باقاعدہ شروع کر دی تھیں اور تقریروں میں عام طور پر حالات حاضرہ، مسلم معاشرہ، علم سے دوری کے موضوع پر بہت مفید اور کارآمد نصیحتیں ہوتی تھیں۔ مرحوم کا درس وتدریس سے گہرا تعلق تھا اور عالمی حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔ معاشرہ کے نشیب وفراز اور اس کے اسباب سے خوب واقفیت رکھتے تھے اور قوموں کے عروج وزوال اور ان کے اسباب پر بھی گہری نظر تھی۔

مولانا جعفر صاحب تواضع، سادگی، زہد وقناعت کے ساتھ ساتھ علم وتحقیق تحریر وبیان کی صلاحیت پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے اندر رکھتے تھے۔ ان اوصاف وکمالات کے ساتھ ان کا ایک بڑا وصف خیر کے کاموں میں سبقت کرنا تھا اور یہ ان کا وصف وہی شخص جانتا تھا جو صاحب معاملہ ہوتا تھا، تنخواہ کا ایک بڑا حصہ خفیہ طور پر غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے، لیکن پورے اخفاء کے ساتھ، کوئی دیکھ لے تو پریشان ہو جایا کرتے تھے، اللہ تعالی نے ان کو اخلاق حسنہ سے نوازا تھا اور یہ چیز ان کو اپنے چچا سے حاصل ہوئی تھی۔ غریبوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے جڑا ہوا تھا۔ وہ جس محلے میں رہتے تھے پورا محلّہ ان سے جڑا ہوا تھا۔ ان کی ہر بات مانتا تھا، دینی وعلمی مشورہ انھیں سے کیا کرتا تھا۔ آپ نے ایک مشن بنا رکھا تھا کہ علمی بیداری پیدا کی جائے اور علم سے لوگوں کے رشتوں کو مضبوط کیا جائے۔ کہتے تھے علم نور وہدایت ہے اور علم سے دوری ضلالت وگمراہی ہے۔ نبی پاک نے ارشاد فرمایا کہ اگر انسان اپنے بیٹے کو سب سے قیمتی چیز دے سکتا ہے تو وہ علم وادب ہے، جس انسان میں بھی علم وادب ہوگا تو اس کو ترقی کرنے سے کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ دنیا میں جتنے بھی ترقی کے ذرائع ہیں وہ علم وادب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے اور علم کے ساتھ ادب بھی ضروری ہے۔

جعفر بھائی کی ایک قابل تقلید بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں کی بہترین تربیت کی اور انکو کبھی یوں ہی بے پرواہ نہیں چھوڑا، بلکہ ہمیشہ ان پر نظر رکھتے تھے کہ وہ پڑھنے گئے ہیں یا نہیں، علم دوست طلباء سے ان کی دوستی ہے یا اور لڑکوں سے اور پھر ان کو سمجھاتے اور علم کی طرف ان کو شوق دلاتے، ان کے بڑے بیٹے مولانا خلیل حسنی ندوی جو مدرسہ ضیاء العلوم میں حدیث کے استاد ہیں ان کے کئی ملکوں کے سفر ہو چکے ہیں، عربی ادب کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں، انگریزی اچھی جانتے ہیں اور اس کے ساتھ اور بھی بہت سے علوم سے واقف ہیں اور دارعرفات میں بہت سے علمی کاموں سے جڑے ہوئے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے مولانا امین حسنی ندوی وہ بھی ماشاء اللہ مدرسہ ضیاء العلوم اور دارعرفات سے پورا تعلق رکھتے ہیں، مضامین بھی ان کے آتے رہتے ہیں اور ماشاء اللہ حافظ قرآن ہیں، مستقل تراویح کا اہتمام کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ مولانا محمد ثانی حسنی سوسائٹی کے کام کاج کو بھی دیکھتے ہیں۔ تیسرے صاحبزادے مولانا عبدالحی حسنی ہیں جو مدرسہ عثمان بن عفان میں تدریس کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ماشاء اللہ تینوں نیک اور باصلاحیت ہیں۔ ایک صاحبزادی ہیں جو شادی شدہ ہیں۔

بہر حال اللہ تعالی مرحوم کے ساتھ رحمت ومغفرت کا معاملہ فرمائے، اس دور کا جو ایک بہت بڑا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ اچھے کام کرنے والے لوگ اب دھیرے دھیرے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا نعم البدل ملنا مشکل ہوا جا رہا ہے۔ اللہ تعالی ایسے افراد پیدا کرے جو ایسے لوگوں کی جگہ لے سکیں۔ ندوہ کو، ملت اسلامیہ کو آپ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن اللہ تعالی کا معاملہ الگ ہے کہ اس نے ہر چیز کا وقت مقرر کر دیا ہے۔ مرحوم کو شائد کچھ اندازہ تھا اور وہ کام بہت تیزی سے کر رہے تھے۔ ان کی زندگی میں کچھ الگ طرح کی تبدیلیاں دکھ رہی تھیں جیسے ان کو دنیا سے جانے کا کچھ احساس ہو۔

اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو شرف قبولیت بخشے، اس میں خیر وبرکت پیدا کر دے، مرحوم کی بال بال کی مغفرت فرمائے، تقصیرات سے عفو ودرگزر کا معاملہ کرے اور اعلی علیین میں ان کو مقام عطا فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

ضمیر پاک، نگاہ بلند، مستی شوق

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی ☆

اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے آگے انسان بے بس ہے، ابھی کچھ مہینوں پہلے کی بات ہے کہ مولانا جعفر حسنی ہمارے ساتھ تھے، بے ساختہ ہم سے جدا ہوگئے اور اپنے معبودِ حقیقی اللہ تعالیٰ کے دربار میں جا پہنچے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون!

ذہن کسی طرح یہ حقیقت قبول کرنے سے قاصر ہے، ایک لاپرواہ موٹر کے ڈرائیور نے ایک بہت ہی عزیز' مبارک' محترم' معصوم شخصیت کو آناً فاناً فنا کردیا۔ موت تو برحق ہے، ہر زندگی کو موت ہے لیکن کیا کریں کہ اس طرح کی بے ساختہ اچانک موت ذہن قبول کرنے سے قاصر، اموشن کا ایک ہجوم، ایک افسردہ طغیانی برداشت کرنے سے مجبور اور پریشان ہے۔ ایک پل میں ہم آپ سب ہی محترم مولانا جعفر صاحب کے لطف وکرم سے محروم ہوگئے۔ ایک عجیب حقیقت کہ اچھے انسان کی زندگی اس کے مقصد جلیل کی زندگی سے کم ہوتی ہے، وہ بہت جلد جدا ہوگئے۔

وہ سادہ سی شخصیت تھے، محبت سے بھرپور مسکینی کہہ لیجیے لیکن اس مسکینی میں زبردست دل نوازی بھی، دیانت ہی دیانت، وضع داری، غیریت، حمیت، شرافت، شفقت، تکریم وتواضع بھی۔ مجھ کو ہمیشہ اپنے بھائی کی حیثیت سے نوازتے۔ خلوص، محبت، سخاوت کا ایک مجموعہ تھے۔ میں محروم ہوگیا۔

ان کی اعلیٰ شخصیت میں خلوص، اخلاق، تدبیر وتسخیر، اسلام، اسلامی تہذیب، علم، دانائی، دین، دینی تہذیب کا عملی اظہار ان کی اعلیٰ ومعصوم سی شخصیت میں پنہاں تھا۔ ایک خاص پروقار انداز گفتگو کے ساتھ ان سے ملاقات رہتی، کوئی تکلف نہیں۔ شستہ مسکراہٹ کے ساتھ مصافحہ اور خیریت۔ وہ دعاؤں اور نیک خواہشات کا ایک ذخیرہ تھے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء اعلیٰ دینی درس گاہ ہے۔ مذہب، علم وادب، اخلاق، تہذیب اور ایک خاص ثقافت کے ساتھ ایک پر فضا دینی ماحول سے بھرپور ایک بہت ہی خوبصورت چمن ہے۔ دنیا کے مشرق ومغرب دونوں اس علمی ادارے کی اہمیت اور اس کی خدمت سے خوب ہی واقف ہیں اور بڑی عزت کے ساتھ نام لیتے ہیں۔ اس کی علمی پرفضا ماحول کو اور بھی جلا دینے کے لیے ہمارے مرحوم حضرت مولانا جعفر حسنی عظیم مقاصد کے ساتھ ہمیشہ کوشاں رہتے، ہندوستان کے موجودہ دور کے ''آئین نو'' سے افسردہ اور فکر مند رہتے۔

ایمان، سچائی، شرافت، تہذیب، سادگی، اعلیٰ کردار، گفتار میں پاکیزگی، ساری علمی، تہذیبی صلاحیتیں حسنی ورثہ کے ساتھ ان کی شخصیت میں جذب تھیں۔ کیوں نہ ہوں! حضرت مولانا علی میاں، محترم حضرت مولانا رابع صاحب، حضرت مولانا واضح صاحب مرحوم (والد محترم) کے سایہ میں پرورش پائی۔ موجودہ دور میں حضرت مولانا بلال صاحب کی انتھک کوششوں میں شریک، ندوۃ العلماء کے علمی ادارے کو افضل سے اعلیٰ منزلوں پر لے جانے کے لیے ان کے ساتھ ساتھ شریک، کوئی ذاتی تمنا نہیں، صرف ادارہ کی خدمت۔

ضمیر پاک، نگاہ بلند، مستی شوق
نہ مال و دولت قارون نہ فکر افلاطون

گذرتا ہوا وقت، صبر وصلوٰۃ، محبت سے بھرپور شخصیت کے جدائی کے غم کو کچھ کم ضرور کرتا ہے، لیکن محترم مولانا جعفر حسنی صاحب مرحوم کی اعلیٰ شخصیت ہمارے ذہنوں سے جدا نہیں ہوسکتی۔ ہمیشہ زندہ، ان کی احسن تقویم کی صلاحیتوں میں احسن الخالقین کا خاص معجزہ شامل تھا۔ اعلیٰ کردار، خوبصورت عمل، خدا شناسی کا سفر زندگی کا موضوعِ عمل تھا۔ الٰہی تخلیق میں ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ''۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی خصوصیات سے نوازا تھا، وہ مختلف محاذوں پر پوری دلجمعی کے ساتھ کام کررہے تھے، ابھی ان سے بڑی توقعات اور امیدیں وابستہ تھیں کہ پیام اَجل آیا اور وہ اپنی نیکیوں کا صلہ پانے مالک حقیقی سے جاملے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے اس خوبصورت بند میں محترم جعفر صاحب کی زندگی پنہاں تھی:

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم، پاک دل پاک باز

دل کی گہرائیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور محترم کی بخشش کی دعائیں ہیں۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل ہو۔ آمین!

☆☆☆☆☆

☆ معتمد مال وصدر شعبۂ انگریزی، ندوۃ العلماء لکھنؤ

ستودہ صفات شخصیت

مولانا عبدالقادر عارفی ☆

خاندان حسنی سے میرا تعلق اور محبت اس زمانہ سے ہے جب کہ ہم جامعہ دار العلوم کراچی میں پڑھنے کے لیے گئے تھے، وہاں سب سے پہلے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام سے آشنا ہوئے۔ فراغت کے بعد ہندوستان کا جب پہلا سفر کیا تو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ندوۃ العلماء کے ناظم اور علمائے ندوہ کے بڑے مانے جاتے تھے، ان کے ساتھ حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ ہمیشہ ساتھ ہوتے، سفر وحضر، کمرہ اور دسترخوان میں ساتھ نظر آتے تھے۔ مہمان بہت آتے تھے، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی صاحبؒ ایک کونے میں بیٹھ کر تلاوت سنتے یا کسی موضوع کے لکھنے میں مصروف ہوتے یا اخبار دیکھتے۔

بندے کو چونکہ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحبؒ سے بہت محبت اور عشق تھا تو میں زیادہ تر اپنا وقت ان کے ساتھ گذارنے میں صرف کرتا تھا۔ احقر کے مختلف سالوں میں مختلف اسفار ہوئے، ان سب کے اندر میری نظر حضرت کی شخصیت پر رہی اور ان کی محبت کی وجہ سے ان کی اولاد اور ان کے متعلقین سے بھی بہت محبت تھی۔ میں ہمیشہ کوشش کرتا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے جتنے افراد ہیں ان کے نام تک مجھ کو یاد ہوں، بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ملتا اور تحقیق کرتا۔ اسی وجہ سے مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ سے بہت ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی مجالس سے استفادہ کا موقع ملا۔ مولانا محمد حمزہ حسنی ندویؒ سے کئی بار ملاقات اور محبت کا موقع ملا۔

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ سے تعلق کے مختلف اسباب تھے، ان کے قلم کی روانگی اور ان کے ادبی شہ پاروں سے بہت متاثر ہوا، آخری چند سالوں میں تو ان سے بہت محبت ہوگئی، یہاں تک کہ کبھی کبھی موبائل سے رابطہ کرکے ان کے احوال معلوم کرتے تھے اور خاص طور پر علمی کاموں کے بارے میں سوال کرتے اور وہ بہت اخلاص اور تواضع سے جواب دیتے۔ مجھ کو ایسا لگتا کہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے کاموں کی کوئی تعریف کرے، یا تحقیق میں لگ جائے، ''کاروان زندگی'' کی باقی جلدوں کی تعریب کے بارے میں بات کی اور دوسرے موضوعات کے بارے میں بھی، حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ انشاء اللہ کوشش کریں گے کہ کام ہوجائے۔

حضرت شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اپنے علوم القرآن کے دوسرے حصہ کی تعریب کے بارے میں فکر مند تھے، احقر نے بتایا کہ حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی اس کام کے لیے بہت موزوں اور مناسب ہیں، حضرت نے بہت پسند فرمایا اور ایک وائس مسیج ریکارڈ فرمایا، پھر میں نے اس کو حضرت مولانا جعفر مسعود صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیجا اور مولانا نے بڑی خوشی سے قبول فرمایا مگر اشغال اور اعذار کی وجہ سے کام نہیں ہوسکا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اس نیت کا ثواب ملا ہوگا۔

مولانا بہت تواضع اور اخلاص سے پیش آتے تھے کہ ہم جیسے نادان لوگوں کو بہت شرم آتی، بہت سارے کاموں کے بارے میں ان سے مشورہ کرنے کا ارادہ تھا اور اپنی علمی زندگی میں ان سے استفادے کا ارادہ تھا، لیکن اچانک ان کے غروب ہونے سے دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی بہت متاثر ہوئے۔

ابھی چند سال پہلے تکیہ میں ناشتہ میں حضرات شیخین کے ساتھ احقر بھی تھا اور ناشتہ گھر میں تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد حضرت مولانا سید جعفر مسعود صاحب بہت محبت سے پیش آئے اور گھر کے اندر لے گئے اور ایک فردِ خانوادہ کی طرح گھر کا پورا نقشہ اور تفصیل سے دکھایا۔

بس مقصد یہ ہے کہ بہت اخلاص اور محبت وتواضع سے پیش آتے تھے اور ایسے لوگ کم ہیں جن کو سعادت اور شرفِ نسبی اور علمی مل جائے اور وہ ان صفات کے حامل رہیں۔

مولانا کے فرزندوں سے بہت محبت اور قریبی تعلق رہا اور اب تک ہے، ان کی محبت اور ذرّہ نوازی سے بندہ ہمیشہ متاثر رہا اور خاندان حسنی کے چشم وچراغ ہونے کے ساتھ ان سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی حفاظت فرماویں اور ترقیاں عطا فرماویں۔

جب حضرت مولانا کا حادثہ پیش آیا، میں کراچی کے سفر میں تھا، حضرت شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے آج کل بہت مصروفی کی وجہ سے ملنا مشکل ہے۔ اس کو میں اس خاندان کی اور خاص طور پر مولانا سید جعفر مسعود ندویؒ کی کرامت سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے احقر کو کراچی پہنچایا تھا اور میں نے حضرت شیخ الاسلام کو ان کے گھر میں جاکر اطلاع دی اور حضرت نے تعزیت کا مسیج ریکارڈ فرمایا اور دوسرے دن بھی......

............بقیہ صفحہ ۲۳ ر پر

☆ نائب مفتی دار العلوم زاہدان، ایران

آج تم یاد بے حساب آئے

مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی☆

چند مہینوں پہلے کی بات ہے، ذکر یادوں کا ہونے لگا، جو زیادہ عمر والا تھا اس کا کہنا تھا کہ متاعِ دنیا کیا متاعِ زندگی اس کے سوا کچھ ہیں کہ دل اور دماغ کی دنیا میں صرف گذرے ہوئے سارے لمحات کے سائے لہراتے رہیں، بچپن، ماں باپ، بھائی بہن، گھر کے دوسرے بڑے گھر سے باہر چبوتروں پر محلّہ کے بچے اور پھر وقت کے ساتھ ذہن سے ان کے دھندلے ہوتے جاتے عکس، پھر طالب علمی کا دور، بورڈنگ کے دن رات اور پھر وقت کی گردش سے یہ سب ایک غبارِ راہ میں بدل کر صرف یہ کہنے پر مجبور کرنے والے کہ کاش رات دن کو پھر وہی فرصت ملے؛ لیکن غم پنہاں کی کشاکش فرصت کب دیتی ہے، پھر رخصت اور جدا ہونے کا موسم، کل جن کے بغیر جینے کا تصور بھی محال تھا، وہ سب ایک ایک کر کے آنکھیں موندے خاموش اور ساکت خاک کے پردوں میں پنہاں ہو گئے تو کیا زندگی کا حاصل بس یہی درد، سوز و ساز بے تابی ہے، آخر رشتہ و پیوند جان کے آزار کیوں بن جاتے ہیں؟ حصارِ غم میں محصوری اس زندگی کی پونجی ہے، کیا ہست و بود کا سامان بس یہی دل کا اضطراب ہے؟ کہنے والا خدا جانے کس عالم میں اس قسم کے الفاظ کا سہارا لے رہا تھا اور جعفر مسعود بڑی خاموشی سے اپنی کرسی کو اور قریب لا کر کہنے والے کو سننے سے زیادہ عجب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، ان نگاہوں نے گویا اس مہمل ناقص اور بے معنی گفتگو کو روکنے کا اشارہ کر دیا، پھر یہی ہوا کہ بولنے والا محجوب ہو کر دوسری اور دوسروں کی باتوں میں بھول گیا کہ جب دل پر چوٹ پڑتی ہے تو دل والا قتیلِ ذوق استفہام کیوں ہو جاتا ہے؟ اس کا سوال کیوں اپنی جگہ رہتا ہے کہ ایسا کیا ہے کہ انسان کے دل کا کانٹا اور چبھتا ہوا کانٹا موت ہی ہے؟

چند مہینوں کے بعد وہی باتیں کرنے والا عمر میں کہیں بڑا جعفر مسعود کے ساکت وجود سے خاموشی کی زبان میں یہی سوال کر رہا تھا؟ جواب کیا ملتا؟

جعفر مسعود عمر میں بہت چھوٹے تھے، کسی کے بچپن اور لڑکپن کی راہیں نگاہوں کی وادیوں سے گذرتی ہوں تو ان نگاہوں میں ہر ادا اور ہر انداز کا عکس نمایاں بھی ہوتا ہے اور دیرپا بھی۔ جعفر مسعود کے لیے احمد حسنی بڑے تھے، تو احمد کے دوست یار بھی بڑے بن جائیں، ایسا وہیں ہوتا ہے جہاں شرافت، تواضع اور حفظِ مراتب کی روایتیں نسلی رگوں اور جڑوں کی طرح توانا اور گہری ہونے کا اعلامیہ بن جاتی ہیں۔

دیکھتے دیکھتے جعفر مسعود معلم ہو گئے، استاد بن گئے، پھر ان کی انگلیوں کو چومتے قلم نے دل کی تمام پاکیزگی اور ذہن کی ساری بلندی، لوح و قرطاس کو سونپنے کا عمل شروع کر دیا، عربی اور اردو میں مضامین کی جدت اور ان کے اسلوب اور پیرایہ کی دلکشی نے عمر کے چھوٹے پن کے احساس ہی کو زائل کر دیا، چھوٹے ہو کر بھی وہ بڑے ہو گئے بلکہ ہوتے گئے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی نے خدا جانے کس عالم میں ندوہ کے لیے ناظر عام کی اصطلاح کو ایجاد کیا کہ اچانک ایک منجمد سطح سے ایسی موج اٹھی جس نے ناظر عام کو منظور عام و خاص کے معنی بخش دیے۔

جعفر مسعود ناظر عام ہوئے، یا قدرت نے ہر نظر کا مرکز بنا کر مختصر سی مدت میں گویا زندہ کرامت کا مشاہدہ کرا دیا، ان سے ملنے والا ہر وقت، ہر ملاقات میں اس کرامت کی نئی تعبیر پانے میں کامیاب ہو جاتا، یہ کرامت مکتب کی کرامت تھی یا آدابِ فرزندی کی تعلیم تھی، زبان جو بھی کہے، دل تو اس کو کرامت ہی مانے گا۔

ذاتی تاثرات کو لفظ ''میں'' کے ساتھ بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے، لپک کر لپٹ کر ملنا، دو قدم پیچھے ہی رہنا، نظروں کو نیچا کر کے ہم کلام ہونا، سلام و کلام میں سبقت کرنا، زیرِ لب تبسم کی پاسداری کرنا، کہنے سے زیادہ سننے کے عمل کو ملحوظ رکھنا اور کہنے سننے میں گفتگو کی طہارت اور پاکیزگی پر ایسی گرفت کہ برائی اور بری بات کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ رہے، شکر کے جذبہ کا خیال رکھنا تو آسان؛ لیکن جب مقام صبر آزما ہی نہیں، جاں سوزی کا ہو، اس وقت بھی آنکھوں کی نمی کو آنکھوں ہی میں جذب کر لینا، دوسروں کی آہ کو چشم زدن میں واہ میں بدل دینے کا ہنر جیسا تھوڑی سی زندگی میں جعفر مسعود نے برتا، یہ کرامت، شرافت اور سعادت حقیقت ہے ہر مدعی کے لیے اس کے نصیب میں کہاں؟

ندوہ کی تاریخ، ندوہ کی عمارت، ندوہ کا مقصد، ندوہ کا منہج سب میں بڑے پن کا عنصر کارفرما، ایسے

☆ نائب مدیر ''تعمیر حیات''، ندوۃ العلماء لکھنؤ

میں جعفر مسعود نے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو مختصر سے وقت میں ظاہر کر کے اور شیوہ اہل نظر کی آبرو کو قائم رکھنے کی صلاحیت سے ثابت کر دیا کہ وہ بڑائی اور بلندی کا استحقاق، خاندانی سے زیادہ ان کے فطری اخلاق کے محاسن کی بدولت نصیب ہوا۔

وہ جس شان اور جس ادا سے زندگی کے فریضوں سے سبک دوش ہوئے، کسی کے تصور میں نہیں تھا کہ مرتبوں کی ایسی بلندی ان کے مقدر میں تھی، لیکن یہ ایسی حیرت کی بات نہیں، خاندان، نسب، رشتوں میں پروئے بڑے بڑے نام یہ سب کسی انسان کے تعارف میں گنائے جاتے ہیں، لیکن ان کا شمار نہ تو دلیل ہے نہ گواہی، ان کے بغیر بھی مدارج و معارج کی منزلوں کا تعین ہوسکتا ہے، لیکن جب انسانی خوبیوں کا تسلسل اور تواتر کا لامتناہی معاملہ کسی خاندان یا خانوادہ میں نظر آئے تو یہ کہنے میں جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ خانوادۂ حسنی کی معلوم شخصیتوں میں ایک غیر معمولی تسلسل سے انسانی خوبیوں اور فضیلتوں کا وجود یا یوں کہیں کہ رذائل وسیئات سے نفور اس کو ایک الگ ہی شناخت عطا کر دیتا ہے۔

اس شناخت کی مثال جعفر مسعود نے جس طرح پیش کی اس میں نہ تصنع، نہ ظاہر داری، نہ خودستائی، نہ خودنمائی، پھر بھی وہ ہر دل کے عزیز اور ہر عزیز کے قریب بنتے چلے گئے، چھوٹے ہو کر بڑوں کی نظر میں بڑائی پانا قطعی سہل نہیں؛ لیکن جعفر مسعود نے بتایا کہ اپنوں میں اپنے پن کی نعمت پانے کے لیے اصل جوہر، اخلاق و کردار ہے۔ تحریر، تقریر، قابلیت، ذہانت سب اپنی جگہ؛ لیکن زندگی کو حیات جاوداں بنانے کا نسخہ صرف خلق عظیم کی کتاب سے حاصل ہوتا ہے۔ ہاں یہ یاد رہے کہ خلق عظیم کی یہ نعمت اتنی آسان اور ارزاں نہیں، خود کو پگھلانے والی ہمت، دوسروں کے غم کی تپش سے خود کو اپنی آگ میں جلتے دیکھنے کا حوصلہ جب ملتا ہے تو پھر شمع کی طرح نور کی قبا ملتی ہے۔

جعفر مسعود میں یہ ہمت تھی، اب اس کی شرح یہاں کیا بیان کی جائے، غم جہاں کا حساب کرنے والے تھک ہار کر بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ:

آج تم یاد بے حساب آئے

ورنہ گوئن روڈ خاتون منزل، مہمان خانہ، دفتر نظامت، رابطہ ادب اسلامی، تعمیر حیات، کاروان ادب، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی مجلسیں اور تکیہ کے عشائیے، چمن میں ہر طرف داستانیں بکھری ہیں، ان داستانوں میں بے شمار چہرے ہیں؛ لیکن جس سے اس داستان کو فروغ تھا، اب اس کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی رہیں گی۔

جعفر مسعود کے والدؒ نے ایک بار لکھا تھا کہ کسی کی جدائی سینے کا داغ بن جاتی ہے، جب جب اس کی یاد آتی ہے، داغ کے درد کو تازہ کر جاتی ہے، اس لیے یادوں کا اختصار ہی مناسب ہے، کیا خبر تھی کہ یہی جملے ان کے بیٹے کے لیے حرف مستعار بن جائیں گے اور یہی کیا علامہ اقبالؒ نے سر راس مسعود کے نوحہ میں جب یہ شعر کہا تھا تو کسے معلوم تھا کہ اس کو ایک بار پھر دہرایا جائے گا کہ:

زوال علم وہنر مرگ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاع گراں بہا مسعود

سنہ ۱۹۶۰ء میں وہ تکیہ کے اس خانوادہ میں پیدا ہوئے جہاں کے ہر فرد کو علم و فضل کے آسمان کا مہ پارہ اور سیارہ کہنا مبالغہ نہیں سمجھا جاتا، ان کو والد مولانا واضح رشید ندوی، عم بزرگوار مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا محمد ثانی حسنی، جد امجد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسی شخصیتوں کے سایہ میں پروان چڑھنے کی ایسی توفیق ملی جو کسی بھی خوش قسمت کے لیے شکر کے ساتھ قدر کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظر عام کے عہدہ اور منصب پر جب قریب سال ڈیڑھ سال پہلے وہ فائز ہوئے، تب اکثر لوگوں کو ان کی علمی، ادبی اور تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا اور اعتراف بھی ہوا؛ لیکن جنہوں نے ان کو طالب علم اور پھر لکھنؤ کے مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں معلم کی صورت میں شروع سے دیکھا، ان کی نظر میں وہ ناظر عام سے کہیں زیادہ منظور نظر کا مرتبہ رکھتے تھے اور مرتبہ بلند ملنے کے لیے یہ کہنا ہی کافی نہیں کہ ''ملا جس کو مل گیا''، علمی و دینی روایات کا تسلسل کسی بھی علمی و خاندانی سلسلے کو زریں ہونے کی صفت عطا کر سکتا ہے؛ لیکن زریں کو نورانی کی صفت میں بدلنے کے لیے توفیق ربانی کی تاثیر ناگزیر ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک بار لکھا اور اس کو دوسروں نے کئی بار دہرایا کہ مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اور مجدد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فضل و کمال اور مجاہدہ و حال کے دو آتشہ سے ایک اور سہ آتشہ تیار ہوا اور وہ سئی ندی کے کنارے چند گھروں پر مشتمل یہی خانوادہ سید احمد شہید تھا، جس نے نسبتوں کے تحفظ کی اسلامی روایات کی معنویت میں قابل رشک اضافہ کیا، نسبتوں کی معنویت کی یہ برکت مولانا جعفر مسعود ندوی کے وجود میں منتقل ہوئی تو اس پر حیرت نہیں، حیرت اس بات پر بھی نہیں کہ پانچ سال پہلے ۱۶؍جنوری کو ان کے والد جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تب فجر کی اذان شروع ہونے کے ساتھ ان کی حیات ابدی کی صبح طلوع ہوئی تھی، ٹھیک پانچ سال بعد ۱۵؍جنوری کی شام کو ان کے

بیٹے نے مغرب کی نماز کے بعد اس شب زندگی سے کنارہ کرلیا جس کے بعد کی اصل زندگی میں ظلمت شب کا کبھی گزر نہیں ہوسکتا۔ اپنے والد کی تاریخ وفات کے دن وہ اپنے والد کے پاس آسودۂ خاک ہوگئے۔ ولد کو سـر أبيه کہا جاتا ہے، ان کے والد مولانا واضح رشید مرحوم نے اپنی زندگی کے لمحات کو خاموشی، تنہائی، گوشہ گیری، کم سخنی، کم آمیزی اور حیا وخفا کے اصل معنوں سے آشنا کرایا تھا اور بتایا تھا کہ نام ونمود سے دوری اور شہرت طلبی سے بیزاری کے باوجود بے شمار دلوں میں گھر کیسے کیا جاتا ہے۔ مولانا جعفر مسعود نے کم عمری ہی میں جس طرح سرابیہ کے معنوں کو حقیقت بخشی، کم اولادوں کو یہ توفیق ملتی ہے۔ اصل وراثت کا حق اور کیا ہو سکتا ہے؟ مولانا جعفر مسعود خاموشی سے ایک مدرسہ میں علوم اسلامی کی تدریس سے نیک نام ہوئے؛ لیکن عام تعارف کی وجہ یا ان کی خداداد صلاحیتوں کی خوشبو ان کی عربی اور اردو تحریریں بنتی رہیں، اردو اخباروں اور رسالوں میں ان کے کالم ان کے فکر کی بلندی کے ساتھ ان کی ادبی دلکشی اور زبان وبیان کی خوبصورتی کا نمونہ بنتے گئے، پڑھنے والوں کو ان کی تحریروں سے مولانا دریا بادیؒ کے ماجدی ادب کے لطف کا مزہ آتا۔ برسوں پہلے رابطہ ادب اسلامی کے ایک سیمینار میں ان کی تحریر کی داد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بے اختیار دی تھی اور ''کاروانِ زندگی'' میں مولانا نے اس سیمینار کی روداد میں خاص طور پر اس تحریر کا ذکر کیا تھا، لیکن مولانا جعفر کے اصل جوہر تو عربی نثر نگاری سے کھلے۔ ندوۃ العلماء کا عربی جریدہ ''الرائد'' دارالعلوم کے طلبہ کے لیے عربی صحافت میں مہارت کا شروع سے بہترین ذریعہ رہا۔ ۱۹۵۹ء سے شائع ہونے والے اس جریدے نے خدا جانے کتنوں کے لیے عربی نثر نگاری میں حصول کمال کی راہیں کھولیں۔ اس کا مقصد ہی یہی تھا، کوئی مادی نفع، نہ تہذیب جدید کی تقلید، نہ زمانے کے تقاضوں کی ہمنوائی، مقصد صرف یہ کہ یہ جریدہ عقل کی غذا اور قلم کی دستگیری کا ہنر دے سکے۔ اس بامقصد رسالہ سے مولانا جعفر مسعود ۲۰۰۳ء میں اپنے ایک کالم ''ركن الأطفال'' کے ذریعہ وابستہ ہوئے۔ چند قسطوں کے بعد ''أخي العزيز'' کے عنوان سے یہ مستقل اور مقبول کالم بن گیا، جس میں اختصار کی خوبی کے ساتھ دینی، فکری اور عصری موضوعات پر مفید ترین خیالات کی کہکشاں سجنے لگی۔ یہ کالم مولانا جعفر مسعود کی شخصیت کا اصل عکاس بھی ثابت ہوا، وہ کم عمری کے باوجود بڑی عمر والوں کی نظر میں بڑے بن گئے۔ ساتھ میں ان کی خاکساری، فروتنی، حد درجہ تواضع، بے نفسی بھی اسی درجہ بڑھتی گئی۔ محبت اور اخلاق کی بلندی نے ان کو ان سے ملنے والوں کی ہر نظر میں محبوب بنا دیا تھا۔ ان کے ایک جد امجد مولانا فخر الدین خیالیؒ کے بارے میں لکھا اور پڑھا گیا کہ خاموشی، صبر، قناعت اور حلم کی صفات ان کی ہر ادا سے ظاہر تھی اور یہ کہ ظاہر وباطن یکساں اور سینہ ایسا آئینہ تھا جو گرد وکدورت سے صاف تھا۔ صفات کا روایات میں بدلنا آسان نہیں؛ لیکن جعفر مسعود مرحوم کی زندگی نے بتایا کہ یہ پاسداری بہ اندازۂ ہمت بہرحال ممکن ہے۔ کئی کتابوں کے مؤلف اور مترجم ہونے کی شہرت کا احساس بھی نہیں ہونے دیا اور آخر میں ناظر عام کی حیثیت سے ناتجربہ کاری اور پے درپے بڑوں کے سایہ سے اچانک محروم ہونے والے انتظام کی مشکلات کے باوجود انہوں نے نہایت کم وقت میں جس حسن انتظام، خوش اسلوبی اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیا، اس کو شاید ندوہ کی تاریخ میں کبھی بھلایا نہ جاسکے گا۔

وہ رابطہ ادب اسلامی کے صدر ہوئے تو کرونا کے بعد اس کی سرد ہوتی مجلسوں کو پہلی فرصت میں گرمیٔ افکار وگفتار عطا کرنے میں منہمک ہوگئے۔ جے پور کی جامعہ الہدایہ میں عرصہ بعد رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار کی روح وہی تھے؛ لیکن ہر روح کی طرح مخفی اور نہاں۔ رابطہ کے سہ ماہی ترجمان ''کاروان ادب'' کی پابندیٔ وقت سے اشاعت کے لیے فکرمند ہی نہیں بے چین تھے۔ اس طرح مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے مالیاتی مسائل کے حل کے ساتھ اس کو ایک مستقل تحقیقی اور تصنیفی ادارے کی شکل میں دیکھنے کے منصوبہ ساز ہوئے۔ ان کی شبانہ روز کی محنت، متعلقہ شعبوں کے ذمہ داروں سے مخلصانہ تعلق اور ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحی حسنی سے ہمہ وقتی تعاون سے ندوہ کے تمام خیر خواہوں کو اطمینان تھا کہ یہ عظیم ادارہ کامیابی اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ مستقبل میں ان سے بڑی توقعات اس لیے وابستہ تھیں کہ ندوہ کے لیے وہ امیدوں کا مرکز نظر آنے لگے تھے۔ جعفر مسعود مرحوم کو یاد کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ علیہ کے وہ الفاظ سامنے آجاتے ہیں، جو انہوں نے عبدالرحمٰن نگرامی ندوی کی وفات پر لکھے تھے کہ: وہ انسان کی صورت میں فرشتہ تھے۔ نوجوان ہوکر اپنے اخلاق اور دینداری سے انہوں نے بوڑھوں کو شرمایا۔ دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں بلند درجات سے نوازے اور ندوہ اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

شرافت ونجابت کا پیکر

مولانا محمد فضل الرحیم مجددی ندوی ☆

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ کی اچانک وفات کے حادثہ نے ملت اسلامیہ بالخصوص ندوی برادری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے خانوادے کے فرد فرید تھے۔ آپ کی ولادت ۱۳؍ستمبر ۱۹۶۰ء کو تکیہ رائے بریلی اتر پردیش میں ہوئی، آپ کے والد ماجد ملک کے مایہ ناز عربی زبان وادب کے مشہور ادیب وصاحب قلم حضرۃ الاستاذ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ تھے جو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے حقیقی بھانجے تھے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ نے حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن رائے بریلی میں حاصل کی، اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا اور علوم شرعیہ کے ساتھ عربی زبان وادب میں بھی مہارت پیدا کی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی سند حاصل کی، اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان و ادب میں ایم اے کیا، بعد ازاں ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب کی دانش گاہ ''جامعۃ الملک سعود'' کے زیر اہتمام ٹیچرز ٹریننگ کا کورس مکمل کیا۔

آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کیا، آپ نے لکھنؤ میں واقع دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی معروف شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں طویل مدت تک تدریسی فرائض انجام دیے، آپ کا اصل موضوع تفسیر وحدیث اور فکر اسلامی تھا، اب تک بے شمار ادبی وفکری اور تاریخی مقالات ومضامین لکھ چکے تھے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے نکلنے والے پندرہ روزہ عربی جریدہ ''الرائد'' کے ۲۰۱۹ء سے مدیر اعلیٰ (رئیس التحریر) تھے، آپ کو عربی زبان وبیان پر بڑی قدرت حاصل تھی، عربی زبان میں معیاری مضمون نگاری کے ساتھ کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

آپ کی تصنیفات میں خاص طور پر ''فی مسیرۃ الحیاۃ'' (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی خودنوشت ''کاروان زندگی'' کا عربی ترجمہ) ''الشیخ محمد یوسف الکاندھلوی؛ حیاتہ ومنھجہ فی الدعوۃ'' (محمد الحسنی الندویؒ کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ) ''الامام المحدث محمد زکریا الکاندھلوی ومآثرہ العلمیۃ'' (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ) ''دعوۃ للتأمل والتفکیر'' (دعوتِ فکر ونظر) ''بصائر'' (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ)

آپ کی طرز زندگی بہت سادہ، قلم توانا، طرز نگارش صاف، شستہ اور شگفتہ تھی۔ مرشد الامت حضرۃ الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے وصال کے بعد ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے آپ کو اتفاق رائے سے ندوۃ العلماء کا ناظر عام منتخب کیا اور تادم حیات آپ پوری تندہی کے ساتھ ادارہ کی ترقی کی فکر کرتے رہے۔

مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک، انتہائی سادگی کے پیکر اور شرافت ونجابت اور خاندانی روایات کے امین تھے۔ ابھی گذشتہ نومبر کی ۱۵-۱۶؍تاریخ کو جامعۃ الھدایت جے پور میں منعقد ہونے والے رابطہ ادبِ اسلامی کے سیمینار میں بنفس نفیس شرکت کی، اس موقع پر ان سے مختلف نشستوں میں مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کا موقع ملا، آج بھی ان کی جدائی پر یقین نہیں ہوتا مگر مشیت الٰہی کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کرنا ہی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے اور اس ملت اور خاص طور پر مادر علمی کے لیے ان کا بدل عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

.... بقیہ صفحہ ۱۹؍کا

خاندان کے لوگوں کے تقاضے اور مشورہ سے حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم کی خدمت میں ان کے لیے چند جملے نصیحت اور دلداری کے لیے عرض کیا، حضرت مدظلہ نے اس کو بھی قبول فرمایا اور مسیج ریکارڈ فرمایا جس سے ہم سب کو تسلی ہوئی۔

اس کو میں اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں اور اس خاندان کا جو حق ہم سب پر ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے، لیکن پھر بھی حضرت کے تعزیتی کلمات اور دعائیں اور نصیحتیں یہ سب حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی صاحبؒ کے لیے صدقہ جاریہ اور سب خاندان اور متعلقین کے لیے تسلی خاطر کا سبب ہوگا۔

امید ہے اللہ تعالیٰ ہمارے عزیز مولانا سید جعفر مسعود حسنی رحمہ اللہ کی روح کو اعلیٰ علیین میں قرار دے دیں اور ان کے سب پس ماندگان کو بالخصوص اولاد اور اہلیہ اور باقی سب کو اجر جزیل اور صبر جمیل عطا فرماویں۔ آمین!

☆☆☆☆☆

☆ امیر جامعۃ الہدایہ جے پور، جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

ملتِ اسلامیہ کا عظیم خسارہ

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خان ندوی ☆

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ عالم دین، ادیب، صحافی، نقاد، تجزیہ نگار، مخلص، انسانیت کے علمبردار اور داعی اسلام تھے، ان کی وفات ملت اسلامیہ کا عظیم خسارہ ہے۔

جاپان کے رات ایک بجے کے قریب ضرورت سے اٹھا تو واٹس ایپ پر خبر دیکھی کہ مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ ۱۴؍رجب المرجب ۱۴۴۶ھ مطابق ۱۵؍جنوری ۲۰۲۵ء بدھ کی شام کو رائے بریلی شہر میں روڈ حادثہ میں رحلت فرماگئے۔ کسی طرح یقین نہیں آیا، چھوٹے بھائی ڈاکٹر کلیم الرحمٰن خان ندوی کو میسج ارسال کیا، لیکن اتفاق سے ان کا کوئی جواب نہیں آیا، رات بھر کسی طرح نیند نہیں آئی، رات ہی میں محمد جاوید خان صاحب لکھنوی جاپانی (جن کا ندوہ کے حضرات سے بہت قریبی تعلق ہے اور وہ فوراً ہی رات میں رائے بریلی پہنچ گئے تھے) سے حادثہ کی تصدیق ہوئی اور انہوں نے ہی حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء دامت برکاتہم سے ٹیلیفون پر بات کرائی۔ میں نے تعزیتی کلمات حضرت کی خدمت میں عرض کیے، حضرت ناظم صاحب حادثہ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اس کے بعد چھوٹے بھائی ڈاکٹر کلیم الرحمٰن خان ندوی سے بات ہوئی، ان کا تعلق مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ سے بہت قریبی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کا مزہ سب کو چکھنا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ" [آل عمران: ۱۸۵] (ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا، تو جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔)

ایسے موقع پر افسوس ہونا فطری بات ہے، لیکن مؤمن کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ ایسے موقع پر صبر کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" (ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔

مولانا سید جعفر حسنی ندویؒ کی وفات تمام دینی و علمی حلقوں اور ندوۃ العلماء کے لیے ایک جاں گداز سانحہ ہے، آپ کی وفات سے پورا ندوۃ العلماء اور عالم اسلامی غم و افسوس کی فضا میں ڈوب گیا۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ دائرۂ شاہ علم کے سادات حسنی سے نسبت رکھتے تھے جو خاندان ہندوستان میں اپنی خصوصیات اور اپنی زرّیں خدمات کی وجہ سے نمایاں اور بے مثال ہے۔ اس خاندان کی خصوصیات میں دنیا سے بے رغبتی اور زہد و استغناء سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس خاندان میں علمی و عملی تسلسل کا کبھی توقف نہیں ہوا، علوم و فنون کی خدمت اور دعوت و تبلیغ و اصلاح و رشد کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ بھی اسی سلسلہ کی ایک سنہری کڑی تھے۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ کے اندر بہت سی عالی اور عظیم نسبتیں جمع تھیں، وہ صحیح النسب حسنی تھے، وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی غفر اللہ لہ کی ہمشیرہ محترمہ امۃ العزیز غفر اللہ لہا کے پوتے تھے، وہ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے اور داماد تھے، وہ حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی غفر اللہ لہ کے اکلوتے فرزند ارجمند تھے۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ فکر ندوۃ اور مفکر اسلام سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، حضرت سید محمد رابع حسنی ندوی اور اپنے والد ماجد مولانا سید واضح رشید ندوی غفر اللہ لہم کے ترجمان اور فیض یافتہ اور تربیت یافتہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ کو اپنے خانوادے کے دیگر بزرگوں کی طرح للّٰہیت، زہد و تقویٰ، علم و عمل، فکر و نظر، معرفت، عزم، اخلاص، نیک طبیعت، خاموش مزاج، تواضع، ملنسار، ہمدردی و غمگساری، شرافت و مروء ت، تہذیب و ثقافت، غیرت و خودداری، فنائیت اور کسر نفسی سے جیسی صفات سے نوازا تھا، وہ جاہ و منصب کی چاہت اور شہرت و ناموری سے بہت دور تھے، وہ تکلف و تصنع سے پاک زندگی گزارتے تھے، بلکہ سادگی اور بے نفسی میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید واضح رشید غفر اللہ لہ کے نقش قدم پر تھے، وہ دینی خدمات کی وجہ سے علمی و دینی حلقوں میں ہردل عزیز تھے، وہ اعلیٰ انسانی قدروں کے حامل اور بلند اخلاق کا پیکر تھے، ان کی خوش مذاقی، خندہ پیشانی اور حسن اخلاق کا عالم یہ تھا کہ جو شخص ان سے ملا گرویدہ ہوگیا۔ ان کی وسعت نظر و رواداری، دین کے لیے ان کا

☆ پروفیسر چوؤ یونیورسٹی ٹوکیو، چیئرمین ندوہ اسلامک ایجوکیشن سینٹر، جاپان

اخلاص، زندگی میں نفاست اور بے تکلفی کا امتزاج، ان کے ذوق مہمان نوازی، ان کی باغ و بہار علمی مجلسیں، ان کے عالمانہ لطائف وظرائف جیسی صفات حسنہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ کی مہمان نوازی کی بات کی جائے تو ندوہ جانے سے قبل ڈاکٹر کلیم الرحمٰن ندوی سے طے کر لیتے تھے کہ سلیم بھائی آرہے ہیں، خاتون منزل میں تشریف آوری ضرور ہوگی۔

جناب ڈاکٹر محمد وثیق ندوی صاحب کی تحریر کے مطابق مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ ۱۹۶۰ء کو تکیہ رائے بریلی، اتر پردیش میں پیدا ہوئے، انہوں نے حفظ قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن رائے بریلی میں حاصل کی، اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا اور علوم شرعیہ کے ساتھ عربی زبان وادب میں بھی مہارت پیدا کی، دار العلوم ندوہ العلماء لکھنؤ سے ۱۹۸۱ء میں عالمیت، ۱۹۸۳ء میں فضیلت اور ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان وادب میں ایم اے کیا، ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب کی معروف یونیورسٹی ''جامعۃ الملک سعود'' کے زیر اہتمام اساتذہ ٹریننگ کا کورس مکمل کیا۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا، ان کی تدریسی خدمات کا آغاز لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ نخاس سے ہوا۔ طویل عرصہ تک وہاں تدریس سے وابستہ رہے۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ اپنے والد ماجد غفر اللہ لہ کی رحلت کے بعد وہ مستقل طور پر دار العلوم ندوۃ العلماء کی تدریسی خدمات کے لیے یکسو ہوگئے تھے۔ مرشد الملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی غفر اللہ لہ سابق ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (۲۰۲۳ء) کی وفات کے بعد جب حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب کیے گئے، مولانا سید جعفر حسنی ندوی میں انتظام وانصرام کی بڑی صلاحیت تھی جس کی وجہ سے ان کو ندوۃ العلماء کا ناظر عام منتخب کیا گیا۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ تدریسی اور قلمی خدمات تو کئی دہائیوں سے انجام دے رہے تھے، وہ اردو اور عربی کے بہترین صاحب قلم تھے، ان کی تحریریں فکر اسلامی کی آئینہ دار تھیں، وہ ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان ''الرائد'' کے چیف ایڈیٹر تھے، ''الرائد'' میں شائع ہونے والے مضامین ان کے فکر ونظر کی عکاسی کرتے ہیں اور اپنے مرحوم والد محترم کی صحافتی تربیت کا نمونہ بھی تھے، ان کی عالم اسلام کے حالات پر اچھی نظر تھی اور وہاں کے حالات وواقعات پر ناقدانہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ لیکن دو سال قبل جب ان کو ندوۃ العلماء کا ناظر عام منتخب کیا گیا تو حجرۂ تدریس وصحافت سے نکل کر میدان عمل میں تشریف لائے۔ کانفرنسوں، سیمیناروں اور جلسوں میں بھی برابر شرکت کرنے لگے اور تقاریر سے حاضرین کو فائدہ اٹھانے کا موقع عنایت کرنے لگے، ادھر کثرت سے دینی وعلمی سفر بھی کرنے لگے، اس سب کے ساتھ ندوۃ العلماء کی فکر ان کا محور تھا جس کی ترقی کے لیے وہ دن رات کوشاں تھے۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ نے سینکڑوں ادبی اور فکری مقالات ومضامین تحریر فرمائے، اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی غفر اللہ لہ (۲۰۱۹ء) کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے عربی ترجمان پندرہ روزہ عربی جریدہ ''الرائد'' کے مدیر اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے، ہر شمارے میں ''الافتتاحية'' کے نام سے آپ کا اداریہ ہوتا، طویل عرصے تک طلبہ کے لیے ''أخي العزيز'' کے عنوان سے ایک خاص کالم ایک مخصوص اور انوکھے انداز میں لکھا کرتے تھے، آپ کے اُن تمام مضامین کا مجموعہ ''أخي العزيز'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا، اردو مضامین کا مجموعہ ''دعوت فکر ونظر'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں بیالیس مضامین شامل ہیں، مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۲۰۲۳ء) کے بعد ''رابطہ ادب اسلامی'' کے شعبہ برصغیر کا ان کو صدر منتخب کیا گیا، ان کے مختصر دور صدارت میں ادب اسلامی کے ملک کے مشہور اور بڑے شہروں میں متعدد کامیاب سیمینار منعقد ہوئے۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ نے عربی اور اردو میں کئی ایک تصنیفات اور ترجمے یادگار چھوڑے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

☆في مسيرة الحياة (حضرت مولانا علی میاں ندوی غفر اللہ لہ کی خودنوشت ''کاروان زندگی'' کا عربی ترجمہ)۔

☆الشيخ محمد يوسف الكاندهلوي، حياته ومنهجه في الدعوة (مولانا محمد الحسنیؒ کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)۔

☆الإمام المحدث محمد زكريا الكاندهلوي ومآثره العلمية (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)۔

☆دعوة للتأمل والتفكير (دعوتِ فکر ونظر) ''بصائر'' (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ)

میری آخری گفتگو ڈاکٹر کلیم الرحمٰن خان ندوی نے مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ جے پور میں ادب اسلامی کی سرگرمیوں میں کرائی تھی، بڑی اپنائیت سے سلام ودعا کے بعد فرمانے لگے کہ جلدی ندوہ کی انتظامیہ کے جلسہ میں ملاقات ہوگی، کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ ٹیلیفون پر آخری گفتگو ہوگی۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ کی رحلت کے

چند دن قبل میں نے ان کی خدمت میں ملخص عن کتاب "الثقافة الإسلامية فی اليابان" و"نظرة عامة علی الوضع فی اليابان خلال الفترة ۲۰۰۲م-۲۰۲٤م" مقدمہ لکھنے کی درخواست کی اور میسیج بھی ریکارڈ کر کے ارسال کیا، اسی طرح چھوٹے بھائی ڈاکٹر کلیم الرحمٰن خان ندوی کو بھی ارسال کیا تاکہ وہ تاکید کر کے درخواست پیش کر دیں بلکہ کلیم میاں نے بتایا کہ مولانا جعفر صاحب ۲۲ رجنوری ۲۰۲۵ء کو بھوپال تشریف لا رہے ہیں اور ان ہی کے گھر میں قیام فرمائیں گے۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی دامت برکاتہم ناظم ندوۃ العلماء کے دست راست، مشیر اور معاون ومخلص بن کر رہے اور تقریباً دو سال کے قلیل عرصہ میں جدید حالات کے تقاضے کے مطابق نئے شعبے قائم کیے اور قائم کردہ شعبوں میں استحکام پیدا کیا اور دونوں حضرات نے مل کر ندوہ کی تاریخ میں مثالی کردار ادا کیا۔

پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے مولانا سید خلیل حسنی ندوی، مولانا سید امین حسنی ندوی اور مولانا سید عبدالحی حسنی ندوی حفظہم اللہ اور ایک بیٹی ہیں، ان کے صاحب زادگان بھی عالم ہیں، امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ اپنے والد ماجد کے مشن کو سنبھال کر ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ مولانا سید جعفر حسنی ندوی غفر اللہ لہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرما، ان کی قبر کو روضة من رياض الجنة بنا، ان کے تمام نیک اعمال کو قبول فرما، ان کی لغزشوں کو معاف فرما، ان کے تمام رشتہ داروں اور تعلق والوں اور خاص طور سے حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی دامت برکاتہم ناظم ندوۃ العلماء کو صبر جمیل عطا فرما اور ندوۃ العلماء کو نعم البدل عطا فرما۔ آمین!

☆☆☆☆☆

ایک بڑا ملی وعلمی سانحہ

انجینئر سید سعادت اللہ حسینی ☆

۱۵ رجنوری ۲۰۲۵ء بروز بدھ عشاء کے وقت عالمی شہرت یافتہ درس گاہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظر عام مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی ایک سڑک حادثہ میں جاں بحق ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون!

مرحوم ایک معتبر عالم دین، عربی کے ممتاز ادیب وانشاء پرداز، قابل منتظم اور دردمند ملی رہ نما تھے۔ ان کی وفات نہ صرف وابستگان ندوہ کے لیے بہت تکلیف دہ اور الم انگیز ہے بلکہ پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے ایک بڑا ملی وعلمی سانحہ ہے۔

مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ اپنے والد مرحوم کی وفات کے بعد سے مشہور عربی جریدے پندرہ روزہ "الرائد" کے رئیس التحریر تھے۔ وہ رابطہ ادبِ اسلامی شعبۂ برصغیر کے صدر بھی تھے اور ان دونوں ہی پلیٹ فارموں سے علم وادب کے میدان میں وہ اپنی گراں قدر خدمات بہ حسن وخوبی انجام دے رہے تھے۔

مولانا جعفر مسعود حسنیؒ اپنے نامور چچا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے علمی وارث اور ان کے جانشین تھے، انہوں نے اپنے عم مکرم کی وفات کے بعد ندوہ کا انتظام وانصرام سنبھالا اور مختصر وقت میں انہوں نے ندوہ کے نظم وانتظام میں اہم کردار ادا کیا۔

مولاناؒ کی رفاہی خدمات بھی قابل ذکر ہیں، ملی فوروموں میں ان کی فعال شرکت رہتی تھی اور وہ اپنی زبان وبیان سے اصلاحِ معاشرہ میں ایک اہم رول ادا کر رہے تھے۔ مولاناؒ سے متعدد ملی ودینی جلسوں اور کانفرنسوں میں میری بڑی خوش گوار ملاقاتیں ہوئیں اور ان سے مختصر گفتگو کا موقع بھی میسر آیا، ان ملاقاتوں میں اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ وہ انتہائی خوش مزاج، خوش گفتار اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی دل نواز ادا اور ان کا تبسم نواز چہرہ ہر شخص کو ان کا گرویدہ بنا لینے کے لیے کافی تھا۔ ان کی گفتگو جامع و مرتب ہوتی، حقائق پر مبنی ہوتی اور سامعین پر اپنا گہرا نقش ثبت کرنے والی ہوتی تھی۔

حسن اتفاق ہے کہ ان کی وفات سے محض ایک ماہ قبل ہی مجھے ان سے ایک تفصیلی ملاقات کا موقع ملا، جب میں ندوۃ العلماء لکھنؤ حاضر ہوا تو انہوں نے پرتپاک استقبال کیا، بے تکلف گفتگو کی اور بھرپور وقت دیا۔ مرحوم نے ہمارے وفد کے اعزاز میں اساتذۂ ندوہ کی ایک خصوصی نشست بھی طلب کی تھی تاکہ ہم ان سے ملاقات کر کے تبادلہ خیالات بھی کر سکیں۔ پھر انہوں نے اپنی معیت میں ہمیں دیر تک ندوہ کے مختلف شعبوں، لائبریری اور دیگر مقامات کی تفصیلی زیارت بھی خود ہی کرائی تھی۔ اس ملاقات کی حسین یادیں اب تک ذہن ودماغ کے نہاں خانوں میں نقش ہیں اور اب اس طرح ان کی اچانک وفات سے یقین نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے جدا ہوگئے۔

میں اپنی اور جماعت اسلامی ہند کی جانب سے مرحوم کے اہل خانہ اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اور تمام متعلقین کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے، انہیں اجر جزیل عطا فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

☆ امیر جماعت اسلامی ہند

آبروئے بزم

مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی☆

یہ کیا دستِ اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے توڑنا پھول اور ویرانے میں رکھدینا

ازل سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے وہ جانے کے لیے ہی آیا ہے، یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے، لیکن خوش نصیب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کو اللہ کے حکم کے مطابق گذارنے کی کوشش کی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ نظام ہے کہ اس نے کام کرنے کے لیے زندگی نہیں دی بلکہ مدت پوری کرنے کے لیے عطا کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَى أَجَلٌ مُّسَمًّى" [الأنعام:۶۰] (اور وہی ہے جو رات کو تمہیں وفات دے دیتا ہے اور تم دن میں جو کام کاج کرتے ہو اس سے بھی وہ واقف ہے پھر وہ دن میں تمہیں اٹھا دیتا ہے تاکہ متعین مدت پوری ہو۔)

تاہم اس مدت کے پورا کرنے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ فرمانِ خداوندی کے زیر سایہ اس کی تکمیل کرتا ہے یا نام نہاد زندگی کو خراب کرنے پر آمادہ ہے؟!

سچی بات یہ ہے کہ زندگی اور موت دونوں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک عطیہ ہیں اور جس طرح زندگی ایک مخلوق ہے، اسی طرح موت بھی ایک مخلوق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ" [الملك: ۲] (وہی ذات ہے جس نے موت وزندگی کو پیدا کیا۔)

لیکن موت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کب آئے گی؟ کس حالت میں آئے گی اور کہاں آئے گی؟ اس کا علم کسی کو نہیں ہے۔ حقیقت میں موت خود ہماری زندگی کی محافظ ہے۔ اگر ہماری زندگی باقی ہے تو ہم ٹرین کے نیچے آجائیں، ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوں اور وہ کرش ہو جائے یا بس میں سوار ہوں اور ٹکر ہو جائے، یا سمندر اور تالاب میں ڈوب جائیں، تب بھی ہماری موت واقع نہیں ہو سکتی۔

بلاشبہ موت وزندگی کا اصل اختیار اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ اپنے بندوں کو موت سے بھی آزماتا ہے اور زندگی دے کر بھی آزماتا ہے۔ کامیاب بندے وہ ہیں جو زندگی کی نعمت ملنے پر ایمان والے ہوں اور احکام خداوندی پر عمل کرنے والے ہوں۔ ایسے لوگوں کو جب موت آتی ہے تو ان کا عالم یہ ہوتا ہے کہ پوری دنیا ان کی جدائی پر رو رہی ہوتی ہے مگر حقیقت میں وہ لقائے رب کے شوق میں فرحاں وشاداں ہوتے ہیں۔

یقیناً مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ کا شمار بھی شہداء وصالحین کی اسی فہرست میں ہے کہ انہوں نے ایسی ہی زندگی گذاری ہے۔

ہم ان سے بچپن کے دور سے واقف ہیں، وہ مجھ سے عمر میں تقریباً آٹھ سال چھوٹے تھے، لیکن مختلف موقعوں اور مناسبتوں سے ان کا اور ہمارا ساتھ رہا ہے اور حسین یادیں رہی ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہم امین آباد کی ایک مسجد میں امام تھے اور وہیں مقیم بھی تھے، یہ مسجد امین آباد میں ان کے گھر سے قریب تھی، ہم سب احباب اسی مسجد کے تہ خانے میں جمع ہوتے تھے، اس وقت ان کی عمر بمشکل تیرہ چودہ سال کی تھی، تاہم پھر بھی ان کی صورت وسیرت سے نبوغ کا احساس ہوتا تھا۔

ہم تمام ساتھی جب وہاں جمع ہوتے تو چند عناوین کا انتخاب کر لیتے اور اس پر اپنے اپنے مقالات و خطابات تیار کر کے لانے کی کوشش کرتے تھے، مولانا مرحوم بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور اپنی تقریر یا مقالہ بہترین انداز میں پیش کرتے تھے۔

اس زمانہ میں لکھنؤ کے جھنڈے والے پارک میں بڑے پیمانہ پر سیرت کا ایک اجلاس منعقد ہوتا تھا جس میں تقریریں اور مسابقات بھی ہوتے تھے، ایک مرتبہ اسی جلسے کا موقع تھا اور اس وقت شاید ان کی عمر پندرہ برس کی رہی ہوگی کہ انہوں نے بھی اس پروگرام کے اندر مسابقے میں حصہ لیا اور اتفاق سے میں بھی ایک مساہم کی حیثیت سے اس میں شریک تھا لیکن وہ اس میں غالب آئے اور ہم سب مغلوب ہو گئے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے مولانا کو تحریر کی غیر معمولی صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ خطابت کا ملکہ بھی انہیں بچپن ہی سے خوب حاصل تھا۔ میں تو بے تکلفی میں اکثر ان سے کہتا تھا کہ آپ نے تو بچپن ہی میں ہمیں خطابت میں شکست دے دی تھی مگر وہ کچھ نہ کہتے اور مسکرا دیتے۔

مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا وصف "تواضع" تھا۔ ندوہ سے فراغت کے بعد ان کی زندگی کا زیادہ تر عرصہ مدرسہ عالیہ عرفانیہ لکھنؤ میں گذرا جہاں وہ استاد تھے اور انہوں نے اپنی عمر عزیز کے ۲۰ ربرس وہیں مکمل کیے۔ عجیب اتفاق تھا کہ جب وہاں ان کی مدتِ تدریس مکمل ہوئی تو یہ وہ وقت تھا جب ندوہ کیے بعد دیگرے اپنے کئی اربابِ حل وعقد کو کھو چکا تھا، اس لیے یہاں ان کی ضرورت محسوس کی گئی اور وہ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد ندوہ کے ناظر عام منتخب ہوئے مگر ان کی سادگی و تواضع کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس طلبہ اور مہمانوں کی

☆عمید کلیۃ الدعوہ والاعلام واستاد حدیث، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ایک بھیڑ لگی رہتی تھی لیکن وہ کبھی اپنی زبان سے کسی کو کچھ نہ کہتے بلکہ بعض مرتبہ تو یہ حالت ہوتی تھی کہ اگر کچھ بات کرنا ہوتو مشکل ہوجائے۔اسی طرح یہ بھی انتہائی درجہ ان کی تواضع ہی تھی کہ میں جب بھی ان کے دفتر پہنچتا تو باوجودیکہ وہ ناظر عام تھے مگر وہ ہمیشہ مجھے دیکھ کر فوراً استقبال میں کھڑے ہوجاتے،ظاہر ہے یہ تواضع ان کا خاندانی وصف ہے لیکن بلاشبہ اس میں وہ سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے تھے۔

وہ عربی زبان وادب کے رمز شناس اور صاحب طرز ادیب تھے،ندوہ میں ناظر عام بننے سے پہلے ہی وہ اس کے پندرہ روزہ عربی مجلّہ ’’الرائد‘‘ کے سب سے مشہور کالم نگار تھے۔بلاشبہ ان کے مشہور کالم ’’رکن الاطفال‘‘، ’’براعم الایمان‘‘ اور ان کے اداریوں سے پورے برصغیر میں استفادہ کیا جاتا ہے۔عربی کے ساتھ انہیں اردو زبان اور شعروادب کا بھی خاص ذوق حاصل تھا اور اس میں بھی وہ ایک ماہر قلم کار تھے۔اس کا مجھے ذاتی طور پر بھی تجربہ ہے،جب میں نے اپنا مجموعہ ’’متاع خامۂ دل‘‘ مرتب کرکے انہیں مقدمہ تحریر کرنے کے لیے پیش کیا،تو انہوں نے اسے بڑی خوشی کے ساتھ قبول کیا اور تقریباً چھ سات صفحات پر مشتمل ایک ایسا قیمتی اور ادیبانہ مقدمہ تحریر فرمایا کہ جس نے بھی پڑھا وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوگیا۔

خانوادۂ حسنی کا امتیاز یہ ہے کہ تفسیر وحدیث اور تاریخ وادب جیسے اہم فنون میں اس کے افراد کو ید طولیٰ حاصل ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت نے اپنے راستے میں اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کرنے کا جو جذبہ اس خانوادے کے افراد کو عطا فرمایا ہے،وہ بھی اس دور میں ایک نمونہ کی چیز ہے۔بلاشبہ مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ بھی اپنی انہی خاندانی روایات کے امین ومحافظ تھے۔

☆☆☆☆☆

وہ عظمتِ اسلاف کی درخشندہ نشانی

مولانا شکیل احمد اعظمی ندوی☆

مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ کے نام سے میں بہت پہلے سے واقف تھا،لیکن ان سے میری باقاعدہ ملاقات ۲۰۱۷ میں ہوئی،جب میں ندوہ کے مہمان خانہ میں مقیم تھا اور اپنے استاد مکرم مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کے ساتھ تبادلہ خیال کررہا تھا اور خاص طور پر شرق اوسط کے سیاسی حالات پر گفت وشنید ہورہی تھی،اس موقع پر بہت سے طلبہ بھی جمع تھے اور اتفاق سے مولانا جعفر صاحب بھی اسی مجلس میں موجود تھے،انہوں نے بعد میں مجھ سے باقاعدہ ملاقات کرکے کہا:میں نے دیکھا کہ والد صاحب آپ سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آرہے تھے،میں نے بھی آپ سے مجلس میں استفادہ کیا۔اسی ملاقات کے دوران میں نے مہمان خانے سے باہر نکل کر ان سے یہ بھی کہا کہ میں شبلی ہاسٹل اور اپنا کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں تو انہوں نے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ چلیے،پھر انہوں نے سب کچھ خود دکھلایا اور میں ان کے ساتھ دیر تک ندوہ میں گھومتا رہا۔

یہ گویا پہلا موقع تھا جب مولانا جعفر صاحب سے علیک سلیک شروع ہوئی، اس کے بعد جب بھی ندوہ آنا جانا ہوتا تو ان سے ضرور ملاقات ہوتی اور اس کے علاوہ ٹیلی فون پر بھی رابطہ رہتا۔

گذشتہ دنوں بعض ایسے حالات پیش آئے کہ پورا خانوادۂ حسنی شدید پریشانی سے دوچار ہوا،اس موقع پر مولانا جعفر صاحب سے کئی مرتبہ فون پر گفتگو ہوئی اور بعض مرتبہ تو حالات بیان کرتے ہوئے ان پر گریہ طاری ہوجاتا تھا۔وہ بلند اخلاق کے حامل اور بڑے ہی خاکسار شخص تھے،اگر تعلیمی لائن سے کسی کا تجربہ دیکھتے تو اس کی بات بغور سنتے اور اس سے مفید تجاویز اور مشورے بھی مانگتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔

ان سے میری آخری ملاقات تب ہوئی جب وہ بحرین کے سفر پر آئے تھے،اس وقت ان کا ایک بڑا کامیاب دورہ ہوا۔ہم انہیں بحرین میں مختلف جگہوں پر لے کر گئے اور علمی شخصیات سے ملاقاتیں کیں اور تبادلہ خیال ہوا،اس سفر سے ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ اس سے ان شاء اللہ ندوہ کا تعارف اور عالم عرب میں دوبارہ تعلقات کو بنانے اور مستحکم کرنے کے لحاظ سے یہ دورہ بڑا کامیاب ثابت ہوگا۔اس دورے میں ان کی متعدد ملاقاتیں یونیورسٹی کے پروفیسر جو اسلامی ذہن رکھتے ہیں ان سے بھی ہوئیں اور یہاں سارے ہی لوگ ان سے ملاقات کرکے بڑے خوش ہوئے اور ان کا بڑا اعزاز کیا۔

ان کے اندر بڑوں کے ادب واحترام کا انتہائی جذبہ تھا، میں جب ندوہ ان سے ملنے ان کے آفس پہنچا تو انہوں نے اپنی کرسی چھوڑ کر میرے برابر والی کرسی پر بیٹھنا پسند کیا۔اسی طرح جب وہ بحرین آئے تو ہمیشہ میرے دائیں بائیں بیٹھتے اور کبھی آگے چلنا تک پسند نہ فرماتے، گویا وہ یہ تاثر دیتے کہ میں ان کا بڑا بھائی ہوں۔

ان کی ذات سے اب سب کو یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ ندوہ کا انتظام وانصرام اب قابل اعتبار ہاتھوں میں ہے،یہ وہ لوگ ہیں جو ندوہ کو ترقی دینے اور اس کو ایک نئے دور کی طرف لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں،مگر ایسے میں اچانک ان کی رحلت ہم سب پر بڑی شاق گذری۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ندوہ کی موجودہ قیادت کو ہمت وحوصلہ عطا فرمائے۔آمین!

☆☆☆☆☆

☆ ڈائریکٹر ابن الہیثم اسلامک اسکول،بحرین

آہ! ایک اور فرزندِ ندوہ رخصت ہوگیا

جناب ضیاء عبداللہ ندوی ☆

زندگی ہے انسان کی مانند مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اڑ گیا

۱۵/جنوری کی شام کو اچانک حادثہ فاجعہ کی خبر ملی کہ برادر عزیز جعفر مسعود ایک سڑک حادثہ میں جاں بحق ہوگئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔یقین کرنا مشکل تھا؛ لیکن انسان کر ہی کیا سکتا ہے، یقین کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ دنیا ومافیہا میں کسی کو بقا نہیں ہے۔ ہر آنے والا اپنی عمر مقرر پوری کر کے داغ مفارقت دے جاتا ہے؛ لیکن اس طرح اچانک غیر متوقع طور پر جب خبر ملتی ہے تو انسان حواس کھو بیٹھتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ندوہ اور حسنی خاندان سے خاص تعلق کی بنا پر مجھے بہت گہرا صدمہ ہوا۔کوئی صاحب علم ومعرفت دنیا سے جاتا ہے تو بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی، کیوں کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اہل علم کا اٹھ جانا علم کے اٹھائے جانے کے تکوینی سلسلے کا ایک حصہ ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں یکے بعد دیگرے ندوے نے اپنے عظیم ہستیوں کو کھو دیا ہے، اللہ امت مسلمہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

برادر عزیز جعفر مسعود اگر چہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے؛ لیکن اللہ نے انہیں علم وفضل سے نوازا تھا۔ندوۃ العلماء کے قابل فخر فرزند ارجمند تھے،ان کے اندر عقیدے کی پختگی، فکر کی بالیدگی، زبان کی عمدگی،علم کی گہرائی وگیرائی اور رہن سن کی سادگی تھی،امت مسلمہ کا درد وغم رکھتے تھے۔روشن دماغ،دل دردمند،فکر ارجمند اور زبان ہوشمند کے مالک تھے۔کہنہ مشق وتجربہ کار استاذ و معلم تھے، ان کے اندر ہمہ جہت صلاحیتیں تھیں۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز تدریس وتعلیم سے کیا، تعلیم وتربیت ایک ایسا فن ہے جو انسان کو کتابوں کے علم کے ساتھ ساتھ زندگی کا علم اور تجربات عطا کرتا ہے، کم وبیش چار دہائیوں تک وہ خاموشی کے ساتھ تدریس اور تعلیم وتربیت کے میدان میں سرگرم رہے،اس عرصہ میں ہزاروں تشنگان علم نے ان سے کسب فیض کیا جو اس وقت ملک وبیرون ملک میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، دوران تدریس وہ اپنے شاگردوں کے ہر دلعزیز استاد رہے۔ وہ صرف ایک اچھے مدرس، منتظم ہی نہیں؛ بلکہ ایک بے مثال انسان تھے۔ جنہوں نے ایک مثالی زندگی گزاری۔تواضع اور انکساری ان کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔سخاوت تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی،ان کی اس صفت کا اندازہ ان کی وفات کے بعد ہی لوگوں کو ہوسکا۔

تعلیم وتعلم کے اس سفر میں انہوں نے خاموشی سے اپنے چچا مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی حکمت و بصیرت اور اپنے والد محترم مولانا سید محمد واضح رشید ندوی کی فکر ودانائی کو اپنے اندر سمونے کی بھرپور کوشش کی جس کا اظہار اس وقت سے شروع ہوا جب وہ پندرہ روزہ "الرائد" کے پہلے کالم نگار پھر مدیر اعلیٰ ہوئے،اور ان کی فکر انگیز عربی تحریریں شفتہ اور شگفتہ اسلوب میں سامنے آنے لگیں، "الرائد" میں "براعم الایمان" کے عنوان سے ان کے کالم نے ملک گیر شہرت حاصل کی، اس دوران اردو میں ان کی تحریریں سامنے آنے لگیں تو انکشاف ہوا کہ وہ عربی کے ساتھ اردو کے بھی صاحب طرز ادیب ہیں، پھر ان کا ایک صوتی پیغام کا سلسلہ "کام کی بات" کے عنوان سے شروع ہوا جس سے ان کی گفتار کے جوہر کھلنے لگے۔اس صوتی پیغام میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا تھا جن کا سماجی زندگی سے گہرا ربط ہوتا تھا،موضوعات مذہبی اور انسانی ہر طرح کے ہوا کرتے تھے، بات بہت مختصر مگر جامع ہوا کرتی تھی، زبان ہلکی پھلکی اور عام فہم استعمال کی جاتی تھی جس سے ہر طبقہ کے لیے سمجھنا آسان ہوتا تھا۔ اسلوب ایسا تھا کہ سمجھنے والا فوراً سمجھ جاتا کہ روئے سخن کس طرف ہے اور اس طرح مخاطب کی صراحت کے بغیر ان تک بات پہنچ جاتی تھی۔

ندوہ کے ناظر عام مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی کے انتقال کے بعد وہ ندوہ کے ناظر عام منتخب ہوئے، مجلس تحقیقات ونشریات کے سکریٹری،اور رابطہ ادب اسلامی کے پہلے جنرل سکریٹری اور پھر صدر منتخب ہوئے،ان انتظامی ذمہ داریوں میں انہوں نے روایتی طریقہ سے الگ اپنی خدمات پیش کرنے کی کوشش کی، اور مختصر وقت میں ندوہ اور اس سے جڑے اداروں کی ترقی اور بہبود کے لیے بہت کچھ کر گئے، وہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کے دست راست، اچھے مشیر اور دست و باز و بنتے جا رہے تھے، دنیا کی نظریں ان پر ٹکی تھیں،اور اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ ندوہ ان دونوں حضرات کی یکجہتی سے ایک نئے عہد کا آغاز کرے گا کہ تقدیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا، جس کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اللہ مرحوم کو غریق رحمت کرے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ مولانا مرحوم کے صاحبزادگان عزیزم خلیل، امین اور عبدالحی جوان کے تربیت یافتہ ہیں اور انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب سے خوب دین کی خدمت لے اور جمیع پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

☆ رکن مجلس انتظامی ندوۃ العلماء لکھنؤ

ایک مخلص معلم، داعی اور مفکر کا داغِ جدائی

مولانا عبدالمتین منیری☆

اللہ کی ذات خالق ومالک ہے، وہ حی وقیوم علیم و خبیر اور دانا ہے۔ ۱۵؍دسمبر ۲۰۲۵ کی شام یہ خبر بجلی کی طرح گری کہ مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی رائے بریلی میں ایک مصاحب کے ساتھ جاتے ہوئے سڑک کنارے بائک روک کر مفلر باندھ رہے تھے کہ اچانک ایک سوئفٹ ڈیزائر نے پیچھے سے ٹکر ماردی، مار اتنی سخت پڑی کہ مولانا نے وہیں دم توڑ دیا، اس خبر نے دل ودماغ کو ہلاکر رکھ دیا ہے، اس اندوہ ناک خبر کو سننے کے لیے کان ہرگز تیار نہیں تھے، لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟! دنیا کی اس سرائے میں کوئی انسان مقررہ مدت سے زیادہ ایک لمحے بھی کوئی رہنے کا روادار نہیں۔

آپ کا تعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کے خانوادے سے تھا، مؤرخہ ۱۳؍ستمبر ۱۹۶۰ء کو تکیہ رائے بریلی اتر پردیش میں آپ نے آنکھیں کھولیں، آپ کے والد ماجد مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سابق عمید اللغۃ العربیۃ ومعتمد تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے حقیقی بھانجے اور عربی زبان کے نامور ادیب اور صحافی تھے۔

آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا، آپ نخاس لکھنؤ میں واقع ندوۃ العلماء لکھنؤ کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ کا اصل موضوع تفسیر وحدیث اور فکر اسلامی تھا، اب تک آپ نے بے شمار ادبی، فکری و تاریخی مقالات ومضامین لکھے ہیں، اپنے والد ماجد کی مؤرخہ ۱۶؍جنوری ۲۰۱۹ء میں رحلت کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے عربی ترجمان پندرہ روزہ عربی جریدہ "الرائد" کے مدیر اعلیٰ (رئیس التحریر) کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے، آپ نے عربی اور اردو میں کئی ایک تصنیفات اور ترجمے یادگار چھوڑے۔

اپنے والد ماجد کی رحلت کے بعد آپ مستقل طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمات کے لیے یکسو ہوگئے تھے اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی مؤرخہ ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ کو رحلت کے بعد جب مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب کو ناظم ندوۃ العلماء منتخب کیا گیا تو پھر ناظم عام کی حیثیت سے آپ کی تقرری عمل میں آئی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے خانوادے کے دیگر بزرگوں کی طرح زہد وتقویٰ، سنجیدگی وتمکنت اور علمی وادبی ذوق کے زیور سے آراستہ وپیراستہ کردیا تھا اور صحیح معنوں میں آپ اپنے عظیم اسلاف کے عادات واطوار کی نمائندگی کررہے تھے۔

آپ نے اپنے تایا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ کی دختر نیک اختر کے ساتھ اپنا گھر بسایا تھا اور کتنی حیرت اور دکھ کی بات ہے کہ مولانا رابع صاحب کے تینوں داماد؛ مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ، مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ اور اب آپ یکے بعد دیگرے عمر کی ساٹھ کی دہائی پار ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے، خاندان کے بڑے بزرگوں کی رحلت کے بعد حسنی خاندان کے بزرگ کی حیثیت آپ کو حاصل ہوگئی تھی، اب اس چراغ کی روشنی بھی گل ہوگئی ہے، دیکھئے اللہ تعالیٰ کن خوش نصیب افراد کے ہاتھوں میں اس بابرکت حسنی خانوادے کی باگ ڈور دیتا ہے۔

مرحوم ناظم ندوہ مولانا سید بلال حسنی دامت برکاتھم کے دست وبازو تھے، ایک ایسے وقت میں جب کے بڑے اٹھتے جارہے ہیں، اس عظیم ادارے کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے اور اس خالی جگہ کو پر کرنے کے کے لیے اللہ تعالیٰ اور کس کو منتخب کرتا ہے؟!

مولانا کی ہم سے اس طرح دائمی جدائی پر دل مغموم ہیں، لیکن مؤمن کا شیوہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی پر راضی رہے، لہٰذا زبانیں فیصلہ خداوندی پر خاموش ہیں، آج مولانا مقصد تخلیق کی راہ میں اپنی زندگی نچھاور کرکے خالق حقیقی سے جاملے ہیں، کل ہمیں بھی اسی طرح اس دنیا سے واپس جانا ہے، خوش نصیب ہے وہ جس کی زندگی کے آخری لمحات بھی مقصد تخلیق کی راہ میں نچھاور ہوں۔

مولانا جعفر مسعود مرحوم ایک خاموش مزاج انسان تھے، ان کے والد ماجد جس طرح خود کو مٹانے میں دلچسپی رکھتے تھے، انہیں بھی شہرت اور اسٹیج کی زینت بننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، لہٰذا مولانا سے ہمیں ملاقات کے شاذ ونادر ہی موقع نصیب ہوئے، اس کا ایک سبب آپ کا ندوے میں قیام پذیر نہ ہونا بھی تھا، حالانکہ ہمیں مولانا سے ۱۹۸۰ء سے ربط وتعلق تھا، جب کہ آپ ابھی عالمیت کے درجات میں زیر تعلیم تھے اور اس کی وجہ تقریب یہ بنی کہ جب ہم نے اکابر کی مجالس کی ریکارڈنگس جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو جن شخصیات سے پہلے پہل ان کی حصول یابی میں تعاون کی درخواست کی؛ ان میں مخدومی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی تھے، آپ کی خدمت میں پیش کردہ درخواست مولانا واضح صاحب تک پہنچی اور آپ نے ایک خورد کی ہمت افزائی ضروری سمجھ کر اپنے فرزند ارجمند مولانا جعفر مسعود صاحب کو ان کی فراہمی کے

☆مرکز جمعہ الماجد، دبئی

کام پر لگا دیا اور آپ کے توسط حضرت مولانا کی بڑی نادر و نایاب مجالس ہمیں دست یاب ہونے لگیں، مولانا سے یہ تعلق دو تین سال تک جاری و ساری رہا، پھر آپ عرفانیہ سے منسلک ہو گئے، اس دوران ہمارا ندوے یا رائے بریلی جانا ہوتا تو خواہش کے باوجود آپ سے ملاقات کے موقعے شاید و باید ہی مل پاتے، گذشتہ نومبر میں مولانا دبئی آئے تھے تو بڑی اچھی ملاقات رہی تھی، مدت بعد ملنے کے باوجود بڑی اپنائیت اور محبت کا سلوک کر رہے تھے، انہیں وہ پرانی باتیں اچھی طرح یاد تھیں، اس وقت بھٹکل کے سید خلیل الرحمٰن مرحوم بقید حیات تھے، آپ کے گھر پر بھی ایک خوبصورت ملاقات رہی تھی، مولانا نے ہم سے ندوے آ کر طلبہ سے کتب بینی اور ذوق مطالعہ اور ان جیسے موضوعات پر تبادلہ خیال کی خاص طور پر دعوت دی تھی، ان شاء اللہ اب کبھی ہمارا ندوے جانا ہوگا تو وہاں مولانا نہیں ہوں گے، ایک احساسِ محرومی ضرور ستائے گا، مولانا کا اس طرح اچانک اٹھ جانا ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے لیے بڑا سانحہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں پر وہ نسلیں تیار ہوتی ہیں جو ملت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ مولانا بنیاد کا پتھر تھے جو دکھائی نہیں دیتا، لیکن جب وہ اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے تو پوری عمارت چرمرانے لگتی ہے۔ ہم تو اب صرف یہی دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ آپ کا نعم البدل عطا کرے اور جن شخصیات کے لیے مولانا دست و بازو کی حیثیت رکھتے تھے، انہیں اس سانحہ کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے اور مولانا کی خالی جگہ کو پر کرنے کے اسباب پیدا کرے، اسی کے ہاتھ میں کائنات کی قدرت ہے، وہی کارساز ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کے اعمالِ صالحہ کو قبول کرے اور صدیقین و صالحین کے جلو میں آپ کو جگہ دے اور درجات بلند کرے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

خوشبو اُن کی یادوں کی

پروفیسر قاضی عبدالماجد ندوی☆

جعفر بھائی ندوہ میں مجھ سے دو سال سینئر تھے، جعفر بھائی کا حلقہ احباب زمانہ طالبِ علمی ہی سے ان کی اپنی خاندانی شرافت کے ساتھ کافی وسیع تھا اور ان کی بڑی مقبولیت تھی، طلبہ میں ان کی شخصیت کی ایک خاص محبوبیت تھی۔ یہی وہ صورت حال ہے جس نے ان کے ذہنی افق کو بڑا وسیع کیا، اس معاملہ میں وہ اپنے خانوادے کے برادران سے کچھ مختلف تھے کہ ان کا حلقہ احباب وسیع تھا لیکن اس چیز نے ان کی شخصیت کو دوسرے انداز سے بہت نکھارا۔

اخلاق و سادگی، تواضع، بڑوں کا احترام اور سب سے اپنائیت کے ساتھ ملنا' یہ ان کی وہ صفات تھیں کہ جو بھی ان سے ملا وہ ان کا بہت گرویدہ ہو گیا۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی وفات کے بعد براعظم امریکہ' یورپ' آسٹریلیا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تعزیتی اجلاس منعقد ہوئے اور ہر شخص نے یہی تاثر ظاہر کیا کہ وہ اس حادثہ سے بہت زیادہ غم گین ہے۔

گذشتہ سال حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد قدرے تاخیر سے بغرض تعزیت ندوہ میری حاضری ہوئی، میں نے آنے سے قبل ہی فون پر ان کو اطلاع دے دی تھی، جس کے بعد وہ مسلسل مجھ سے فون پر رابطہ میں رہے اور معلوم کرتے رہے کہ کہاں تک پہنچ گئے، پھر جب میں ندوہ پہنچ کر ان سے ملنے ان کے آفس گیا تو وہ بڑی اپنائیت اور تواضع کے ساتھ پیش آئے، ایسا لگتا تھا کہ ان کے ساتھ بہت ہی قریبی اور بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اپنے جاننے والوں کے لیے ان کے دل میں اس حد تک جگہ تھی اور ان کے اخلاقِ کریمانہ اس سطح کے تھے۔

اخیر عمر میں انہوں نے اپنے والد محترم مولانا واضح صاحب اور اپنے عم محترم مولانا رابع صاحب کی جس طرح خدمت کی اور جس طرح انہوں نے ان کا اعتماد حاصل کیا اور جس طرح اپنی تمام خدمات کو ندوۃ العلماء کے لیے مسخر کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ اس تھوڑے سے عرصے میں مجھے خود وہاں جا کر یہ احساس ہوا اور جب ان سے گفتگو ہوئی تو یہ معلوم ہوا کہ کم وقت میں اتنے اہم اصلاحی اقدامات انتظامی سطح پر ہوئے ہیں جن سے یہ لگ رہا تھا کہ ندوۃ العلماء ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اور ان کے ذریعہ ادارے کو بڑی رہنمائی مل رہی ہے۔

جعفر بھائی کی ایک کتاب "أخي العزيز" کا میں نے مطالعہ کیا تو مجھے لگا کہ ان کے اندر مختصر عبارتوں میں مضمون کو سمو دینے کا فن تھا، بلاشبہ وہ بڑی خوبصورت زبان لکھتے تھے۔

اللہ ہی اپنے فیصلوں کی حکمتیں جانتا ہے، لیکن ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے مادر علمی کی دست گیری فرمائے، وہ اس کے لیے غیب سے ایسے افراد کو مسخر کرے گا جو اس ادارہ کی اچھی طرح سے سربراہی کریں گے اور ہمارے اس ملک میں جو ہمارا دینی و تعلیمی نظام ہے، اس کے لیے وہ خدمات انجام دیں گے جس کی ہمیں توقع ہے اور ضرورت بھی۔

☆☆☆☆☆

☆ سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

عجب اِک سانحہ سا ہوگیا ہے

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی☆

مصائب اور تھے پر ان کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

۱۵؍جنوری سنہ ۲۰۲۵ء کو جعفر بھائی کے حادثۂ جانکاہ نے دل وجان کو جھنجھوڑ دیا۔ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی ندوۃ العلماء کے ناظر عام، ادبِ عربی وفکر اسلامی کے استاد اور پندرہ روزہ عربی جریدہ "الرائد" کے ایڈیٹر انچیف تھے، انا للہ وانا الیہ راجعون!

تیرے جانے سے گماں برہمی دہر کا تھا
تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہو

سنہ ۱۹۷۸ء میں ندوے میں میرا داخلہ ہوا، ہمارے درجہ میں پچاس طلبہ تھے، ان میں ایک طالب علم تھے جو کنارے بیٹھتے، خاموش رہتے، چپکے سے آتے اور چپکے سے چلے جاتے، شرافت ان کے چہرے سے ٹپکتی، بے ضرر تھے، نہ کسی سے لڑتے اور نہ کوئی بحث کرتے، وہ ہم میں سے تھے' پر ہم میں سے نہ لگتے، جو ایسا ہو اس سے دوستی کیسے ہو، تاہم یک طرفہ محبت ضرور ہوگئی، ملکوتی صفات سے آراستہ یہ طالب علم تھے؛ جعفر بھائی جو مرور ایام ولیالی سے دوست بھی بن گئے اور اچھے دوست، ہمیں ان کی دوستی پر ناز ہے۔

ندوہ کی طالب علمی میں چھ سال ہم ایک ساتھ رہے، فارغ ہونے کے بعد میں ندوہ میں مدرس ہوگیا اور جعفر بھائی کی تقرری مدرسہ عرفانیہ میں ہوئی، ہماری ملاقات تقریباً ہر روز ہوتی، عصر کے بعد ندوہ کی کینٹین کے باہر مجلسیں ہوتیں، گپ بازی ہوتی، شعر وشاعری ہوتی، زاہد صاحب میر مجلس ہوتے اور ہم چند دوست ان کے گرد ہالہ بنائے ہوتے، آہ وہ کیا ایام تھے! ان کی سہانی یادیں آج بھی ناخن بہ دل ہیں۔ جعفر بھائی سے میرے ماہ وسال سنہ ۱۹۷۸ء سے ان کے انتقال تک وابستہ ہیں:

شب صحبت غنیمت داں کہ بعد از روزگار ما
بسے گردش کند گردوں، بسے لیل ونہار آرد

جعفر بھائی کے اندر کئی نسبتیں جمع تھیں اور ہر نسبت متقاضی تھی کہ اس کی وجہ سے مجھے ان سے عقیدت ومحبت ہو، وہ صحیح النسب ساداتِ حسنی میں سے تھے اور تنہا یہ نسبت بہت سی نسبتوں کی جامع ہے۔ دوسری یہ کہ وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ کے پوتے تھے۔ تیسری یہ کہ وہ مخدوم معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے بھتیجے اور داماد تھے اور چوتھی یہ کہ وہ استاذ محترم مولانا محمد واضح رشید ندویؒ کے فرزند ارجمند تھے، پانچویں یہ کہ وہ میرے کلاس فیلو تھے۔ چھٹی یہ کہ وہ عربی اور اردو دونوں کے بہترین ادیب تھے۔ ساتویں یہ کہ اس عہد میں جب کہ علماء ومصنّفین میں افراط وتفریط کا شیوع ہے، وہ راہِ اعتدال پر گامزن تھے اور سب سے اہم یہ ہے کہ جعفر بھائی نیک انسان تھے اور شاید یہ آخری وجہ ہے جس کے سبب میرے دل میں ان کی غیر معمولی قدر وتعظیم رہی ہے۔

ہم "اخوان صفا" مادر علمی ندوۃ العلماء میں ایک دوسرے سے قریب تھے، درس گاہوں کے علاوہ تفریح کے اوقات میں اور علمی وادبی مجلسوں میں ساتھ رہتے، ندوۃ العلماء میں ہماری دوستی ضرب المثل تھی، ایسے پراگندہ طبع لوگ اب کہاں؟! ان پر افسوس جنہیں ان سے صحبت نہیں رہی، چند سالوں کے بعد گردش زمانہ نے ان محفلوں کو درہم برہم کردیا اور ہمارے جسموں کو دنیا کے دور دراز علاقوں میں منتشر کردیا:

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے
روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

لیکن ہماری ارواح وقلوب کو جدا کرنے میں زمانہ کو کامیابی نہیں ہوئی، دل اسی طرح ایک دوسرے سے مانوس رہے اور زبان اسی طرح ایک دوسرے کے ذکر سے معمور:

"إن التباعد لا يضر إذا تقاربت القلوب."

ہماری جدائی پر جب ماہ وسال کا طویل عرصہ گزر گیا اور امتحان صبر میں ہم کامیاب ہوگئے تو اس کے جزائے عاجل کے طور پر واٹس ایپ وجود پزیر ہوا اور ہمارے صبر کی برکت سے پوری دنیا اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے، لوگ موجود سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن سبب وجود پر نگاہ کم جاتی ہے۔

اس ایجاد کی وجہ سے دوریوں کے باوجود ہم ایک بار پھر اکٹھا ہوگئے اور وہی کیفیتیں تازہ ہوگئیں جو پہلے ہوتی تھیں، ہماری بے تکلفی کی مجلسیں دوبارہ زندہ ہوگئیں، علمی وادبی مناقشوں کی محفلیں ازسرنو قائم ہوگئیں، جب میں لکھنؤ جاتا تو کبھی کبھی وہ پرانا عہد لوٹ آتا، پھر وہی مجلسیں ہوتیں اور وہی دل کش گیت گائے جاتے:

وسألتهم عن فرقة الأحباب
قالوا ستنسى بعد طول غياب

☆آکسفورڈ، لندن

طال الغياب ولم تغب ذكراهم
إني وهم في العين كالأهداب

بڑے بڑے اصحابِ علم وفضل کو دیکھا گیا ہے کہ وہ غصہ میں آپے سے باہر ہوجاتے ہیں، آپس میں لڑائیاں کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت، حسد، کینہ وبغض کے جذبات رکھتے ہیں، ایک دوسرے سے قطع کلامی اور دشمنی کرتے ہیں اور اس پر اس کے خواہش مند کہ لوگ ان کا احترام کریں، سخت حیرت اس پر ہوتی ہے کہ کچھ لوگ اس بداخلاقی کو جلال کا نام دیتے ہیں، ہائے غلط تسمیہ نے کتنی گھناؤنی برائیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

اس کے برعکس جعفر بھائی کو غصہ ہوتے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی نفرت وحسد کرتے ہوئے، نہ ان کو کبھی برہم وبے زار پایا گیا، وہ اس طرح کے جذبات سے کبھی مغلوب نہ ہوتے اور نہ ان کی زبان سے کبھی کوئی سخت یا رکیک جملہ سنا جاتا:

نظر میں وہ گل سما گیا ہے، تمام ہستی پہ چھا گیا ہے
چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں میں مجھے اس کی خبر نہیں ہے

نفوس بشریہ کے اختلاف وتضاد کے متعلق ابو العتاہیہ کے درج ذیل اشعار کتنے سچے ہیں:

وفرز النفوس كفرز الصخور
ففيها النفيس وفيها الحجر
وبعض الأنام كبعض الشجر
جميل القوام شحيح الثمر
وبعض الوعود كبعض الغيوم
وكم من فواد كفيف البصر
وخير الكلام قليل الحروف
كثير القطوف بليغ الاثر

جعفر بھائی کی امانت داری کی ایک مثال یاد آرہی ہے، یہ غالباً سنہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے جب ہم نئے نئے مدرس ہوئے تھے، جعفر بھائی عرفانیہ میں پڑھاتے تھے، ایک روز حشمت اللہ صاحب نے عرفانیہ جانے کا پروگرام بنایا، مجھے بھی ساتھ لے لیا، وہاں پہنچ کر سوچا گیا کہ جعفر بھائی سے ملاقات کی جائے، جعفر بھائی اپنی کلاس میں پڑھا رہے تھے، ہم وہاں پہنچے، کلاس روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا، ہمیں یقین تھا کہ ہمیں دیکھتے ہی جعفر بھائی کلاس چھوڑ کر ہمارا والہانہ استقبال کریں گے، ہم دروازے کے سامنے کھڑے تھے، نشست کی ہیئت اس طرح تھی کہ جعفر بھائی کا رخ دروازہ کی طرف تھا اور طلبہ ان کی طرف متوجہ تھے، طلبہ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن جعفر بھائی نے تدریس جاری رکھی، ہم نے سوچا شاید انہماک کی وجہ سے ہماری طرف نگاہ نہیں کررہے ہیں، اس لیے اشاروں سے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن جعفر بھائی نے ہماری طرف رخ نہیں کیا اور نہ اپنے طرز تدریس میں کوئی فرق آنے دیا، پوری کلاس پر سنجیدہ علمی فضا برقرار رہی، اس اعراض وبے رخی کے درد سے زخمی ہوکر ہم نامراد ندوہ واپس آگئے۔

جعفر بھائی کا یہ انہماک یقیناً مدرسین کے لیے نمونہ ہے، اگر قاری مشتاق صاحب کو اس واقعہ کا علم ہوجاتا تو شاید جعفر بھائی کو انعام سے نوازتے۔

جب لکھنؤ جاتا تو کبھی کبھی دیکھتا کہ جعفر بھائی ایک کرسی پر تنہا خاموشی سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہی انفرادیت، وہی انداز تفکر، وہی غیبوبت، وہی ادائے بے نیازی واستغناء اور وہی ماحول سے انقطاع جسے صوفیہ جلوت میں خلوت سے تعبیر کرتے ہیں اور جو انسان کی ذہنی قوت اور عقلی پختگی کی دلیل ہے اور جس سے حکمت ودانائی کے سوتے نکلتے ہیں اور یہی حقیقت میں ہجرت ہے، اس میں شک نہیں کہ ذہنی ہجرت جسمانی ہجرت سے بدرجہا فائق ہے، جعفر بھائی کی عمر جس قدر بڑھتی جارہی تھی مولانا واضح صاحب سے مماثلت زیادہ ہوتی جارہی تھی اور میرے دل میں ان کی عقیدت ومحبت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا:

مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بے دل پسند آیا

جعفر بھائی کو بہترین منتظم کہا جائے، انہیں اچھے مدرس کے نام سے یاد کیا جائے، ان کو ادیب وانشاء پرداز سمجھا جائے، ایک بااخلاق، نیک، نرم خو، متواضع، سادگی پسند انسان کی حیثیت سے ان کی تعریف کی جائے، وہ ہر ایک رنگ وروپ میں اپنا امتیاز برقرار رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور صالحین کے ساتھ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین!

☆☆☆☆☆

آج کی سب سے بڑی قربانی

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ

آپ اپنی خواہشات سے دستبردار ہوجائیے، عادت واطوار سے اپنے کو آزاد کرائیے، خاندانی طور وطریق سے اپنا پیچھا چھڑائیے، جاہلی رسم ورواج کی مخالفت اپنا شعار بنائیے، اور اپنے ہر کام، ہر معاملہ اور ہر مسئلہ میں شریعت کو حکم بنانے پر فخر محسوس کیجیے، ملت کو اپنی ذات پر ترجیح دیجیے، ذاتی اغراض ومقاصد سے بلند ہوکر مذہبی وملی کاموں کے لیے کچھ وقت ضرور نکالیے، کسی بھی کام میں ناک کو بیچ میں نہ لائیے، برائی کا جواب اچھائی سے، قطع رحمی کا جواب صلہ رحمی سے، نفرت کا جواب محبت سے، اختلاف کا جواب اتحاد سے، حق تلفی کا جواب حق کی ادائیگی سے دیجیے، یہی آج کی سب سے بڑی قربانی ہے، اور اس وقت اس کی سب سے زیادہ کمی ہے۔

☆☆☆

ایک ہم دم و دیرینہ رفیق کی رحلت

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی☆

۱۵ رجنوری ۲۰۲۵ء کی شام عشاء کے وقت بھائی رضوان احمد رفیقی فلاحی اسسٹنٹ سکریٹری جماعت اسلامی ہند نے جعفر بھائی کے ایکسیڈنٹ کی خبر دیتے ہوئے تصدیق چاہی، میں نے موبائل اٹھا کر واٹس ایپ کھولا تو بہت سے پیغامات موجود تھے جن میں حادثہ کی خبر اور اس کی تفصیلات موجود تھیں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں میرا داخلہ پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے بعد ۱۹۷۵ء میں اس وقت کے عربی سوم میں ہوا، جعفر بھائی بھی اسی سال ندوہ آئے اور اسی درجہ میں ان کا داخلہ ہوا، اس سے قبل وہ حفظ اور ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کر چکے تھے، وہ شہر سے آتے تھے اور تعلیم سے فارغ ہو کر گھر چلے جاتے تھے، اس لیے ندوہ کیمپس میں انہیں زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملتا تھا، لیکن ان کے ایک شوق نے انہیں ندوہ کیمپس سے باندھ رکھا تھا، انہیں کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا، وہ بہت اچھے کھلاڑی تھے، اس لیے ندوہ میں ہونے والے میچوں میں وہ کسی نہ کسی ٹیم کا ضرور حصہ بنتے تھے، ہم لوگوں نے ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی، خوش قسمتی سے ہماری کلاس ممتاز طلبہ پر مشتمل تھی اور سب ہی ساتھی اپنی امتیازی صلاحیتوں کی وجہ سے اساتذہ ندوہ کو محبوب تھے، میرے اور جعفر بھائی کے درمیان ایک قدر مشترک تھی: خاموش مزاجی اور کم آمیزی لیکن اس کے باوجود معلوم نہیں کیسے ہمارے درمیان بہت قربت اور دوستانہ ہو گیا تھا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد گرامی مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی ہمارے استاد تھے، وہ پندرہ روزہ عربی جریدہ الرائد کے ایڈیٹر بھی تھے، کلاس کے علاوہ ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، وہ اردو اخبارات سے اہم خبریں نشان زد کر کے ہم سے عربی میں ترجمہ کرواتے پھر ہمارے ترجموں کو قابل اشاعت بنا کر الرائد میں چھاپ دیتے، اس طرز تربیت سے بہت حوصلہ ملا اور یہی چیز بعد میں پورے اعتماد کے ساتھ لکھنے کی بنیاد بنی۔

ندوہ سے فراغت کے بعد میں علی گڑھ چلا گیا، جعفر بھائی نے لکھنؤ یونی ورسٹی سے عربی میں ایم اے اور جامعۃ الملک سعود ریاض سے ٹیچرز ٹریننگ کورس کیا۔ وہ لکھنؤ ہی میں واقع ندوۃ العلماء لکھنؤ کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں استاد ہو گئے جہاں سے ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے وظیفہ یاب ہوئے تھے، ان کا اصل موضوع تفسیر، حدیث اور فکر اسلامی تھا، انھوں نے ان موضوعات پر بہت سے ادبی و فکری مقالات لکھے ہیں، کئی کتابوں کا اردو سے عربی میں ترجمہ کیا ہے، سوشل میڈیا پر ان کے بہت سے خطابات سننے کا موقع ملا، جس سے اندازہ ہوا کہ دعوتی و اصلاحی موضوعات پر ان کی گفتگو بہت مؤثر ہوتی تھی، اپنے والد ماجد کی وفات (۲۰۱۹ء) کے بعد انھیں 'الرائد' کا مدیر بنا دیا گیا تھا، کچھ عرصہ سے ندوہ میں فکر اسلامی کے موضوع پر کلاس لینے لگے تھے، مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کے ناظم ندوہ منتخب ہونے کے بعد ان کی ناظر عام کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی تھی۔

ندوہ سے جدا ہونے کے بعد سے اب تک ہمارے تعلقات کی گرم جوشی میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی، وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی تو ہم کچھ دیر بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کر لیتے، کبھی فون پر بات ہو جاتی، واٹس ایپ پر بھی رابطہ رہتا، ایک بار ملاقات کے لیے ان کے گھر پہنچا تو انھوں نے کھانا کھلائے بغیر واپس نہیں ہونے دیا، ایک بار ملاقات ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تو میں نے فون کیا: ''آپ سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے، لکھنؤ اسٹیشن پر ہوں، دہلی جا رہا ہوں، ٹرین اتنے بجے چھوٹے گی، فرصت ہو تو آ جائیے۔'' انھوں نے جواب دیا: ''آتا ہوں۔'' ٹرین دیر رات چھوٹتی تھی، چند منٹ کی ملاقات کے لیے کسی کو بڑی زحمت میں مبتلا کرنا اور ریلوے اسٹیشن بلانا، اب سوچتا ہوں کہ میں نے کتنی بڑی بے وقوفی اور جسارت کر لی تھی لیکن جعفر بھائی تشریف لائے، ٹرین چھوٹنے تک رکے رہے، چائے پی گئی اور باتیں ہوتی رہیں، ان دنوں میں تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند کا سکریٹری تھا، میں نے ان سے خواہش کی کہ کچھ کتابوں کا اجرت پر اردو سے عربی میں ترجمہ کروانا چاہتا ہوں، آپ خود ترجمہ کر دیجیے یا کسی سے کروا دیجیے لیکن اسے قابل اشاعت بنانا آپ کی ذمے داری ہوگی، وہ تیار ہو گئے لیکن آئندہ عملاً اس کی کوئی صورت نہیں بن سکی۔

میرے بہت سے کام جعفر بھائی کی وساطت سے بہت آسانی سے ہو جاتے تھے۔ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، چند برس قبل جماعت اسلامی ہند کی

☆سکریٹری جماعت اسلامی ہند

طرف سے کل ہند سطح پر اصلاح معاشرہ مہم طے کی گئی، ذمے داروں کے کہنے پر اس کا تعارفی کتابچہ میں نے اردو میں تیار کیا جس کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کروالیا گیا اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لیے حلقوں کو بھیج دیا گیا، مہم کمیٹی نے تجویز دی کہ اگر اس پر مقدمہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ہیں' لکھوالیا جائے تو بہت اچھا رہے گا، مولانا کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے ان سے اس خواہش کا اظہار کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بہرحال میں نے ایک خط مولانا کے نام ڈاک سے بھیج دیا، لیکن ساتھ ہی جعفر بھائی کو فون کیا کہ میرا یہ کام کروادیں، انھوں نے وعدہ کیا اور چند دنوں میں مقدمہ لکھوا کر بھیج دیا۔

گزشتہ دو برس سے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس تحقیقات شرعیہ کی جانب سے فقہی موضوعات پر سمینار ہونے لگے ہیں، اس طرح ندوہ میں حاضری کا بہانہ مل گیا ہے، ۲۰۲۳ء کے سمینار میں شرکت کے لیے حاضری کا پروگرام بنا تو جعفر بھائی کو میسیج کیا، لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوسکی، بعد میں میں نے شکایت کی تو انھوں نے معذرت کی کہ اہلیہ کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ندوہ نہیں آپایا تھا، گزشتہ برس (۲۰۲۴ء) کے سمینار میں پھر حاضری ہوئی تو میں نے انہیں پہلے سے اطلاع کردی، اس طرح ان سے ملاقات یقینی ہوگئی، ندوہ کے مہمان خانے میں بیٹھ کر دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے کہا کہ جمعیۃ الاصلاح کے ذمے داروں نے میرا ایک پروگرام طے کرلیا ہے، کہنے لگے: آپ جب بھی ندوہ آئیں، ہم آپ کے لیکچر کروائیں گے، طلبہ کو آپ جیسے لوگوں سے استفادہ کا موقع ملنا چاہیے۔

۱۶/دسمبر ۲۰۲۴ء کو امیر جماعت اسلامی ہند جناب سید سعادت اللہ حسینی کا ندوے کا دورہ طے پایا، مجھے ان کی رفاقت کرنی تھی، جماعت کے ریاستی ذمے داروں نے ندوہ جاکر ذمے داروں سے ملاقات کرکے دورہ کی تفصیلات طے کرلیں لیکن میں نے جعفر بھائی کو براہ راست فون کیا کہ میں امیر جماعت کے ساتھ ندوہ آرہا ہوں، انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا، ندوہ میں عصر کے بعد حاضر ہونا تھا، ہمیں پہنچنے میں دیر ہونے لگی تو انھوں نے مجھے فون کرکے دریافت کیا کہ کب تک پہنچ رہے ہیں؟ ہم مغرب سے قبل پہنچے تو انہیں اور دیگر اساتذۂ ندوہ کو مہمان خانے میں سراپا انتظار پایا۔ امیر جماعت کی مختصر گفتگو کے بعد تبادلہ خیال ہوا، مغرب کی نماز کے بعد پھر بیٹھے اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، پُر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا، ناظم ندوہ مولانا بلال حسنی کہیں سفر پر تھے، جعفر بھائی نے ان کی نیابت کی، انھوں نے مجھے اپنے قریب بٹھایا اور محبت کی بارش کرتے رہے، اس کے بعد ہم لوگوں نے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اور کتب خانہ شبلی کی زیارت کی، بہت سے اساتذہ اور طلبہ ساتھ تھے، مجلس کی اہم مطبوعات کا ایک سیٹ امیر جماعت کو تحفۂ پیش کیا گیا، کتب خانہ کی وسعت، مخطوطات کی حفاظت اور اختصاصی شعبوں کے طلبہ کے انہماکِ مطالعہ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

بھائی جعفر بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، ان کی ہمہ جہت صلاحیتیں اپنی جگہ لیکن ان کی نجابت وشرافت ان سب پر مستزاد تھی۔ ان کی اچانک وفات ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے تو خسارہ ہے ہی لیکن میں اپنے ایک قریبی دوست اور ساتھی سے محروم ہوگیا ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا کام پورا کرکے اس کا صلہ پانے کے لیے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوجانا ہے۔

☆☆☆☆☆

ملی مفاد سب سے مقدم

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ

اس وقت کمی نہ علم کی ہے، نہ عقل کی، نہ ہمت کی، نہ شجاعت کی، نہ تسبیحات کی، نہ تعمیرات کی، نہ تحریکوں کی، نہ تنظیموں کی، نہ مدرسوں کی، نہ خانقاہوں کی، نہ کالجوں کی، نہ یونیورسٹیوں کی، نہ ڈگریوں کی، نہ تجربات کی کمی ہے تو صرف اعتدال کی، توازن کی، بھروسہ کی، ہوشمندی کی، معاملہ فہمی کی، قوت برداشت کی، باہمی اعتماد کی، چہروں پر یقین کے نور اور آنکھوں میں سرورِ عشق کی اور سب سے بڑھ کے حسد، کینہ، بغض اور نفاق سے پاک دل کی۔

ضرورت ہے اس کمی کو دور کرنے اور ان عیوب سے اپنا پیچھا چھڑانے کی ورنہ خود رائی، خود پسندی، نفس پرستی، گروہ بندی اور جاہ طلبی کے روگ کے ساتھ ترقی اور کامیابی کے خواب دیکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں، مال کی قربانی، جان کی قربانی اور وقت کی قربانی اسی وقت رنگ لائے گی اور اس کے بہتر نتائج اس وقت سامنے آئیں گے جب ہم اپنی ان خامیوں کو دور کرکے اپنی ان کمزوریوں پر قابو پائیں گے، اور اپنی ذات کو ملی مفاد کی راہ میں کبھی حائل نہ ہونے دیں گے۔

☆☆☆

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مولانا اقبال احمد ندوی☆

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) سابق ناظرِ عام ندوۃ العلماء لکھنؤ میرے ہم عصر اور مجھ سے چار سال سینئر تھے اور پھر ندوۃ العلماء کا ناظر عام بننے کے بعد تو ویری ویری موسٹ سینئر ہو گئے تھے۔ طالب علمی کے دوران مولانا چونکہ خاتون منزل اپنے گھر سے ندوہ آتے تھے اور چھٹی کے بعد واپس چلے جاتے تھے اس لیے مجھ جیسے بہت سارے طلبہ کی شناسائی مولانا سے بہت محدود تھی۔ کبھی راستہ چلتے مل گیے تو دعا سلام ہو گیا۔ کبھی مہمان خانے میں حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید صاحب حسنی ندوی (رحمہما اللہ تعالیٰ) کی خدمت میں حاضری کے وقت ملاقات ہو گئی تو مصافحہ کی سعادت بھی مل جاتی۔ رمضان شریف میں عموماً تکیہ رائے بریلی میں بھی ملاقات ہوتی اور مولانا کے پیچھے تراویح پڑھنے کا بھی موقع ملتا؛ لیکن گفتگو کی نوبت کم ہی آتی کیونکہ مولانا بھی خاموش طبع اور کم آمیز انسان تھے اور اتفاق سے میرا مزاج بھی کچھ ایسا ہی واقع ہوا ہے؛ لیکن بہر حال مولانا ایک انتہائی پاک طینت و نیک سرشت انسان تھے۔ بیحد شریف اور متواضع و با اخلاق تھے۔ شرافت اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی بلکہ چمنستانِ شرافت کے گلِ سر سبد تھے۔ چونکہ مولانا کا خانوادہ از اول تا آخر ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کی مثال ہے اور انھوں نے اپنے خانوادے کے اکابر سے پورا پورا کسبِ فیض کیا تھا اس لیے اُن میں وہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے جو اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اس کی شہادت ہر وہ شخص دیگا جسے ایک مرتبہ بھی مولانا سے ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا ہوگا۔

جب مولانا ندوۃ العلماء کے ناظر عام بنے تو اُن سے مختلف معاملات میں ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا۔ کہتے ہیں کہ انسان کوئی بڑا عہدہ پا کر اپنی اوقات بھول جاتا ہے اور عُجب و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے؛ لیکن مولانا متواضع تو تھے ہی، ناظر عام کے منصب پر فائز ہونے کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ متواضع ہو گئے حتی کہ اُن کے خورد اور ساتھی بھی اگر ملنے جاتے تو ان سے کھڑے ہو کر مصافحہ کرتے اور ایسے اخلاق سے پیش آتے کہ سامنے والے کو شرمندگی ہونے لگتی اور کہنا پڑتا کہ مولانا! اب آپ کا مقام دوسرا ہے، اس طرح ہر آئندو روند کے آنے پر کھڑا ہو جانا آپ کے لیے مناسب نہیں ہے، مولانا مسکرا کر خاموش ہو جاتے اور وہی عمل جاری رہتا۔ انتقال سے چار روز قبل ندوہ کے چند اساتذہ اور باہر کے کچھ لوگ مولانا سے ملنے کے لیے گیے تھے، اس وقت بھی مولانا نے کھڑے ہو کر ہی فرداً فرداً ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ ایسے اخلاق والا انسان معمولی انسان نہیں ہوتا اور جب دنیا سے چلا جاتا ہے تو دوست تو دوست، دشمن کی آنکھیں بھی اشک بار ہو جاتی ہیں اور اس کے جانے کا غم ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اپنا کوئی عزیز قریب اور خاندان کا فرد رخصت ہوا ہو اور اس کی یادوں اور باتوں کو بھلانے میں زمانے لگ جاتے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظرِ عام ندوۃ العلماء کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (موجودہ ناظمِ ندوۃ العلماء) دامت برکاتہم کو ان کا جانشیں مقرر کیا گیا اور چند مہینے بعد ہی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کی جگہ پر حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب کو ناظم ندوۃ العلماء کے عہدے پر فائز کیا گیا اور ان کی جگہ حضرت مولانا سید محمد جعفر مسعود صاحب حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کو ناظرِ عام مقرر کیا گیا اور ماشاء اللہ دونوں بھائیوں نے مل کر ایک دوسرے کے مشورے اور اساتذہ وطلبہ کے تعاون سے ندوۃ العلماء کو تعلیمی، تربیتی، دینی اور تعمیراتی اعتبار سے شاہراہِ عروج و ترقی پر گامزن کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور امید تھی کہ ان شاء اللہ دونوں بھائیوں کی یہ جوڑی ندوۃ العلماء کو بہت اونچے مقام پر لے جائے گی لیکن موت کا فرشتہ اچانک آیا اور مولانا کو اپنے ساتھ لیتا چلا گیا اور دوست و احباب اور اعزہ و اقارب منہ تکتے اور ہاتھ ملتے رہ گیے اور کچھ کر نہیں پائے۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کسی فرد بشر کو مفر نہیں۔ ہر ایک ذی روح کے دنیا سے جانے کا وقت بھی متعین ہے جس کی تعیین خود خالقِ جن و بشر اور مالکِ دو جہاں نے کر رکھی ہے۔ سبھی کو اپنے اپنے وقت پر ہی جانا ہے۔ اس میں کسی کے لیے بھی ایک لمحے کی تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔ اس دنیائے دنی میں جو آیا وہ گیا اور جو ہے اسے جانا ہے۔ کوئی آگے گیا کوئی پیچھے جانے والا ہے۔ نہ اِس کو دنیا میں قرار نہ اُس کو موت سے فرار۔ آنے جانے کا یہ تماشا ہم شب و روز دیکھتے ہیں لیکن عبرت نہیں پکڑتے اور سب یہی سمجھتے ہیں کہ ابھی جانے میں دیر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو شہادت کی موت عطا فرمائی اور وہ بھی اس حال میں کہ ایک وقت کی نماز بھی

☆وکیل کلیۃ اللغۃ العربیۃ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

فوت نہیں ہوئی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر نکلے اور اپنے ایک ساتھی کو اپنے پیچھے بائک پر بٹھا کر انھیں کے کام سے شہر میں کہیں جا رہے تھے کہ یہ دردناک حادثہ پیش آیا اور مولانا کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور ساتھی بھی تقریباً دو ہفتے بعد زخموں کی تاب نہ لا کر مولانا سے جا ملے: إنا لله و إنا إليه راجعون.

حضرت مولانا سید محمد جعفر مسعود صاحب حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کو نظارتِ عامہ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اگرچہ بہت کم وقت ملا لیکن جتنا بھی ملا، اُنھوں نے ندوہ کی تعمیر و ترقی میں اور تعلیمی و تربیتی اعتبار سے اسے آگے بڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مولانا ندوہ میں انتظامی امور دیکھنے کے ساتھ ساتھ کچھ گھنٹے پڑھاتے بھی تھے اور طلبہ مولانا کے اندازِ تدریس سے پورے طور پر مطمئن اور خوش تھے۔ مولانا بھی طلبہ کے حق میں بڑے شفیق اور خیر خواہ تھے۔ ان کے آرام و راحت اور سہولت بہم پہنچانے کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اساتذہ کے ساتھ بھی اُن کا رویہ انتہائی ہمدردانہ اور خیر خواہانہ تھا۔ ہر ایک کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، ان کی شکایتوں کا ازالہ کرنا اور راحت کا خیال رکھنا مولانا نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔

حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے ندوہ میں آجانے سے بہت سی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نصاب تعلیم میں بھی حالت زمانہ کے پیش نظر مناسب تبدیلی کی گئی۔ کم مفید کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے زیادہ مفید کتابیں داخل کی گئیں۔ غیر درسی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا۔ گویا ان دونوں حضرات کے آنے سے ندوہ میں بہار آگئی اور باطنی و ظاہری دونوں اعتبار سے ندوہ نے ترقی کی۔

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ہر شعبے پر پوری پوری توجہ دی۔ النادی العربی کو منظم کیا۔ جمعیۃ الاصلاح کی ثقافتی سرگرمیوں میں پوری دلچسپی سے حصہ لیا۔ جلسوں میں شریک ہوتے، صدارت فرماتے، صدارتی خطاب میں طلبہ کو انتہائی مفید و کارآمد باتیں بتاتے اور تعلیم پر دھیان دینے کی تلقین فرماتے۔ کبھی مسجد میں خطاب فرماتے اور انھیں ان کا مقصدِ تعلیم یاد دلاتے۔ درجات میں طلبہ کی حاضری پر توجہ دیتے اور صد فیصد حاضری کو یقینی بنانے کی کوشش فرماتے۔ غرض ہر پہلو سے مولانا مرحوم نے ندوۃ العلماء کے طلبہ و اساتذہ کو فائدہ پہنچانے کی سعی مشکور فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو ناظرِ عام کے عہدے کے ساتھ ساتھ پہلے رابطہ ادبِ اسلامی کا سکریٹری جنرل اور پھر صدر رابطہ ادب اسلامی کے عہدے پر بھی سرفراز فرمایا اور مولانا نے دونوں عہدوں کے دور میں رابطہ ادب اسلامی کو ترقی دینے اور فعال بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ رابطہ ادب اسلامی کے دفتر کو نئے سرے سے سیٹ کیا۔ صفائی اور پتائی کروائی، جو چیزیں زائد اور بے مصرف تھیں ان کو نکلوایا۔ نئی کرسیاں منگوائیں، غرض ہر اعتبار سے رابطہ ادب اسلامی کے دفتر کو ترقی دی۔ آپ کے زمانے میں رابطہ ادب اسلامی کے دو سالانہ سیمینار ہوئے۔ ایک بجنور، اتر پردیش میں ملت اکیڈمی کے تحت حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات کے موضوع پر اور دوسرا ابھی گزشتہ نومبر ۲۰۲۴ میں جامعۃ الہدایہ جےپور میں حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات پر ہوا۔ پہلے میں مولانا مرحوم نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے رپورٹ پیش کی ور دوسرے سیمنار میں بحیثیت صدر رابطہ کے اپنا خطبہ پیش کیا اور دونوں میں نہایت مؤثر انداز سے ادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت اجاگر کی اور رابطہ ادب اسلامی کی سرگرمیوں اور کاموں کا بہترین انداز میں تعارف کرایا۔

مولانا عربی و اردو کے حقیقی معنی میں ادیب تھے۔ دونوں میں چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے جملے، کوثر و تسنیم میں دھلے الفاظ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز عبارت اور مضمون مولانا مرحوم کے ادب کی نمایاں پہچان تھی۔ ان کی متعدد کتابیں بھی دونوں زبانوں میں موجود ہیں جو مولانا کے حسنِ اسلوب کی شاہد عدل ہیں۔ مولانا صحیفۃ "الرائد" کے رئیس التحریر بھی تھے، ان کے اداریوں کا مجموعہ ابھی جلد ہی ان کے انتقال کے دو ہفتے بعد " خواطر " کے نام سے منظر عام پر آیا۔ انھوں نے کئی کتابوں کا اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا جو ان کے ترجمہ نگاری پر مکمل دسترس اور مقدرت کی گواہ ہیں۔

مولانا مرحوم خطابت کے بھی شہسوار ثابت ہوئے۔ خاص طور سے ندوۃ العلماء کی انجمن الاصلاح کی صدارت فرماتے ہوئے یا مسجد میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے یا دیگر مدارس کے جلسوں میں مولانا کی تقریریں جن لوگوں نے سنی ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ مولانا کا اندازِ تکلم بیحد مؤثر اور شاندار ہوتا تھا۔ عوامی جلسوں میں بھی مولانا بہترین خطاب فرماتے تھے۔ دعوتی دورے بھی کرتے اور ہر جگہ دین کی باتیں پہنچانے کی کوشش فرماتے۔ نیز ابنائے ندوہ سے خطاب کرتے ہوئے انھیں ان کا مقصد یاد دلاتے اور ندوہ کا دیگر لوگوں میں تعارف کراتے۔ غرض مولانا نے دین کو اور ندوۃ العلماء کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ ہر وقت اسی فکر میں گھلتے رہتے کہ لوگوں کو دین کے راستے پر گامزن کریں اور خاص طور سے ندوۃ العلماء کے طلبہ میں دینی، تعلیمی، تربیتی اور اخلاقی روح پھونک دیں اور وہ یہاں جو مقصد لیکر

آئے ہیں، اس میں انھیں پوری پوری کامیابی ملے۔

"کل نفس ذائقة الموت" ایک بدیہی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ لوگوں کو رات دن ہوتا رہتا ہے۔ دنیا سے جانا ہر ایک کو ہے اور ضرور جانا ہے اور اپنے وقت پر ہی جانا ہے۔

پھر بھی کچھ لوگوں کی موت ایسی اچانک واقع ہوجاتی ہے کہ کچھ دیر تک تو اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مولانا مرحوم کی موت بھی ایسی ہی واقع ہوئی۔ کسی کے سان وگمان میں نہیں تھا کہ مغرب کی نماز پڑھکر گھر سے شہر جانے کے لیے نکلیں گے اور اچانک یہ حادثۂ جانکاہ پیش آجائے گا اور مولانا دنیا کو خیرباد کہہ کر سفر آخرت پر روانہ ہوجائیں گے اور لوگ کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے۔ اس معاملے میں پیر وفقیر، عالم وعامی اور جاہل وذکی سب بے بس ہیں۔ اس میں نہ کسی کی چلی ہے، نہ چلے گی، حکم تو بس اللہ جل وعلا کا ہی چلا ہے، چلتا ہے، اور آگے بھی چلے گا: "یحي و یمیت" کی صفت اسی کو زیبا ہے۔ اس نے خود فرمایا ہے: "إن الحكم إلا لله" اور "ألا له الخلق و الأمر" یعنی پیدا بھی اللہ ہی نے کیا ہے اور حکم بھی اُسی کا جاری و ساری ہے اور اُسی کے حکم سے سب کو یہاں سے جانا بھی ہے۔ غرض انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

جانے والے جا۔ عزت واکرام کے ساتھ جا۔ فرشتوں کے جلو میں جا۔ شہداء وصدیقین کے جھرمٹ میں جا۔ ان کے زمرے میں شامل ہوجا۔ فرشتوں کا یہ مژدہ سنتا جا: "نم كنومة العروس" اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی یہ خوشخبری بھی لیتا جا: "يا أيتها النفس المطمئنة ارجعي إلى ربك راضية مرضية، فادخلي في عبادي و ادخلي جنتي"۔

☆☆☆☆☆

جعفر مسعود حسنی - خوش خلق، درافشاں

خورشید انور ندوی☆

پچھلے کچھ دنوں سے نکبتوں کے سائے گہرے اور گہرے ہوتے گئے۔ ایک پر ایک ستم پیشہ موت کے وار ہوئے۔ یہ وار بکھر جاتے تو کچھ سامان تسلی ہوتا؛ لیکن یہ سمٹ گئے۔ سمٹے بھی ایسے کہ شہر دل نواز سارے کا سارا اجاڑ گئے۔ وہ سارے نگینے جو گلوئے وفا کو جگ مگ کرتے تھے چند سفاک ساعتوں میں جھڑ گئے۔ اک ہوائے جاں سوز چلی اور نخل تمنا خاکستر ہوگیا۔ پہلے چمن کے مالی گئے پھر اچانک عندلیبان خوش نوا چپ ہوگئے۔ چمن اجڑا سو اجڑا، اس جاں شکن ویرانی کا درد بھرا سوز الا پنے والے بھی بے آواز ہوگئے۔ کیسی بے کسی اور کیسی محرومی ہے کہ دیکھتے دیکھتے سب کچھ چلا گیا۔ بس اہل شکیب سے ایک شکیبائی نہ گئی کہ ہم صبر پر مامور ہیں اور یہی شیوۂ اہلِ وفا ہے، اللّٰھم اشھد فانا صابرون۔

برادر عزیز جعفر حسنی مرحوم ایک نیک سیرت، بے آمیز، اصیل الفطرت، متحمل مزاج آدمی تھے۔ وہ میرے ہم عصر اور بس ایک سال جونئیر تھے۔ انسان کے سارے جوہر ایک دم کم ہی کھلتے ہیں یا کم لوگوں پر کھلتے ہیں۔ وہ سادہ طبیعت تھے۔ بہترین اسپورٹس مین تھے۔ کدورت پالنے سے کوسوں دور رہتے۔ آزردہ تو کوئی بھی کسی سے ہوسکتا ہے؛ لیکن شفاف پہلو اور جھلکتا سینہ سب کا نصیب نہیں ہوتا۔ ساری زندگی ایک ناشائستہ لفظ ان کی زبان سے ان لوگوں کے بارے میں بھی نہیں سنا جنھوں نے ان کے بڑوں کو بھی نہیں بخشا۔ اس زمانے میں اتنا ظرف ایک معجزہ ہی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کچھ کشیدہ ماحول کے بارے میں میری ان سے گفتگو ہوئی تو میں نے اپنی کچھ ایسی رائے رکھی جس سے ان کو اتفاق نہیں تھا لیکن کمال ہے کہ انھوں نے کسی کبیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ ان کی بے مثال تربیت کا ثمرہ تھا۔ ان کے بزرگوں کے سائے میں لوگ بیٹھ جاتے تو انسانی کمالات کسب کرلیتے، وہ تو بذات خود ان کا سایہ تھے۔ برادر مرحوم ایک اچھے مدرس، بہترین انشا پرداز رہے۔ "الرائد" میں ان کی تحریریں نکھرتی چلی گئیں اور مسلسل لکھاوٹ نے ان کو ایک پرمانٹ لکھاری بنادیا تھا۔ انتظامی سطح پر ان کی صلاحیتوں کو جلا ملتی تھی کہ وقت موعود آپہونچا۔ ہر طرح کی صلاحیت کی بنیاد اخلاص ہے جس کی کمی ان میں نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اتنی ہی مہلت عمر رکھی تھی، اب اس کا شکوہ کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرمائے اور اپنی شان کریمی کے شایان ان سے معاملہ فرمائے۔

☆☆☆☆☆

☆حیدرآباد (دکن)

ہائے رے چشمِ تصور تو نے کیا دکھلادیا

مفتی راشد حسین ندوی☆

راقم نے عشاء کی نماز کے لیے وضو کرلیا تھا اور مسجد جانے کی تیاری میں لگا ہوا تھا کہ اچانک مدرسہ کے استاذ مولانا سہیل صاحب ندوی نہایت گھبرائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ نے کچھ سنا؟ مولانا جعفر صاحب کا ایکسیڈینٹ میں انتقال ہوگیا ہے؟ یہ خبر بجلی کی طرح حواس پر غالب ہوئی، ایک ایسا حادثہ پیش آچکا تھا جس کے بارے میں خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتا تھا، لیکن "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" فإنا للّٰه وإنا إليه راجعون!

معلوم ہوا کہ مولانا یہیں رائے بریلی ہی میں آئے ہوئے تھے اور حادثہ شہر ہی میں پیش آیا ہے، مولانا سہیل صاحب کو اس وقت تک زیادہ تفصیلات بھی معلوم نہیں تھیں، کچھ دیر کے بعد تفصیلات معلوم ہوئیں جو اخبارات وغیرہ میں بھی آچکی ہیں۔

جعفر بھائی کو سب سے پہلے میں نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں درجاتِ علیا میں زیرِ تعلیم تھے، ان کی پہلی تصویر جو نگاہوں میں آتی ہے اس میں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دفتر امتحان کے سامنے بورڈ پر آویزاں ششماہی امتحان کا رزلٹ دیکھنے میں مصروف تھے، راقم اس وقت ابتدائی درجات کا طالب علم تھا اور اونچے درجات کے طلباء کو رشک کی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا، مولانا جعفر صاحب کے درجہ میں اس وقت جو حضرات زیرِ تعلیم تھے ان کی شہرت ندوہ میں نہایت مثالی طلباء کی تھی، جو زمانہ طالبِ علمی میں بھی علمی پختگی اور کثرتِ مطالعہ میں ممتاز تھے اور اساتذۂ کرام کی شفقتیں اور عنایتیں ان کو حاصل تھیں اور فراغت کے بعد بھی انہوں نے اپنے اپنے میدانوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور آج بھی ایک عالم ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، ان میں مشہور محقق ڈاکٹر محمد اکرم ندوی اور مولانا رضی الاسلام ندوی بھی تھے، ان حضرات کے ایک رفیق درس مولانا حشمت اللہ ندوی کچھ دنوں تک ندوہ کے استاد بھی رہے اور مجھے بھی ان سے شرفِ تلمذ حاصل رہا، ہمارے تمام ساتھی مولانا حشمت اللہ کی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے، افسوس کہ قطر میں ایک ایکسیڈینٹ میں وہ بھی کافی عرصہ پہلے جاں بحق ہوچکے ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ!

مولانا جعفر صاحب کی صلاحیتوں میں نکھار ندوہ سے ان کی فراغت کے بعد آیا، ان کے والد حضرت مولانا واضح رشید ندوی رحمہ اللہ کو اللہ نے ایک خاص صلاحیت عطا فرمائی تھی، وہ طلباء کی ہمت افزائی کر کے خاص انداز میں طلباء کے اندر عربی اردو لکھنے کی صلاحیت پیدا کردیتے تھے، آج کتنے ایسے عربی لکھنے والے ندوی ہوں گے جن کے اندر عربی لکھنے کا سلیقہ مولانا مرحوم کے مرہونِ منت ہے، چنانچہ جب مولانا جعفر صاحب فارغ ہوئے تو مولانا واضح صاحب رحمہ اللہ اپنے اکلوتے فرزند کی طرف متوجہ ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان میں کیا جادو کیا کہ وہ نہ صرف با کمال انشاء پرداز بلکہ صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوگئے اور اب تو وہ ندوہ سے نکلنے والے پندرہ روزہ جریدے "الرائد" کے ایڈیٹر ہوگئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے قلم سے کئی کتابوں کے ترجمے آئے اور ان کے مضامین کے مجموعوں نے دلوں کے تاروں کو چھیڑا اور لوگوں نے ان میں ایک بڑے مصنف کی جھلک دیکھی۔

وہ تقریریں بالکل نہیں کرتے تھے، لیکن ناظر عام بننے کے بعد مختلف پروگراموں میں ان کی شرکت جب ناگزیر ہوئی تو مجبوراً ان کو صنفِ خطابت میں بھی حصہ لینا پڑا اور تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا، سب متفق ہیں کہ وہ مختصر ترین وقت میں نہایت مرتب انداز میں جو کچھ فرماتے تھے، اس میں سب مغز ہی مغز ہوتا تھا اور ان کی تقریر حشو وزوائد سے بالکل پاک ہوتی تھی۔

جعفر بھائی کی ایک خوبی جو طبقہ علماء سے ان کو ممتاز کرتی ہے وہ ان کی تواضع وانکساری اور سادگی تھی، وہ معمولی لوگوں سے بھی بہت عزت واحترام سے پیش آتے تھے، چھوٹوں سے بھی اس طرح ملتے تھے جیسے وہ ان کا بڑا اور بزرگ ہو، شاید اسی خوبی نے ان کو اتنا بڑا بنادیا تھا، اس لیے کہ حدیث شریف میں وعدہ ہے کہ جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے اللہ اس کو سربلندی عطا فرماتا ہے:

"من تواضع للّٰه رفعه اللّٰه عزو جل."

جعفر بھائی کا حادثہ وفات صرف ان کے گھر اور خاندان والوں کا ہی نہیں، پوری ملت کا خسارہ ہے، خاص طور سے ندوۃ العلماء کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے، اس لیے کہ مولانا نے انتظامی اعتبار سے ندوۃ العلماء کو سنبھال لیا تھا اور مولانا بلال صاحب کو عمومی انتظامات سے فارغ کردیا تھا، اللہ تعالیٰ ندوۃ العلماء کو نعم البدل عطا فرمائے اور پوری ملت، پورے خاندان خاص طور سے مولانا بلال صاحب اور افرادِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مولانا مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

☆مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

علم و دانش کی متاعِ بیش بہا

مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی☆

مشیتِ الٰہی

ایمان اور موت کا معاملہ بڑا عجیب ہے، دونوں کو اللہ نے اپنی مشیت کے ساتھ جوڑا ہے، بلکہ دونوں کے لیے قرآن کریم میں ایک انداز سے بات کہی گئی ہے، موت کے بارے میں کہا گیا:

"وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ" (کوئی جان اللہ کی مشیت کے بغیر مر نہیں سکتی)۔

یہی بات ایمان کے تعلق سے بھی کہی گئی ہے:

"وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ" (کوئی جان اللہ کی مشیت کے بغیر ایمان نہیں لاسکتی)

تقدیر الٰہی کے یہ فیصلے درحقیقت اللہ کی قدرت اور حکمت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے حد درجہ اطمینان بھی فراہم کرتے ہیں تاکہ اسے یہ بے چینی نہ رہے کہ ہماری فلاں کوشش سے یہ معاملہ ٹل سکتا تھا۔ یہ اللہ کا ابدی قانون ہے:

"لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ" (تاکہ جو چیز تم سے چھوٹ جائے اس پر غم نہ کرو اور جو وہ تمہیں دیدے اس پر اتراؤ نہیں)

"مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۔لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ" (تمہیں زمین میں یا خود تمہاری اپنی جانوں میں جو مصیبت پیش آتی ہے وہ تمہاری جانوں کے پیدا کرنے سے پہلے ہی ایک کتاب میں درج رہتی ہے، یہ اللہ پر بہت آسان ہے، تاکہ تمہیں اپنی کسی چیز کے چھوٹ جانے پر افسوس نہ ہو اور نہ اللہ کی طرف سے کسی چیز کے ملنے پر تم اترانے لگو)۔

شب و روز اس قانون کا مشاہدہ ہوتا ہے، پسر نوح، پدر ابراہیم اور عم رسول کو لاکھ کوششوں کے باوجود دولت ایمان نصیب نہ ہوسکی، جب کہ ساحران فرعون نے جن کی پوری زندگی جادو جیسے غلیظ کام میں بسر ہوئی تھی، جب حضرت موسیٰ کا بے مثال معجزہ دیکھا تو ایمان کا جادو سر چڑھ کر بولا اور وہ "آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ، رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ" کی سعادت سرمدی کے ذریعہ اپنی مراد کو پہنچے۔

خطاب کے بیٹے عمر رسول اکرمؐ کو قتل کرنے کے لیے نکلے یعنی اپنے لیے بدترین جہنم کی خواہش لے کر نکلے، واپس ہوئے تو جنت کے اعلیٰ ترین مقامات کے مستحق بن چکے تھے، یہی عجیب معاملہ موت کا بھی ہے۔ بعض قریب المرگ دہائیوں تک بستر مرگ پر پڑے رہتے ہیں لیکن موت پھر بھی نہیں آتی اور بعض صحت مند، ہنستے مسکراتے، خوش و خرم افراد ایک دم سے رخصت ہوجاتے ہیں، معلوم ہوا چھینک آئی اور جان نکل گئی، سر چکرایا اور موت کی آغوش میں پہنچ گئے، یہ سب قدرت کی نیرنگیاں ہیں:

"كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" (ہر دن اس کی ایک عجیب شان ہوتی ہے۔)

کون جانتا تھا کہ ہم سب کے عزیز بلکہ ہر دل کے عزیز مولانا جعفر مسعود صاحب حسنی اس طرح اچانک رخصت ہوجائیں گے، گاڑی نے ٹکر ماری جو بظاہر اتنی شدید بھی نہیں تھی جسم پر چوٹ کا کوئی نشان بھی نہیں تھا، لیکن وقت موعود آن پہنچا تھا، نفس مطمئنة نے "ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً" کی صدائے دل نواز کو سن لیا تھا، بس عشق کی ایک جست نے قصہ تمام کردیا اور جعفر مسعود رب کے حضور پہنچ گئے، ایک چراغ جو جل رہا تھا اور خوب روشنی بکھیر رہا تھا دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

"أرى الموت يعتام الكرام ويصطفي عقيلة المال الفاحش المتشدد." (موت کا حال کیا بتاؤں؟ وہ تو اچھے لوگوں ہی کو لے اڑتی ہے اور زندہ مال کی چاہت رکھنے والے کا وہی مال اچک لیتی جو سب سے زیادہ پسند ہوتا ہے)۔

شخصیت سازی

دنیا کا عظیم کام آدم گری و مردم سازی کا ہے، شخصیت کی تعمیر سے بڑھ کر بظاہر کوئی مشکل کام نہیں، خداوند قدوس کی سنت یہ ہے کہ وہ براہِ راست ایسے افراد تیار کرتا ہے جن سے کل انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ حضرات انبیاء و رسل ہوتے ہیں جو براہِ راست خداوند قدوس کی تربیت کا شاہ کار ہوتے ہیں۔ قرآن کریم اس پر شاہد ہے:

"اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ" (اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں رکھنا ہے)

"وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ" (ہم نے ان کو پیشوا بنایا، وہ ہمارے حکم سے ہدایت کا کام کرتے تھے اور ہم نے ان کو طرف وحی کی کہ وہ اچھے کام کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، وہ ہمارے عبادت گزار رہے)۔

"وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا" (اے محمدؐ!) اللہ نے آپ پر کتاب وحکمت

☆استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اتاری اور آپ کو وہ سب سکھایا جو آپ جانتے نہیں تھے، واقعی آپ پر اللہ کا غیر معمولی فضل ہے۔)

"أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ" (یہ انبیاء وہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت سے سرفراز کیا، آپ بھی ان ہی کی ہدات کی پیروی کریں)۔

پھر یہی انبیاء ورسل (صلوات اللہ وسلامہ علیہم) انسانیت کے چمن میں بہار لاتے ہیں اور ان سے ایسے افراد وجود میں آتے ہیں جو بسا اوقات کل عالم کے لیے باعث ناز ہوتے ہیں اور شخصیت سازی کا ایک تسلسل عمل میں آتا ہے۔

مولانا جعفر مسعود حسنی رحمۃ اللہ علیہ اس معاملہ میں بڑے خوش نصیب رہے کہ آپ کو وہ مبارک گھرانہ ملا جہاں ایک سے ایک شخصیت ساز ہستیاں موجود تھیں، جنہوں نے آپ کی شخصیت کو نکھارا، لیکن اس باب میں فضل خداوندی کے بعد جو چیز سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے وہ ہے اپنی شخصیت کی تعمیر خود کرنا، جب تک کسی میں یہ جوہر موجود نہ ہو لاکھ کوششوں کے باوجود اس میں یہ نکھار پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ شخصیتیں کبھی ایک سطح پر نہیں رہتیں، وہ کبھی نکھرتی ہیں کبھی بکھرتی ہیں، کتنی ایسی شخصیتیں ہوئی ہیں جو بکھر گئیں اور کسی مصرف کی نہیں رہیں، اس کی بڑی وجہ بسا اوقات تکبر کے وہ علم سوز جراثیم ہوتے ہیں جو صلاحیتوں کو گھن کی طرح چاٹ جاتے ہیں اور بنی بنائی شخصیت کی مٹی پلید کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض شخصیات میں نکھار آتا ہے اور وہ روز بروز نکھرتی چلی جاتی ہیں، ان کی ذہنی، فکری اور علمی و اخلاقی صلاحیتیں ترقی کی راہ پر گامزن رہتی ہیں، بالآخر "نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ" کی جھلکیاں ان کی زندگی میں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی ان ہی ہستیوں میں ہوتا ہے، آپ نے اپنی شخصیت کی تعمیر خود کی، اپنے جوہر کو پہچانا، اس کی قدر کی اور خداوند قدوس کے لیے وقف کر دیا۔

جہد مسلسل

آپ بڑے عظیم خاندان کے فرد تھے، لیکن کبھی خاندانی حوالہ کو آپ نے کسی بھی دینی و دنیوی ترقی کا ذریعہ نہیں بنایا، جہد مسلسل آپ کی زندگی کا جلی عنوان تھا، اسی لیے آپ زینہ بزینہ ترقی کرتے چلے گئے۔ قلب و ذہن اتنا صاف تھا کہ کبھی شہرت کی خواہش نے دل میں انگڑائی نہیں لی۔ حقیقی تواضع کے پیکر تھے، کبھی نمائشی تواضع کا اظہار نہیں کیا، کچھ لوگ کسی نہ کسی حوالہ سے اچانک مشہور ہو جاتے ہیں پھر ساری زندگی اپنی شہرت کے بوجھ کو سنبھالنے کے لیے الٹی سیدھی حرکتیں کرتے رہتے ہیں، آپ نے سچی لگن اور صاف ستھری محنت کو اپنا شعار بنایا اور لحظہ لحظہ نکھرتے چلے گئے، اردو تحریر میں آپ بتدریج ترقی کرتے چلے گئے، پھر ایک خاص مقام تک پہنچ گئے، کہا جا سکتا ہے کہ دینی حلقوں میں اتنی اچھی اردو لکھنے والے کم ہی لوگ ہوں گے، دوسری طرف آپ کی عربی تحریروں کا بھی کچھ یہی حال رہا، اس میں بھی مسلسل کامیابیوں نے آپ کے قدم چومے، ادھر کے چند سالوں میں بالخصوص اپنے عظیم والد حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ (سرزمین ہند میں عربی ادب وصحافت کے قافلہ سالار) کے بعد آپ کی تحریروں میں مسلسل نکھار آتا چلا گیا اور آپ اپنے والد مکرم کے لفظاً و معناً "خلف الرشید" بن گئے تھے۔

پھر آپ کے عظیم عم محترم برکۃ العصر وریحانۃ الہند ہم سب کے محبوب و مقتدیٰ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے سانحہ ارتحال نے تو دل کی دنیا ہی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا، اس کے بعد کی تحریریں کوئی دیکھے تو معلوم ہوتا ہے کہ خونِ جگر سے لکھی گئی ہیں، اسی طرح تقریروں میں بھی دردِ دل اور سوزِ دروں صاف نظر آنے لگا تھا۔

عجیب بات ہے کہ آپ کا انتقال اس وقت ہوا جب صلاحیتیں خوب نکھر چکی تھیں، میدان ہموار ہو چکا تھا، گویا باغ انتہائی شاداب ہو چکا تھا، ہر طرف بہار ہی بہار نظر آ رہی تھی، صلاحیت بھرپور تھی، جذبات میں تلاطم تھا، فکر اسلامی عروج پر تھی، آپ کاروان علم و ادب کے شہسوار اور فکر اسلامی کے علمبردار بننے کی راہ پر گامزن تھے اور صاف نظر آ رہا تھا کہ آئندہ آپ کے ذریعہ کارہائے نمایاں انجام پائیں گے کہ اچانک مشیتِ الٰہی نے اپنا کام دکھایا اور ایک بار پھر یہ ثابت ہوا کہ جو ہے اللہ کی ذات ہے، اس کے فیصلے اٹل اور انسان کی امیدیں نقش برآب، اس کی حکمتیں لامحدود اور انسانی ارادے نازک آبگینے، اس کے ارادے ناقابل تنسیخ اور انسانی خواہشات پانی کے بلبلے، بالآخر انسان کو وہی چاہنا پڑتا ہے جو اس کا رب چاہے، یہی حقیقی زندگی اور یہی سچی بندگی ہے۔ شاید اللہ رب العزت کا معاملہ اپنے بعض بندوں کے ساتھ یہ ہوتا ہو کہ ان کو اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب ان کی صلاحیتیں اپنے شباب پر ہوتی ہیں اور کارہائے نمایاں ان کے شدید منتظر ہوتے ہیں، ایسے حضرات کو ان کے کاموں کے ساتھ ساتھ ان کی نیتوں کا بھرپور اجر مرحمت کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی ان ہی ہستیوں میں ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز!

علم کی تازگی اور فکر کی دل کشی

آپ علم میں جمود کے قائل نہ تھے، آپ کی زندگی میں جو بات انتہائی نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے "حیویت" آپ ہر چیز کو زندہ اور تابندہ دیکھنا چاہتے تھے، آپ کی ہر تقریر اور تحریر میں ایک اچھوتا پن بلکہ ایک خاص بانکپن نظر آتا ہے، میں نے کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کی تنقید میں بھی ایک خاص مٹھاس نظر

آتی ہو، طبعاً حق گو تھے، برملا بات کہتے، کسی بات کو دل میں رکھ کر گھٹ گھٹ کر جینا آپ کو پسند نہ تھا، جو لوگ صاف دل ہوتے ہیں وہ کبھی لومۃ لائم کی پرواہ بھی نہیں کرتے، کم بولتے لیکن جو بولتے صحیح بولتے، تحلیل و تجزیہ کی صلاحیت غضب کی تھی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خلاق فطرت نے یہ صلاحیت آپ کو فطری طور پر ودیعت کر رکھی تھی، کبھی ہوائی باتیں نہ کرتے، جو بولتے اور لکھتے اگر موضوع علمی ہوتو خوب جائزہ لے کر لکھتے، اگر موضوع فکری ہوتو اسلامی فکر کی بنیاد پر لکھتے اور دلیل کے ساتھ لکھتے کہ پڑھنے والا خود بھی اپنے آپ کو آپ سے ہم آہنگ سمجھتا۔

مدارس اسلامیہ

آپ مدارس میں موجود فکری جمود کی زنجیروں کو توڑنے کے داعی تھے، طلبہ کے علمی اور اخلاقی زوال پر جو حساسیت میں نے آپ میں دیکھی کم لوگوں میں دیکھی ہوگی، مخالفین اور معترضین کے اعتراضات پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے، اگر بات حق ہوتی تو اسے صاف تسلیم کر لیتے بلکہ اپنی تقریروں میں صاف اس کا اعتراف کرتے کہ ہم کسی کے اعتراض پر چراغ پا نہ ہوں بلکہ اگر ہم میں واقعی خامیاں ہیں تو ان خامیوں کو دور کر کے اعتراضات کا خاموش جواب دیں۔

اعتراضات کا جواب

اسلام پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں آپ کا نظریہ یہ تھا کہ علمی جواب کے مقابلے میں عملی جواب کہیں زیادہ مؤثر دیرپا اور حالات کا رخ بدلنے والا ثابت ہوگا۔ یہ ایک خاص زاویہ نظر ہے، جس پر مفکرین کو بہت غور کرنے کی ضرورت ہے مثلاً: طلاق کو لے کر مسلمانوں پر بلکہ خود اسلام پر جو فضول اعتراضات کیے جاتے ہیں اس سے متعلق آپ کا موقف یہ تھا کہ خود مسلمان اپنی ایسی اصلاح کیوں نہیں کرتے ہیں جس سے اس طرح کے سوالات پیدا ہی نہ ہوں۔ مجموعی طور پر آپ ایک علمی و فکری انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عملی انسان تھے، جن کی فکر ہی یہ تھی کہ جب تک عملی تبدیلی نہیں آئے گی، تب تک فکری و علمی کام ادھورے ہوں گے اور ادھورے ہی رہیں گے۔ یہ چیز آپ کو دوسرے مفکرین سے ممتاز کرتی ہے، جہاں فکری کام کو منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہے، جب کہ آپ اسے ایک اہم ترین ذریعہ سمجھتے تھے اور فکر و عمل کے مجموعے کو اصل بنیاد سمجھتے تھے اور تمام مدارس اسلامیہ کو اسی بنیاد پر قائم و دائم دیکھنا چاہتے تھے۔

عوام الناس اور عصری تعلیم یافتہ طبقات

آپ طبقہ علماء کے ایک فرد فرید تھے، لیکن عصری تعلیم یافتہ طبقے سے بھی بہت قریب تھے، اسی طرح عام لوگوں میں بھی بہت مقبول تھے، تصنع نام کو نہ تھا، معاشرے کے دبے کچلے لوگوں سے خوب گھلے ملے رہتے، نہ علمی رعب، نہ فکری دبدبہ، نہ ادبی کمالات، لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تو ان صلاحیتوں کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہ آتا، ہمیشہ عام لوگوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھتے، اپنی صلاحیتوں کو ان تعلقات میں کبھی حارج نہیں ہونے دیا۔ اسی طرح مدارس کے بعض آزاد خیال بلکہ بسا اوقات آوارہ خیال فارغین کو بھی خوب قریب کیا اور ان کے اندر کے احساس اجنبیت و بے گانگی کو ختم کرنے میں اپنا کردار خوب نبایا۔ اگر مزید زندگی ملتی تو امت کے تمام طبقات کو جوڑنے میں انتہائی نمایاں کردار ادا کرتے۔

شہرت سے دوری

رسول اکرمؐ کے بارے میں انجیل کی یہ پیشین گوئی کتنی سچی ہے جس پتھر کو معماروں نے رد کر دیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یعنی صحرائے عرب کے باشندوں کو لوگ حقارت سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہاں سے کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا مگر یہیں سے ایسا انقلاب برپا ہوا کہ روئے زمین اور روئے آسمان کو کہیں اور ایسا انقلاب دیکھنے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔

آپ کو کبھی شہرت کی خواہش نہیں ہوئی، ادھر اخیر کے چند سالوں میں آپ کو مختلف مقامات سے دعوت دی جانے لگی جسے آپ قبول فرمانے لگے، وہ بھی بندگان خدا کی اصلاح کی غرض سے، ورنہ عام معاملات میں آپ کو پیش پیش رہنے کی کبھی عادت نہ رہی، لیکن پس پردہ رہ رہ کر آپ نے خوب کام کیا اور کئی محاذ سنبھالے رہے، آپ کی وفات کے بعد اس کا بہت احساس ہو رہا ہے، کتنی اہم ترین ذمہ داریاں تھیں جنہیں آپ انتہائی خاموشی کے ساتھ پوری فرما رہے تھے اور آپ کے جانے سے واقعی کتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ سچ ہے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کونے میں رہ کر کام کرتے ہیں اور وہی کونے کا پتھر ثابت ہوتے ہیں جس سے پوری عمارت مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء

آپ ندوۃ العلماء کے ناظر عام تھے، کہنے کو تو یہ ایک منصب ہے لیکن حقیقت میں یہ نہایت نازک اور انتہائی حساس ذمہ داری ہے، اس کا تعلق ندوۃ العلماء کے تمام شعبوں سے ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ و طلبہ اس کے گواہ ہیں کہ آپ نے یہ ذمہ داری نہایت اچھے طریقے سے پوری فرمائی، یہ مدت گرچہ لمبی نہیں رہی لیکن اس دوران آپ طلبہ پر نہایت شفیق، اساتذہ پر بڑے مہربان اور انتظامیہ کے بہترین رفیق و معاون رہے۔ دوسری طرف تعلیم و تربیت پر بھی آپ نے اپنی توجہ خوب مرکوز رکھی اور ایک اچھے معلم و مربی کا کردار بھی بحسن و خوبی نبھایا۔ ندوۃ العلماء کے عربی و اردو ترجمان "البعث الاسلامی" اور..........

..........بقیہ صفحہ ۴۵ پر

باتوں سے پھول جھڑتے ہیں......

ڈاکٹر سراج الدین ندوی ☆

مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ سے ہمارا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ ۴ر نومبر سن ۲۰۲۳ء کو ہمارے تعلیمی ادارہ جامعۃ الفیصل تاج پور میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی حیات و خدمات پر ایک عظیم الشان سمینار منعقد ہوا تھا۔ جس میں پورے ملک سے تقریباً ۲۰۰ علمی وادبی شخصیات تشریف لائی تھیں، اس سمینار میں ۸۰ سے زیادہ مقالات پڑھے گئے تھے، سمینار کی صدارت ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید بلال حسنی ندوی دامت برکاتہم نے فرمائی تھی، اس سمینار میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی رپورٹ مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنی ندوی صاحب نے پیش کی تھی، جو بہت جامع تھی۔ اس سمینار کی کئی نشستوں میں حضرت مولانا مرحوم اسٹیج پر جلوہ فرما رہے، سید بلال حسنی اور مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی صاحب کی شرکت کے سبب یہ سمینار نظم وانصرام اور مقالات وشرکاء کی تعداد و شرکت کے اعتبار سے بہت کامیاب رہا۔ مولانا نے رات کا قیام بھی فرمایا اوراس طرح ہمیں مولانا کی ضیافت وخدمت کا شرف حاصل ہوا۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ میرے استاذ بھی تھے اور میرے مرشد بھی، ان کے انتقال کے وقت میں بیرون ملک ہونے کی وجہ سے جنازے میں شرکت نہیں کر پایا تھا۔ اس لیے بیرون ملک سفر سے واپسی پر پہلے میں ندوہ گیا اور ناظم ندوہ حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی صاحب ودیگر پسماندگان وسوگواران سے تعزیت کی۔ اس کے بعد مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی قبر پر درود وفاتحہ پڑھنے اور محترم مولانا جعفر مسعود صاحب سے ملاقات کے لیے رائے بریلی گیا۔ میں نے مولانا کو پہلے سے ہی اپنے سفر کی اطلاع دے دی تھی۔ مولانا نے حکم دیا کہ آپ سیدھے گھر پر تشریف لائیں اور میرے ذاتی مہمان رہیں، چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ مولانا نے ہمیں کافی وقت دیا، بہت سی سہولیات مہیا کرائیں اور کھانا کھائے بغیر رخصت نہیں کیا۔ میں ندوہ سال میں ایک بار ضرور حاضری دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں، اس لیے مرحوم کو کئی مرتبہ قریب سے دیکھنے اور ان کی صلاحیتوں کو سمجھنے کا موقع ملا۔ جب مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ حیات تھے اور ہمیں ان سے کوئی کام ہوتا تو مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کے ذریعہ وہ کام آسانی سے ہو جاتا تھا۔

ماضی قریب میں حسنی خاندان سے کئی عظیم شخصیات ہم سے رخصت ہو گئیں۔ جعفر صاحب کے بارے میں تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اسی لیے جب ان کی وفات کی خبر ملی تو دل کو ایک جھٹکا سا لگا اور دماغ یقین کرنے پر تاخیر سے آمادہ ہوا۔ لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ یقین کیا جائے یا نہ کیا جائے اس سے کسی کو چھٹکارا نہیں ہے۔

یوں تو حسن اخلاق ایک عام سی بات ہو گئی ہے جو ہم اپنے تمام اصحاب علم ودانش اور بزرگوں کے بارے میں کہتے اور سنتے ہیں لیکن مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنیؒ صاحب تقویٰ اور کردار کے بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ گفتگو کرتے وقت مخاطب کی بات کو نہ صرف غور سے سنتے تھے بلکہ ان کے چہرے کی شادابی اور لبوں کا تبسم مخاطب کو مزید باتیں کرتے رہنے کے لیے آمادہ رکھتے تھے۔ بقول احمد فراز:

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

مولانا کی ایک خوبی یہ تھی کہ خوردوں کا بھی احترام کرتے تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے اور میرے استاذ زادے تھے ایک طرح سے وہ میرے بھائی ہوئے۔ مگر ندوہ میں وہ جس مقام ومنصب پر فائز تھے ان کے بڑے بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ لیکن وہ مجھ سے بات کرتے تو دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ میں ان کا استاذ ہوں اور وہ میرے شاگرد ہیں۔ یہ بات میں کسی مفروضہ کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ایک مرتبہ مجھ سے ایک شخص نے یہ سوال کر دیا کہ کیا مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنیؒ صاحب آپ کے شاگرد ہیں؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ کہنے لگے کہ ان کے انداز گفتگو سے یہی مترشح ہو رہا تھا۔ میں سائل کے اس تاثر پر خود سے بہت شرمندہ ہوا۔

مولانا کی ایک بڑی خوبی بے نیازی تھی، اس دور میں استغنا اور بے نیازی کی صفت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ندوہ کے ناظر عام اور ''الرائد'' کے ایڈیٹر تھے، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ذمہ دار تھے، اس کے علاوہ بھی درجنوں اداروں اور تنظیموں سے وابستہ تھے لیکن آسائش دنیا کا استعمال بہت کم کرتے تھے۔ ان کا لباس انتہائی سادہ ہوتا، سادہ کھانا کھاتے تھے، ان کے دفتر پر کوئی دربان نہ تھا، ان سے ملنے کے لیے کسی کو انتظار کی زحمت گوارہ نہیں کرنا پڑتی تھی، ناواقف شخص ان کو دیکھ کر ان کے مناصب کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ یہ ان کی شان بے نیازی ہی تو تھی جس نے انھیں ہم سے جدا کر دیا، ذرا سوچیے ۱۵ر جنوری کی شام اور موٹر سائکل سے سفر کر رہے ہیں۔ سڑک کنارے اپنا مفلر درست کرنے کو ٹھہرے تھے کہ اجل کو ان پر پیار آ گیا اور ان کو

☆ چیئر مین ملت اکیڈمی بجنور، یوپی

اپنے ساتھ رب حقیقی کی آسائش گاہ میں لے گئی۔اتنے عہدوں پر فائز انسان کو تو اداروں کو جانب سے بھی کار میسر رہتی ہے اور پھر وہ تو خود بھی اس حیثیت کے مالک تھے کہ کار میں سفر کر سکتے تھے،مگر ان کی سادہ طبیعت اس کو گوارہ نہیں کرتی تھی۔

ان کی شان بے نیازی کا میں خود گواہ ہوں یا یوں کہیے کہ شکار ہو چکا ہوں۔جب میں ان سے ملاقات کے لئے رائے بریلی گیا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے تو واپسی پر میں نے ان کے بچوں کو کچھ تحفہ دینا چاہا،مگر مولانا نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہمارے خاندان کے بچے اپنے مہانوں سے کوئی تحفہ قبول نہیں کرتے ،اگر ان کو اس کی اجازت دے دی گئی تو یہ ہر مہمان سے امید باندھ لیں گے،ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز رہیں۔میں یہ بات سن کر آب دیدہ ہو گیا۔اللہ اکبر،ایسے لوگ بھی اس زمین پر موجود ہیں جن کا اسوہ صحابہ کرامؓ کی یاد دلاتا ہے۔بے نیازی کی یہ صفت حسنی خاندان میں جس طرح پائی جاتی ہے کسی اور صاحب نسبت خاندان میں نہیں ملتی۔حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا کردار بھی دنیا کے سامنے ہے،وہ کس طرح دنیا کی وجاہت سے دور بھاگتے تھے،مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شان بے نیازی کے بھی لوگ گواہ ہیں،مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ کا بھی یہ نمایاں وصف تھا۔انھی بزرگوں کا عکس جمیل مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنیؒ صاحب میں پایا جاتا تھا۔وہ ان کے سچے جانشین تھے ۔ہم جب ندوہ جاتے تو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی ،اب سوچتا ہوں کہ جب ندوہ جاؤں گا تو کیا مجھے وہی اپنائیت مل پائے گی جو ان بزرگوں کی موجودگی میں ملتی تھی۔

مولانا کے اوصاف میں ایک نمایاں وصف اور ممتاز خوبی خوش گفتاری تھی۔وہ جب بات کرتے تھے تو نہ کوئی لفظ تلخ بولتے اور نہ چہرے سے کسی ناگواری کا اظہار کرتے تھے وہ اپنے اوپر تنقیدوں کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے اور بہت سی تلخ باتوں کو اپنے لب شیریں کے نیچے دبا دیتے تھے۔ان کی خوش گفتاری ان کے قلم اور زبان سے شہد کی طرح ٹپکتی تھی،بلاشبہ وہ اسلاف کے زندہ نمونہ تھے۔

وہ راہ اعتدال کے عامل تھے۔دراصل ندوہ خود بھی راہ اعتدال کا مرکز و محور ہے۔اس کے باوجود انسان کی اپنی فکر بھی اس کی تربیت میں کارفرما ہوتی ہے۔حسنی خانوادے نے کسی بھی مسلک کے خلاف زبان و قلم کا استعمال نہیں کیا،بلکہ جن لوگوں نے کیا ان کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی ۔مولانا جعفر مسعود حسنیؒ بھی اسی مسلک کے داعی تھے۔وہ ندوہ کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے،ندویت ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئی تھی۔ندوہ میں بہت سے سخت مراحل آئے لیکن انھوں نے ان سب کا خوش اسلوبی سے سامنا کیا اور اپنی شبنم مزاجی سے مسائل کو حل کیا۔

دکھ سکھ کے مرحلہ ہر کسی کی زندگی میں آتے ہیں اور زندگی کے نشیب و فراز سے ہر شخص گزرتا ہے۔یقیناً ان کی زندگی میں بھی بہت سے نشیب و فراز آئے ہوں گے لیکن کبھی کسی رفیق پر اپنے مشکل حالات کو آشکار نہیں کیا،وہ اپنے مسائل خود حل کرنے اور مشکلات کو آسانی میں بدلنے کا ہنر جانتے تھے۔بقول جگر مرادآبادی:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

وہ حقیقی محبت کے ترجمان تھے۔وہ محبت کے تقاضوں کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ ان کو عملی جامہ بھی پہناتے تھے۔انھیں اپنے مادر علمی،اپنے اسلاف، اپنے اساتذہ اور اپنے احباب سے بے پناہ محبت تھی۔ایسی محبت جو ان کے روئیں روئیں سے ٹپکتی تھی ۔پیاسے لوگ اس دریائے محبت سے سیراب ہو کر اپنی تشنگی دور کرتے تھے۔

ان کی خوبی یہ تھی کہ جس شخص سے ان کا ایک بار تعلق قائم ہو جاتا وہ تعلق صرف رسم کی حد تک نہیں رہتا بلکہ دن بہ دن مضبوط ہوتا رہتا۔وہ طلبہ عزیز کو بھی اس قدر محبت سے سمجھاتے کہ وہ ان کے گرویدہ ہو جاتے اور ان کی ہدایات کو دل سے ماننے پر مجبور ہوتے ۔مولانا ایک اچھے انسان اور منتظم کے ساتھ ساتھ ایک بہترین معلم تھے۔ان کی عملی زندگی کا آغاز نخاس لکھنؤ میں واقع ندوۃ العلماء لکھنؤ کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں تدریسی فرائض کی انجام دہی سے ہوا۔ایک ذمہ دار،ایک معلم اور ایک مربی کا سب سے اہم وصف دل سوزی اور مخلصانہ رویہ ہوتا ہے اور اللہ نے ان کو یہ نعمت بھرپور عطا فرمائی تھی ۔آپ کا انداز درس جداگانہ تھا۔جو کچھ پڑھاتے اس کا مطالعہ کر کے درجہ میں آتے ،قدیم کتابوں کو جدید اصطلاحات سے ہم آہنگ کر کے پڑھاتے ،طلبہ ان کی طرف اس طرح متوجہ رہتے کہ اگر کلاس میں سوئی بھی گر جائے تو اس کی آواز سنائی دے۔

مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنیؒ صاحب علم و بصیرت اور عملی انسان تھے۔وہ علم و عمل کا پیکر تھے، یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ علمی زیادہ تھے یا عملی زیادہ تھے ۔وہ اردو اور عربی زبان کے صاحب اسلوب ادیب اور قلم کار تھے۔ان کے خطاب میں جوش سے زیادہ خلوص ہوتا۔اسی خوبی کی بنا ان کا ہر لفظ سامعین کے دل میں اترتا جاتا تھا۔یعنی

اثر ہوا تو یہ تقریر کا کمال نہ تھا
مرا خلوص مخاطب تھا میں کہاں بولا

وہ فکر اسلامی و دعوت اسلامی عظیم سپہ سالار تھے ۔ان کی تحریروں اور خطابات میں فکر اسلامی مضمر ہوتی تھی ۔آپ البعث الاسلامی اور الرائد کے مدیر تھے۔آپ نے بلاشبہ سیکڑوں مضامین لکھے ۔اس کے علاوہ بھی آپ کی عربی تحریریں

دنیائے عرب کے مجلّات و جرائد میں چھپتی تھیں۔ آپ کی تحریروں میں فنی خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔آپ نے پانچ کتابیں تصنیف کیں۔

۱-فی مسیرۃ الحیاۃ (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی خودنوشت ''کاروان زندگی'' کا عربی ترجمہ)

۲-الشیخ محمد یوسف الکاندھلوی؛ حیاتہ ومنھجہ فی الدعوۃ (مولانا محمد الحسنی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)

۳-الامام المحدث محمد زکریا الکاندھلوی ومآثرہ العلمیۃ (حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)

۴-دعوۃ للتأمل والتفکیر (دعوت فکر ونظر)

۵-بصائر (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ)

دنیائے فانی میں آپ کا ورود مسعود ۱۳/ستمبر ۱۹۶۵ء کو تکیہ رائے بریلی، اترپردیش میں ہوا۔ آپ جس چمن میں پھول بن کر آئے اس چمن میں ہر طرف علم ومعرفت اور زہد وتقویٰ کے پودے لہلہا رہے تھے۔آپ کے والد ماجد مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت مولانا علی میاں ندوی کے حقیقی بھانجے تھے۔

آہ عجز وانکسار کا پیکر، علم ودانش کا سمندر، تحریرو قلم کا بادشاہ، سادگی وبے نیازی کا علم بردار، اپنے اجداد کا عکس جمیل، لاکھوں دلوں کا مکین، ہزاروں افراد کی امیدوں کا چراغ ۱۵/جنوری کی شام سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی بجھ گیا اور دنیا پر رات کی تاریکی کی طرح رنج والم کی تاریکی بھی چھا گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون اے پروردگار ہمارے بھائی سید محمد جعفر مسعود کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیے، ان کی فروگزاشتوں سے درگزر کیجیے۔ابھی تو ان کی ہمیں بہت ضرورت تھی مگر اے ہمارے رب، ہم آپ کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

☆☆☆☆☆

...........بقیہ صفحہ ۴۲/کا

''تعمیر حیات'' میں آپ کے مضامین چھپتے رہے، ''الرائد'' کے تو خیر آپ ایڈیٹر ہی تھے۔طلبہ میں وقتاً فوقتاً خطابات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔اسی طرح دارالعلوم میں جو اہم سیمینار منعقد ہوئے ان میں بھی آپ کے گراں قدر خطابات سے سامعین مستفید ہوتے رہے، عمائدین شہر سے بھی ملاقاتوں کا معمول رہا اور مختلف مقامات سے تشریف لائے ہوئے مہمانوں کے اکرام کا سلسلہ بھی رہا۔غرض ندوۃ العلماء کے جتنے شعبے ہیں، ان میں آپ کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حسن اخلاق:

انسان کا اصل جوہر اس کے اچھے اخلاق ہوتے ہیں، یہ زندگی کو فتح کرتے ہیں، ان کے نقوش کبھی فراموش نہیں ہوتے، ارشاد رسالت ہے:''أکمل المؤمنین إیماناً أحسنھم خلقاً'' (کامل ترین مؤمن وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں)۔

مشہور محدث حضرت عبداللہ بن المبارک حسن اخلاق کی تشریح یوں کرتے ہیں:''ھو بذل المعروف وکف الأذیٰ وطلاقۃ الوجہ.'' (اچھے اخلاق بھلائیوں کو عام کرنے، اذیت رسانی سے پرہیز اور خندہ پیشانی سے ملاقات کرنے کا نام ہیں)۔

مولانا جعفر مسعود حسنی رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں بالخصوص وہ عملی اخلاق جن کو خیر خواہی اور احسان کہا جاتا ہے بڑے ممتاز تھے، قیامت کے دن جن خوش نصیبوں کو عرش کا سایہ نصیب ہوگا، ان میں ایک وہ بھی شخص ہوگا جس نے دائیں ہاتھ سے جو خرچ کیا ہوگا اس کی خبر بائیں ہاتھ تک کو نہ ہوگی۔اس سے مراد وہ ہے جو صدقہ وخیرات میں انتہائی پوشیدگی سے کام لے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دے۔مولانا جعفر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خاص ادا تھی، اس کا انکشاف آپ کی وفات کے بعد ہوا، ممکن ہے کہ اس طرح کے بعض کام ایسے ہوں جسے آپ کے اہل خانہ تک نہ جانتے ہوں۔

عظمت صحابہ اور دینی غیرت:

آپ کی شخصیت ایک سنجیدہ اور متین شخصیت تھی، باتیں بڑی مرتب اور دلائل کی روشنی میں کرتے، کبھی جوش ہوش مندی پر غالب نہیں آتا، جذباتی باتوں سے پرہیز کرتے لیکن جہاں معاملہ دینی غیرت، حب رسول اور حب صحابہ کا آتا، وہاں طبیعت میں ایک خاص جوش نظر آتا اور اس سلسلے میں اپنے پرائے، دوست دشمن کسی کی پرواہ نہ کرتے اور جو حق ہوتا اس کا اظہار برملا کرتے۔

قابل قدر شخصیت:

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے ایک قابل فرزند کو کھو دیا، ایک باکمال اور پربہار سپوت کو الوداع کہا جو واقعی زبان ہوش مند، فکر ارجمند اور دل دردمند کا حامل تھا۔ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔اللہ رب العزت بال بال مغفرت فرمائے، کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، غریق رحمت فرمائے۔عزیزان گرامی مولوی خلیل، مولوی امین اور مولوی عبدالحی کو اپنے اسلاف کا سچا جانشین بنائے، اہلیہ مکرمہ وصاحب زادی کو صبر اور اجر مرحمت فرمائے۔ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی حفاظت فرمائے۔آپ کے تمام عزائم کو مبارک فرمائے اور تمام اہل خاندان کو اپنی کامل رضامندی کے ساتھ دنیا وآخرت کی بہاریں نصیب فرمائے۔آمین!

مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے

☆☆☆☆☆

دل میں اتر جانے والا ہنرمند

ڈاکٹر ولی الدین ندوی☆

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ دنیا کے لیے بہت کچھ تھے، اور بجا طور پر تھے، اردو اور عربی کے بہترین انشا پرداز، بہترین مصنف، قابل مترجم، بہترین منتظم، بہترین معلم، باصلاحیت صحافی، نیک طینت، خاکسار، خوش مزاج انسان، لیکن ہمارے لیے تو وہ جعفر بھائی تھے، جعفر بھائی ندوہ میں ہم سے ایک سال سینئر تھے، آج اُن کی رفاقتیں اور صحبتیں یاد آتی ہیں، وہ کرکٹ کے بڑے شوقین تھے اور شاندار کھیلتے تھے، یہی ایک چیز تھی جو پڑھائی کے بعد بھی ان کو ندوہ کیمپس سے جوڑ کر رکھی تھی، ورنہ وہ شہر سے پڑھنے کے لیے آمد و رفت رکھتے تھے، وہ بھی کیا دن تھے:

یاد ماضی کی پُر اسرار حسیں گلیوں میں
میرے ہم راہ ابھی گھوم رہا ہے کوئی

اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں اتنی جلد چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو جائیں گے، لیکن خدا کے فیصلے اور غیب کے معاملے اس کے سوا کون جانتا ہے؟ ایک جہان نے ان سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، علم و فن کے میدان میں، اصلاح و فکر اسلامی کے میدان میں، ان کے جوہر اور بھی کھلتے، ان کی انتظامی صلاحیتوں سے اور فیض اٹھایا جاتا، ان سے لمبی دوڑ کی امید تھی، لیکن خود انہیں بھی، یا کسی کو بھی کیا پتا کہ پردۂ غیب میں اس کے لیے کیا رکھا ہے؟ چار دن کی حیات مستعار اس کا ساتھ اور کب تک دے گی؟ ہم اللہ کے فیصلے پر راضی ہیں، یہی ہمارا ایمان ہے، اللہ کسی کا محتاج نہیں، وہ بے نیاز ہے، وہ احد و صمد ہے، بس اس بات سے تسلی ہے کہ خدا کے دربار میں جب یہ بندہ حاضر ہوا تو لوگ اس کے لیے سراپا التجا دعا ہیں، سب کی زبانوں پر اس کے لیے کلمۂ خیر جاری ہوا، سب یہیں کہتے ہیں کہ:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا
لوگ اچھے ہیں بہت، دل میں اتر جاتے ہیں
اک برائی ہے تو بس یہ ہے کہ مر جاتے ہیں

مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ اپنی خاندانی اور موروثی خصوصیات کے سچے حامل تھے، وہی کسر نفسی، وہی تواضع، وہی سادگی، وہی اخلاص وللّٰہیت وہی احساس ذمہ داری، وہی شریف النفسی، جو خطۂ مشرق کے اس حسنی خانوادے کا طرۂ امتیاز اور تمغۂ افتخار ہے، جسے شاہ علم اللہؒ اور ان کے بعد سید احمد شہیدؒ جیسے اللہ کے ولیوں سے نسبت حاصل ہے۔

جب بھی وطن جانا ہوتا تو اپنے رفیق دیرینہ مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ سے ملاقات کے بغیر سفر مکمل نہ ہوتا، کبھی لکھنؤ میں ملاقات ہو جاتی تو کبھی ان کے وطن رائے بریلی کا سفر ہوتا، اس طویل عرصے میں اُن کی پرانی وارفتگی، تعلق خاطر اور شگفتہ خاطری میں بالکل فرق نہیں آیا، جب بھی ملنا ہوتا، وہی والہانہ انداز ہوتا جو زمانۂ طالب علمی کی یاد تازہ کر دیتا، اور پھر یادِ ماضی کے اوراق الٹے پلٹے جاتے، پرانی یادیں تازہ کی جاتیں، کرکٹ کا شوق انہیں بھی تھا اور مجھے بھی، اس شوق نے ہمیں ایک دوسرے کی ڈور کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ کسی ہوٹل میں محفل سجتی اور ساتھ میں کھانا ہوتا، تو جعفر بھائی بل خود ادا کرتے، کبھی مجھے یہ موقع نہ دیتے کہ میں بل چکتا کروں، اس سے ان کی کریم الطبعی اور کشادہ قلبی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جعفر بھائی مدرسہ عالیہ عرفانیہ لکھنؤ میں مدرس تھے، وہیں سے ریٹائر ہوئے اور پھر مولانا حمزہ حسنی صاحبؒ کے انتقال کے بعد ندوے کے ناظر عام مقرر کیے گئے، اس کا مشورہ حضرت والد صاحب نے ہی دیا تھا جسے حضرت ناظم صاحب اور تمام اراکین نے قبول فرمایا اور مولانا جعفر مسعود صاحب ندویؒ ندوے کے ناظر عام بنے۔

ان کے والد اور عربی کے زبردست انشا پرداز، عالم اسلام اور عالمی سیاست پر گہری نظر رکھنے والے مقتدر صحافی حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ "الرائد" کے ایڈیٹر رہے، جعفر بھائی کو اپنے والد صاحب اور اپنے بڑے ابو اور خسر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی بہترین نگرانی اور تربیت حاصل ہوئی تھی، کئی سالوں تک "براعم الایمان" کے نام سے "الرائد" میں شاندار کالم لکھتے رہے، جو نہ صرف طلبہ کے لیے مفید ہوتا بلکہ اساتذہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے، "أخي العزيز" کے نام سے یہ خوبصورت ادبی شذرات کتابی شکل میں ابھی دو تین سال پہلے شائع ہوئے، پھر واضح صاحبؒ کے انتقال کے بعد الرائد کی ادارت کی ذمہ داری بھی ان کے کاندھے پر آگئی اور وہ اداریے لکھنے لگے، ابھی کل معلوم ہوا کہ اُن کے ان اداریوں پر مشتمل ان کی کتاب "خواطر" چھپ کر آئی ہے، جس کا اجرا ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا بلال عبد الحی حسنی ندوی اور مہتمم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب کے ہاتھوں سے عمل میں آیا، اللہ ان کے قلم کا فیض عام و تام فرمائے، آمین۔

............بقیہ صفحہ ۴۹ / پر

☆نائب ناظم جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا

مولانا سید احمد ومیض ندوی ☆

ایک ایک کر کے اربابِ ندوہ کی دنیا سے رخصتی جہاں ندوے کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے، وہیں ملت اسلامیہ کے لیے کسی عظیم سانحہ سے کم نہیں۔ حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ اور حضرت مولانا حمزہ حسنی ندویؒ کی وفات حسرت آیات کے بعد مولانا سید جعفر مسعود ندوی کے سانحہ نے ساری علماء برادری کو غم واندوہ کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا ہے۔ سڑک حادثے میں ان کی اچانک وفات سے نہ صرف ندوہ اور اہل ندوہ میں غم کی لہر دوڑ گئی بلکہ پورا ملک اور ملک کی پوری ملت اسلامیہ سوگوار ہو گئی۔ دنیاوی زندگی کی بے ثباتی ایک اٹل حقیقت ہے، ہر کسی کو اس دنیا کو سدھارنا ہے، حضرات انبیاء کرام بھی اس خدائی نظام سے مستثنیٰ نہیں ہیں، لیکن کچھ خانوادے ایسے ہوتے ہیں جن کا ہر فرد اپنی ذات میں انجمن اور مینارۂ نور ہوتا ہے اور جن کی فیض رسانی کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے، ایسی شخصیات کا دنیا سے اٹھ جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں ہوتا، خانوادۂ حسنی علم اللٰہی کا شمار ایسے ہی خانوادوں میں ہوتا ہے، اس خانوادے کا ایک ایک فرد روشنی کا نقیب اور علم وعمل اور اخلاق وفضائل کا پیکر ہے۔ بر صغیر ہند و پاک کو اللہ تعالیٰ نے اس خانوادہ کے ذریعہ بے پناہ فیض یاب کیا۔ یہ وہ خانوادہ ہے جس کی فیض رسانی حدود وقیود سے ماوراہے۔ اس سے وابستہ شخصیات نے جہاں عجم کو سیراب کیا وہیں عرب کو بھی ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، حتی کہ ان کے فیوض وبرکات سے یورپ اور دیار مغرب بھی محروم نہ رہا۔ جہاں تک برصغیر کا تعلق ہے تو یہاں کی گلی گلی کوچہ کوچہ اس خانوادے کے روحانی فیض اور علمی خدمات کا مرہون منت ہے۔

حضرت مولانا سید جعفر مسعود ندوی علیہ الرحمہ اسی خانوادہ کے گل سر سبد تھے، ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی کہ انہیں خدا کا بلاوا آ گیا، بندے ہزار سوچیں لیکن ہوتا وہی ہے جو رب کائنات کا منشاء ہے، مولانا جعفر مسعود صاحب کا سانحہ ارتحال اس لیے بھی تعجب خیز نہیں کہ اس خانوادے میں جوانی اور کم عمری میں وفات کوئی نئی بات نہیں ہے، "البعث الاسلامی" کے بانی، عربی کے صاحب طرز ادیب حضرت مولانا محمد الحسنی کا سانحہ بھی کچھ ایسی ہی عمر میں پیش آیا، وہ اپنی خدمات کے دور عروج کو پہنچ چکے تھے اور ان کے جوہر خوب نکھر رہے تھے کہ رب کا پیغام آ گیا۔ اسی طرح گزشتہ دنوں مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی بھی جوان العمری میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان سے قبل حضرت مولانا عبد اللہ حسنی ندوی، اسی طرح حالیہ عرصے میں مولانا حمزہ حسنی ندوی بھی ایک ایسے وقت داغ مفارقت دے گئے جب ان کی صلاحیتوں کا سورج نصف النہار پر تھا۔ خداوند قدوس کی ذات شکوہ و شکایت سے ماورا ہے، اس کی بارگاہ میں شکوے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں، بندے اپنے محدود بشری خول میں بند ہو کر سوچتے ہیں لیکن وہی ہوتا ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ إنا بفراقك يا جعفر لمحزونون!

مولانا سید جعفر مسعود ندوی علیہ الرحمۃ والرضوان خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ، عالم اسلام کی عظیم الشان یونیورسٹی دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظر عام، رابطہ ادب اسلامی شعبہ برصغیر کے صدر، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن اور متعدد عربی واردو علمی تصانیف کے مصنف اور عالم اسلام پر گہری بصیرت رکھنے والے ایک عظیم صحافی تھے۔ انہیں اللہ نے زبان و بیان اور تحریر تصنیف کی بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، قرطاس وقلم سے گہری وابستگی روز اول سے تھی۔

مولانا سید جعفر مسعود ندوی علیہ الرحمہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے حقیقی بھانجے، عظیم مفکر، دانشور، درجنوں کتابوں کے مصنف، نسلوں کے استاذ، نامور ادیب، بے مثال صحافی اور صاحب بصیرت عالم دین حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی اکلوتی اولاد تھے۔ مولانا واضح رشید حسنی ندوی جانشین مفکر اسلام، مرشد امت، سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی علیہ الرحمہ کے برادر خورد تھے۔ اکلوتی اولاد ہونے کے سبب مولانا جعفر مسعود ندوی کو اپنے گرامی قدر والد اور عظیم المرتبت چچا کی بھرپور شفقتیں حاصل رہیں۔ استاذ گرامی حضرت مولانا واضح رشید ندوی رحمہ اللہ نے اپنے اکلوتے فرزند کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، ویسے مولانا جعفر مسعود ندوی نے جس خانوادے میں آنکھیں کھولیں یہ ایسا خانوادہ ہے جس کے اسلاف اور بزرگ روز اول سے اپنی اولاد کی تربیت پر خصوصی توجہ دیتے رہے ہیں۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے جس اونچے مقام پر فائز فرمایا تھا اس میں ان کی والدہ کی تربیت اور ان کے برادر کبیر کی توجہات کا بڑا دخل تھا۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی علیہ الرحمۃ اور مولانا سید محمد واضح رشید ندوی علیہ الرحمہ دونوں برادران مفکر اسلام

☆ استاد حدیث دار العلوم حیدرآباد

حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کے بھانجے تھے، ان دونوں حضرات کو حضرت مفکر اسلام کی خصوصی توجہات حاصل تھیں۔اسی طرح مرحوم جعفر مسعود ندوی رحمہ اللہ پر اپنے والد بزرگوار اور تایا حضرت کی الطاف وعنایات سایہ فگن تھیں۔اسی کا اثر تھا کہ مولانا جعفر مسعود ندوی نے ان دونوں بزرگوں کی صفات اپنے اندر جذب کر لی تھیں،مولانا واضح رشید ندوی صاحب کے جن تلامذہ اور متعلقین نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا تواضع و انکسار، خلوص وللّٰہیت، سادگی ومتانت کا حسین پیکر تھے۔مولانا جعفر مسعود ندوی بھی ان صفات میں اپنے والد بزرگوار کا عکس تھے، کچھ خصوصیات خاندانی اور موروثی ہوتی ہیں جو خاندان کے تمام افراد میں مشترک ہوتی ہیں،حسنی خاندان کا طرۂ امتیاز اس کی سادگی اور استغناء ہے، یہ دونوں صفات اس خاندان کے ہر فرد میں جھلکتی ہیں، مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کو دنیا کے اونچے اونچے اعزازات سے نوازا گیا، انہیں علمی دنیا کے بڑے سے بڑے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا،اس کے باوجود مولانا حد درجہ متواضع تھے،اس کے ساتھ مولانا کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ دنیا ان کے قدموں پر آ گری لیکن مولانا نے خود کو اس سے مستغنی رکھا، لاکھوں روپیوں پر مشتمل ایوارڈ دیے گئے؛ لیکن مولانا نے اس خطیر رقم کو دینی تحریکات اور اداروں کو عنایت کر دیا۔

مولانا جعفر مسعود ندوی علیہ الرحمہ کو بھی اخلاق کی بلندی، مزاج میں سادگی اور متاع دنیا سے بے رغبتی اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملی تھی۔ان کے والد گرامی مولانا واضح رشید ندوی صاحب عالم عرب کے نامور ادیب تھے،ان کی تحریریں شوق سے پڑھی جاتی تھیں اور اہل عرب ان کے مضامین کے منتظر رہا کرتے تھے،لیکن اس کے باوجود ان کا رہن سہن اور عادات واطوار انتہائی سادہ تھے،مولانا جعفر مسعود ندوی بھی اپنے والد کا ثانی تھے۔ملنساری، خردنوازی، احسان شناسی اور بلند اخلاقی میں وہ اپنے بزرگوں کے پرتو تھے، نہایت ملنسار، خوش مزاج اور بلند کردار انسان تھے۔ عاجز کو مولانا سے ملاقات کے مواقع حاصل نہیں ہوئے لیکن دور طالب علمی میں ندوہ کے اساتذہ اور منتسبین سے ان کے تعلق سے بہت کچھ سن رکھا تھا نیز ان کی مترجمہ کتب سے استفادہ بھی کرتا رہا۔

مولانا مرحوم اپنے والد کی طرح اردو اور عربی کے ادیب، انشاء پرداز اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل عظیم صحافی تھے، وہ اپنے والد گرامی کی طرح اسلامی صحافت کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے،انہیں عالم اسلام کے خلاف کی جانی والی صہیونی وصلیبی سازشوں کا پورا ادراک تھا، ان کی تحریریں گہرائی و گیرائی کے ساتھ فکر صحیح کی ترجمان ہوتی تھیں، وہ ندوہ کے مسلک اعتدال کے سچے نمائندے تھے۔

مختلف شہروں سے نکلنے والے روزناموں میں ان کے فکر انگیز مضامین وقفے وقفے سے شائع ہوا کرتے تھے، وہ اپنی تحریروں میں اکثر و بیشتر یہود و نصاریٰ کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرتے تھے، انہیں عربی اور اردو دونوں میں غیر معمولی دسترس حاصل تھی، مولانا واضح رشید ندوی علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد انہیں ندوے کے عربی ترجمان "الرائد" کا ایڈیٹر بنایا گیا تھا اور وہ اس عربی مجلّے کی ادارت کی ذمہ داری بحسن خوبی انجام دے رہے تھے، انہوں نے الرائد میں بچوں کے لیے ایک مستقل کالم کا آغاز کیا جسے توقع سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی، مولانا جعفر مسعود ندوی جہاں ایک کہنہ مشق قلم کار تھے وہیں زبان وبیان اور فن خطابت کے بھی رمز آشنا تھے، اگر چہ انہوں نے اپنے ابتدائی دور میں تقریر وخطابت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے تقریری جوہر بھی کھلنے لگے، چنانچہ تکیہ رائے بریلی میں ان کے دروس قرآن کا سلسلہ شروع ہوا جسے بے حد پسند کیا گیا، انداز بیان سنجیدہ تھا، اسلوب میں بلا کی فصاحت وبلاغت تھی، ٹھہر ٹھہر کر بولتے اور الفاظ وتعبیرات کے استعمال میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتے، ان کی تحریر وتقریر سے ان کا اعلیٰ ادبی ذوق صاف جھلکتا تھا، وہ کم گو تھے لیکن انداز گفتگو پر وقار ہوتا تھا۔مولانا جعفر مسعود کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کے داماد تھے، مولانا جعفر مسعود ندوی کے تین فرزندان ہیں۔

مولانا جعفر مسعود ندوی ۱۳/ستمبر ۱۹۶۰ء کو اپنے آبائی مقام تکیہ رائے بریلی یو پی میں پیدا ہوئے، انہوں نے حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم وطن مالوف ہی میں حاصل کی، اس کے بعد عالمیت کے لیے ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، جہاں علوم اسلامی کے ساتھ عربی زبان وادب پر عبور حاصل کیا، ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں سند فضیلت حاصل کی، انہوں نے ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان وادب میں ایم اے کیا، اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب کی مشہور یونیورسٹی جامعۃ الملک سعود میں ٹیچر ٹریننگ کورس کی تکمیل کی۔ تعلیمی مراحل کی تکمیل کے بعد عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا۔دار العلوم ندوۃ العلماء کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے، آپ کے دلچسپی کے موضوعات میں تفسیر وحدیث اور فکر اسلامی کو اولیت حاصل تھی، مختلف علمی فکری ادبی اور تاریخی موضوعات پر آپ کے ان گنت مقالات ومضامین ملک وبیرون ملک سے نکلنے والے مجلّات وجرائد میں شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ۲۰۱۹ء میں

آپ کو ندوۃ العلماء کے پندرہ روزہ عربی ترجمان "الرائد" کا رئیس تحریر منتخب کیا گیا۔

جہاں تک آپ کی علمی کاوشوں کا تعلق ہے تو آپ نے مستقل کتابیں بھی تحریر فرمائیں اور خصوصیت کے ساتھ مختلف کتب کا نہایت سلیس زبان میں ترجمہ کیا۔ آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں:

☆في مسيرة الحياة (حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کی خود نوشت سوانح حیات ''کاروانِ زندگی'' کا عربی ترجمہ)

☆الشيخ محمد يوسف الكاندهلوي حياته ومنهجه في الدعوة (مولانا محمد الحسنی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)

☆الإمام المحدث محمد زكريا الكاندهلوي ومآثره العلمية (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)

☆دعوة للتأمل والتفكير (دعوت فکر ونظر)

☆بصائر (مولانا علی میاں کے عربی کتاب کا اردو ترجمہ)

درج بالا کتابیں مولانا کے فن ترجمہ نگاری کا حسین مرقع ہیں، ترجمہ نگاری کوئی آسان کام نہیں ہے، ایک مترجم کو دونوں زبانوں میں بھرپور دسترس ہونا ضروری ہوتا ہے، آدمی ایک کامیاب مترجم تب ہی بن سکتا ہے جب اسے دونوں زبانوں کی نزاکتوں کا بھرپور علم ہو۔ مولانا جعفر مسعود ندویؒ چونکہ اردو عربی دونوں میں ادیبانہ کمال رکھتے تھے، اس لیے ان کی ترجمہ نگاری میں حد درجہ سلاست وروانی پائی جاتی ہے، قاری کو کہیں بھی ترجمہ پن محسوس نہیں ہوتا۔

الغرض مولانا سید جعفر مسعود ندوی ایک ایسے وقت میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے جب کہ ندوہ اور ملت اسلامیہ کو ان سے بڑی توقعات تھیں۔ وہ ندوہ کے ناظر عام کے عہدہ پر فائز تھے اور موجودہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی صاحب کے دست راست تھے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ندوہ صف اول کی اکابر شخصیات سے خالی ہو چکا ہے، مولانا جعفر مسعود ندوی کی رحلت کسی سانحہ سے کم نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ انہیں ان کے پروردگار کی آغوش رحمت میں ضرور جگہ ملی ہوگی اور وہ اپنے مرحوم خاندانی اکابر کے زمرہ میں شامل ہوئے ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

.................بقیہ صفحہ ۴۶ کا

حضرت والد صاحب کو اُن سے بہت تعلق تھا اور انہیں بھی حضرت والد صاحب کے ساتھ جو عقیدت اور محبت تھی، اس کا اظہار کئی موقعوں پر ہوتا رہا۔ مجھے جو جعفر بھائی سے ربط دیرینہ تھا، والد صاحب نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا، اکثر والد صاحب کی گفتگو ندوے میں جعفر بھائی سے ہی ہوا کرتی اور جب بھی ان کی گفتگو ہوتی تو مجھ سے فرماتے، ارے بھائی، تمہارے دوست جعفر مسعود صاحب سے آج فون پر بات ہوئی۔ جعفر بھائی حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کے فرزند تھے اور میرے والد صاحب ان کے دوستوں اور معاصرین میں سے تھے۔

حضرت والد صاحب مردم شناس شخص ہیں، چنانچہ انھوں نے جعفر بھائی کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے کئی تراجم کروائے اور جعفر بھائی نے ہمیشہ اس ذمہ داری کو احسن طریقے پر انجام دیا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی سوانح کا ترجمہ والد صاحب کے ایماء پر جعفر بھائی ہی نے کیا جو حضرت والد صاحب کے زیر نگرانی دار البشائر بیروت سے طبع ہوا، موضوع کی مناسبت سے والد صاحب نے میرا مقالہ جو حضرت شیخ الحدیثؒ پر تھا اسے بھی بطور ضمیمہ اس میں شامل فرمایا، اس طرح بہت عمدہ کام ہوگیا۔

جعفر بھائی مجلسی آدمی نہ تھے، اپنے والد صاحب کی طرح چھپے رہتے، اپنی منصبی ذمہ داریوں میں ہمہ تن مصروف رہتے، لکھنے پڑھنے اور تدریسی امور سے ان کو فرصت ہی نہ ملتی، ندوے آتے اور چلے جاتے، کسی کو پتا ہی نہ چلتا، لیکن جب سے ذمہ داریوں کا باران کے کاندھوں پر آیا، بطور خاص ندوے کے ناظر عام مقرر ہوئے، اس وقت سے ملک کے طول وعرض، بلکہ بیرون ملک بھی ان کے دورے ہونے لگے اور تب ان کا دوسرا روپ لوگوں نے دیکھا کہ چپ چپ رہنے والا، بہت کم بولنے والا، شرمیلا مزاج ایک شخص بے تکلف مجلسوں میں لوگوں کو ندوے کی فکر، اس کے پیغام اور اس کے مقاصد سے آگاہ کر رہا ہے۔

وہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو تکیہ کلاں، رائے بریلی، اتر پردیش میں پیدا ہوئے، انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا، اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی سند حاصل کی، لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا، ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب گئے اور وہاں ایک سالہ تربیتی کورس مکمل کیا۔

مولاناؒ ۱۵ر جنوری ۲۰۲۵ء کو ایک سڑک حادثے میں اچانک فوت ہوکر مسافران آخرت میں شامل ہو چکے، انھوں نے اپنے پیچھے جو روحانی ومعنوی اور علمی وادبی وراثت چھوڑی ہے، وہ ان کے لیے صدقۂ جاریہ ہے، ایک پوری نسل ہے جس نے ان کی تربیت، ان کی فکر اور ان کی تحریروں سے فیض اٹھایا ہے، یقیناً وہ ان کی حسنات میں شمار ہوگی، اللہ انہیں غریق رحمت کرے، ان کی سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے، ان کے فرزندان خلیل حسنی اور امین حسنی اور دیگر کو اُن کا بہترین جانشین بنائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

درویش صفت عالم دین کی رحلت

پروفیسر عبدالواسع ندوی☆

درویش صفت، صالح ومتقی، سادہ پیکر، زبان و ادب کے شہ سوار، ناظر عام ندوۃ العلماء، ہم سب کے عزیز اور محترم مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ بھی راہی ملک عدم ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

جب سے خبر ملی ہے غیر یقینی کیفیت سے دوچار ہوں، دل رنجور اور ذہن مضطرب ہے، مگر مشیتِ ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ إن للّٰه ما أخذ وله ما أعطى وكل شيء عنده بأجل مسمى!

خانوادۂ حسنی نے پچھلی دو دہائیوں میں کئی عبقری شخصیات کھوئی ہیں اور ان شخصیات کا کھونا صرف حسنی خانوادے کا نقصان نہیں ہے بلکہ قومی و ملی خسارہ ہے۔ بالخصوص علم وعمل، تقویٰ و پرہیزگاری، استغناء و بے نیازی اور نافعیت جیسی کم یاب صفات کی حامل شخصیات کے طلب گاروں کے لیے بڑا نقصان ہے۔ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے بعد پہلے جامع کمالات استاذ محترم مولانا عبداللہ حسنی مرحوم انتقال فرما گئے، اس کے بعد ماہر لسانیاتِ قرآنی، ادبِ اسلامی کے علم بردار، برصغیر میں فکر اسلامی کے پاسباں، معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، مشفق ومہرباں، عزیز از جان استاد محترم حضرت مولانا واضح رشید حسنی وفات پا گئے۔ بعد ازاں ناظر عام ندوۃ العلماء مولانا محمد حمزہ حسنی بھی مرحوم ہو گئے، پھر بھری جوانی میں مولانا محمود حسنی مرحوم چل بسے۔ ان کے بعد مرشد الامت، فکر بوالحسن کے امین، ندوۃ العلماء کے ناظم، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد رابع حسنی بھی رحلت فرما گئے اور اب اخیر میں محبان ندوۃ العلماء کی امیدوں کے مرکز مولانا جعفر مسعود حسنی نے ناگہانی طور پر داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! اللہ ان تمام حضرات کی تربتوں پر اپنی خاص رحمت نازل فرمائے۔ آمین!

احقر کی مولانا جعفر مسعود حسنی مرحوم سے صرف دو ملاقاتیں ہوئیں، لیکن وہ اپنی سادگی و پرکاری سے دل میں گھر کر گئے تھے۔ سن ۲۰۲۳ء میں تعطیلات میں وطن آنا ہوا تو مادر علمی کا بھی رخ کیا، عیدالاضحیٰ کی تعطیل کے سبب ندوۃ العلماء میں زیادہ ملاقاتیں نہ ہو سکیں اور مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی زیدہ مجدہٗ سے ملاقات کی غرض سے تکیہ رائے بریلی کا رخ کیا۔ بعد نماز جمعہ ملاقات سے فارغ ہوئے تو برادر مکرم عمر عثمان سے مولانا جعفر حسنی کے متعلق دریافت کیا، وہ ان کے مکان پر لے گئے، مولانا بہت خندہ پیشانی سے ملے، بہترین ضیافت فرمائی، میں نے اپنا ترجمہ کردہ ناول پیش کیا تو بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور مزید کام جاری رکھنے کو کہا۔ میں نے بتایا کہ تخصص فی الادب میں حضرت مولانا واضح رشید صاحب رحمہ اللہ کی زیر نگرانی فضیلت کا مقالہ لکھنے کی سعادت حاصل رہی ہے، تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اگر کل لکھنؤ میں رہو تو ندوہ آکر بھی ملاقات کرنا۔ میں ایسی خورد نوازی پر حیران تھا اور دل ہی دل میں مولانا کی عظمت وتوقیر بیٹھ گئی تھی، اگلے دن ندوہ جاکر ملاقات کی تو تپاک سے ملے اور بہترین گرین چائے سے ضیافت فرمائی، البتہ زیادہ بات چیت نہ ہو سکی کہ مولانا انتظامی و دفتری کاموں میں مشغول تھے، چلتے وقت آئندہ آنے کو بھی کہا۔

دوسری ملاقات گزشتہ سال ندوے میں ہوئی، میں اجازت لے کر داخل ہوا تو فوراً پہچان لیا اور خوشی کا اظہار کیا، پوچھا کہ کہاں ٹھہرے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ کہنے لگے کہ مہمان خانہ موجود ہے تو آپ لوگ وہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ یہ مہمان خانہ آپ ہی لوگوں (منتسبین ندوۃ العلماء) کے لیے ہے۔ انتظامی امور کے سلسلے میں دفتر میں آوا جاہی بہت تھی، اس لیے ہم نے رخصت چاہی اور مولانا نے مسکرا کر دوبارہ آنے کو کہا۔ کسے معلوم تھا کہ اب کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی اور یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوگی۔

مولانا کی زبان وقلم پر گرفت، اپنے والد بزرگوار کی طرح ادبی وفکری موضوعات پر گہری نگاہ اور اسلامی صحافت کے میدان میں جلیل القدر خدمات سے تو سب واقف ہیں، البتہ مجھے ذاتی طور پر ان کی جن صفات نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کی سادگی، تواضع، خوش اخلاقی، استغناء و بے نیازی اور خرد نوازی جیسی صفات ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، ہم پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ندوۃ العلماء کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

☆☆☆☆☆

☆مقیم حال مالدیپ

علم وادب کی آبرو

ڈاکٹر محمد انس ندوی☆

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی بھی اس جہان فانی سے رخصت ہو کر دار بقاء کو سدھار گئے۔ عزیمت واستقامت کی علامت، بڑے علماء اور قابل احترام اولیاء کے پاس پہنچ گئے۔ اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ مرحوم بڑی خوبیوں اور گونا گوں صفات حمیدہ کے مالک تھے، بلا مبالغہ وہ ندوہ کے علماء افاضل اور حسنی خانوادہ کے علم وعمل کے وارث تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء نے علم وفضل، اخلاص وعمل، زہد وورع، تقوی وتدین کے حامل افراد کا جو قافلہ تیار کیا تھا، مولانا جعفر مسعود اسی قافلے کے ہم سفر تھے۔

مولانا جعفر حسنی ندوی رحمہ اللہ کی اس طرح اچانک جدائی بہت صبر آزما ہے، پورے خاندان محبین ومتعلقین، ندوہ کے اساتذہ وطلبہ سب ہی کو اس انتہائی اندوہ ناک حادثہ کی خبر نے ایسے سکتے میں مبتلا کر دیا کہ نہ کچھ کہتے بن پڑ رہا ہے اور نہ ہی کچھ سننے کا حوصلہ رہا، مرضی مولا یہی تھی کہ انہیں شہادت کی موت سے سرفراز کیا جائے اور عند اللہ انہیں عظیم اعزاز واکرام سے نوازا جائے، شہداء کی صف میں شامل کر کے انہیں بلند درجات عطا کیے جائیں۔

گردش لیل ونہار میں یہ حقیقت مجسم شکل میں نظر آتی ہے کہ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے موت کا مزا چکھنا ہے۔

لیکن جو لوگ اپنے آپ میں ایک انجمن ہوتے ہیں، علم وعمل، رشد وہدایت کا روشن مینار ہوتے ہیں، بلند اخلاق ومثالی کردار کا سراپا ہوتے ہیں، ان کا اس دنیا سے رخصت ہونا، تنہا ایک فرد کا جانا نہیں ہوتا بلکہ ان کے ساتھ ایک عہد کا خاتمہ ہوتا ہے، پوری انجمن کا بکھر جانا ہوتا ہے۔ یہ نفوس قدسیہ پوری قوم کا عظیم سرمایہ، ملک وملت کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔ مولانا جعفر مسعود کی الم ناک جدائی پر ہم سب تعزیت کے مستحق ہیں کہ یہ نقصان ہم سب کا ہے اور اس رنج والم میں ہم سب ہی مبتلا ہیں، مصیبت وآزمائش کا کوہ گراں ہم سب پر گرم ہے۔

مولانا علم وتحقیق، تحریر وبیان قلم وقرطاس کے تئیں احساس ذمہ داری میں اپنے والد محترم کے سچے جانشین تھے، عزم وہمت حق گوئی وبے باکی، امانت ودیانت، ایثار وقربانی میں اپنی مثال آپ تھے، مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ وہ سرمایہ ملت کے نگہبان، علم وادب کی آبرو اور اپنے اکابر واسلاف کی روایات کے امین تھے۔ مولانا کا تواضع، سادگی، زہد وقناعت بے مثال تھا، ہر ایک سے بے انتہا محبت واپنائیت سے پیش آتے، بڑے تو بڑے اپنے سے چھوٹوں سے بھی بے حد ادب واحترام سے پیش آتے، پاکیزہ کلامی وشگفتہ زبانی ان کی پہچان تھی، مرحوم کا خطابی اسلوب بے انتہا مؤثر اور دل موہ لینے والا ہوتا، جس نے بھی ان کے مختصر ودوٹوک اور علم وحکمت سے پر ریکارڈ کیے ہوئے بیانیہ سلسلہ کو سنا ہے میرے اس احساس میں میرا ساتھ دے گا۔ تعلیم وتدریس کے فن سے بخوبی واقف تھے، دوران تدریس عام فہم وآسان اسلوب وزبان اختیار کرنے اور دلچسپ انداز وبیان میں ان کی مثال پیش کی جاتی۔ وہ ایک کامیاب مدرس، ماہر فن مربی عظیم صحافی تھے، اردو وعربی زبان میں ان کے مضامین اور اداریے علم وتحقیق، اخلاق وادب اور معیاری صحافت کے امین ہوتے۔ بہت کم گو، بظاہر خاموش طبیعت، بباطن ہجوم افکار میں محو نظر آتے، میری ان سے ملاقاتیں بہت کم ہوئی ہیں، لیکن جب بھی ملا ان کے بارے میں بہترین تاثرات لے کر اٹھا۔ ہر دل عزیز اور محبوب ترین استاذ مکرم مولانا واضح رشید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے تھے، جب بھی ان سے ملتا، ان کے پاس بیٹھتا، استاذ محترم بہت یاد آتے، ایسا لگتا کہ ان کی روح بھی اس ملاقات میں شامل ہوگئی ہے۔ میری ملاقات مولانا جعفر صاحب سے ۲۰۲۴ء کے دوسرے ہفتے میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں ہوئی، کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات آخری ملاقات ہوگی، بڑی محبت وتپاک سے ملے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے ذریعے ایک کتاب کی طباعت میں پورا تعاون فرمایا، متعلق وذمہ دار حضرات سے ملاقات کروائی اور ہدایات دیں۔

یقیناً یہ حضرات دین کے مینارہ نور تھے جن سے بے شمار دینی مشعلیں روشن ہوئیں اور مستقبل میں روشن ہوتی رہیں گی۔ ان کی روشن کی ہوئی نورانی قندیلیں ان شاء اللہ ہمارے لیے راہ نجات روشن کرتی رہیں گی۔ اللہ رب العزت ان کے نقش قدم پر چل کر ہمیں دین، اخلاق، تقوی علم وادب، زہد وقناعت، حلم وتواضع کا دامن تھامے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا یہی ہے کہ جعفر بھائی کی اللہ کامل مغفرت فرمائے، جنت الفردوس کو مرحوم کا ٹھکانہ بنائے، انبیاء وصدیقین اور شہداء کی رفاقت سے نوازے اور تمام پس ماندگان، عزیز وقریب، احباب ومتعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔

☆☆☆☆☆

☆جنرل منیجر اے این آئی سی حلال اتھارٹی، آسٹریلیا

یاد آتی ہیں تری باتیں.......

مولانا اسماعیل بھولا ندوی☆

۱۵؍جنوری ۲۰۲۵ء کی شام کو جب مولانا جعفرمسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی خبر ملی تو کچھ دیر کے لیے ایک سکتہ سا طاری ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی ناقابل یقین خبر تھی کہ دل ودماغ اور ذہن تھوڑی دیر کے لیے بالکل معطل ہوگئے۔

مولانا جعفر صاحبؒ کی شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن سے کم نہ تھی، وہ ہمارے بزرگ بھی تھے اور ایک بے تکلف دوست بھی، وہ ہمارے بڑے سرپرست بھی تھے اور ایک شفیق بھائی بھی۔ یوں تو ان سے ہمارا بڑا اقدیم تعلق رہا ہے لیکن جب ندوہ آمد ورفت کی کثرت ہوئی اور خاص طور سے پیرومرشد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کے انتظام وانصرام میں ان کے ساتھ دن رات کا واسطہ پڑا تو ان کی شخصیت کے مختلف پہلو بہت کھل کر سامنے آئے۔ ان کی شخصیت میں سادگی وبے نفسی، تواضع وفروتنی، کم گوئی وخوش مزاجی جیسے اعلیٰ اوصاف دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ بلاشبہ انہوں نے اپنے عم مکرم حضرت مولانا رابع صاحبؒ اور والدمحترم حضرت مولانا واضح رشید صاحبؒ کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر بحسن وخوبی بالکل جذب کرلیا ہے۔

مولانا جعفر صاحبؒ ایک بڑے صحافی اور عربی واردو ادب کے ماہر تھے، لکھنا پڑھنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا اور وہ اسی کے آدمی تھے، انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تدریس کے ساتھ انہی کاموں میں گذارا۔ تمام کاموں سے دور، شہرت سے دور، اجلاس کے ہنگاموں سے دور ہوکر انہوں نے بڑی گم نامی کی زندگی گذاری اور قلمی میدان میں پوری عمر خدمات انجام دیتے رہے۔

ان کے اوپر اصلاح ودعوت کی گویا ایک دُھن سوار تھی، ہر وقت ان کا ذہن ودماغ صرف ندوہ یا امت ہی کی فکر کے لیے چلتا رہتا تھا، اسی لیے انہوں نے ندوہ کا ناظر عام بننے کے بعد ہند وبیرون ہند کے تسلسل سے دعوتی اسفار کیے اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے لوگوں کو خوب نفع پہنچایا۔

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد ایسا لگتا تھا کہ شاید اب ندوہ کا انتظام وانصرام سنبھلنے میں ایک زمانہ لگ جائے گا، مگر خدا گواہ ہے کہ ان کی دوررسی اور معاملہ فہمی نے ندوہ کو بہت فائدہ پہنچایا۔ میں اکثر کہتا تھا کہ الحمدللہ حضرت کی وفات کے بعد ندوہ کو آفتاب وماہتاب کی شکل میں یہ دو شخصیتیں ملی ہیں یعنی حضرت مولانا بلال عبد الحی حسنی ندوی مدظلہ اور مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ۔

ندوہ کے لیے ان کی شبانہ روز مخلصانہ محنتوں کا حال یہ تھا کہ وہ اس کی خاطر اپنی صحت اور طبیعت کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے اور ایک خادم کی حیثیت سے ہمہ وقت تن من دھن سے ندوہ کے لیے وقف ہوگئے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی کسی بات کو حتمی قرار نہیں دیا اور نہ ہی ان کا یہ مزاج تھا کہ وہ اپنی کسی بات پر اصرار فرماتے؛ بلکہ انہوں نے ہمیشہ ناظم صاحب کی رائے کو ترجیح دی۔ وفات سے دو روز قبل ان کا یہ حال تھا کہ انہوں نے ہر دن مسلسل چار پانچ گھنٹے بیٹھ کر ندوہ کے ہر ہر شعبہ کا مستقل طور پر جائزہ لیا اور ان کے سلسلے میں اپنی مفید آراء وتجاویز کو پیش کیا۔ اس کے علاوہ پورے احاطہ ندوہ کا چل کر جائزہ لیا، علامہ شبلی نعمانی لائبریری بھی تشریف لے گئے اور اس کا بڑی دلچسپی سے معائنہ فرمایا، وہاں انہوں نے جدید وسائل اختیار کرنے کی مفید باتیں کیں اور بڑی عمدہ ہدایات فرمائیں۔ پھر وہ دفتر نظامت بھی تشریف لے گئے اور وہاں بھی ایک ایک چیز کا مطالعہ کیا اور مشورہ دیا کہ یہاں ایک استقبالیہ دفتر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار ایسی ہدایتیں اور آراء ومشورے دیے جن سے ادارے کی تعلیمی وتربیتی اور معاشی ترقی وابستہ ہے۔

کسے معلوم تھا کہ ندوہ کا یہ ماہتاب اتنی جلد غروب ہوجائے گا اور آخرت کا مسافر بن جائے گا۔ اسی لیے وہ اپنے حصے کا کام اس قدر جلد مکمل کرنے میں منہمک ہیں اور غیر شعوری طور پر وہ ہمیں اپنی آخری وصیتیں سنا رہے ہیں۔ گویا ان کی نگاہ دوربین نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ”وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے“۔

آج جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے تو ان کی یادوں کا ایک ہجوم ہے جو کسی طرح ذہن ودماغ سے دور نہیں ہوتا اور جو اعصاب پر ایسا طاری ہے کہ کسی چیز میں لذت محسوس نہیں ہوتی۔ مولانا کی کس کس ادا کو یاد نہ کیا جائے، میرے لیے وہ منظر کتنا زیادہ الم ناک ہے کہ جب میں ابھی ان کی وفات سے ایک دن پہلے ممبئی جانے لگا تو وہ ہزار بار منع کرنے کے باوجود مجھے ایئرپورٹ تک رخصت کرنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ ان کا اخلاق تھا کہ وہ اس سلسلہ میں ذرا بھی کسر شان محسوس نہیں کرتے تھے۔ میں گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اب شاید ان سے یہ میری آخری ملاقات ثابت ہوگی اور اس کے بعد شاید اب کبھی دوبارہ اس

☆ رکن مجلس انتظامی ندوۃ العلماء لکھنؤ

نورانی چہرے کا دیدار نصیب نہ ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مولانا کو بڑا اخاذ ذہن عطا فرمایا تھا، وہ ہر چیز کی گہرائی تک پہنچنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں اپنی محکم رائے رکھنے میں انہیں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی، انتظامی امور میں ایسے بہت سے معاملات پیش آتے ہیں کہ ان پر بہت غور وخوض اور توجہ ومشوروں کی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن ان کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ بنفس نفیس مشکل سے مشکل مسائل کو اپنی ذہانت و فطانت کی بنیاد پر اس طرح چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے جیسے وہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔

مولانا جعفر صاحبؒ کی تواضع وسادگی، اخلاق وملنساری مثالی تھی۔ان کی وفات کے بعد ہر ایک کی زبان پر ان کی شرافتِ نفسی کا تذکرہ ہے جو اس بات کی واضح مثال ہے کہ وہ ایک خدا رسیدہ انسان تھے، دراصل ان کے اندر دنیا سے بڑی بے نیازی تھی اور استغناء ان کا خاص وصف تھا، وہ بڑے ہی صاف گو اور صاف معاملہ رکھنے والے انسان تھے، ہر کسی سے اپنا معاملہ صاف رکھتے، ہر کسی سے خندہ جبینی کے ساتھ پیش آتے، ہر کسی سے جھک کر سلام کرتے اور اگر عمر میں ان سے بڑا کوئی شخص ملنے آتا تو اس کے لیے ہمیشہ اپنی جگہ چھوڑ دیتے اور جب تک وہ خود رخصت نہ ہوتا تب تک بیٹھے رہتے۔

مولانا جعفر صاحب رحمہ اللہ کی تخلیقی صلاحیتوں سے کس کو انکار تھا، چنانچہ جب انہوں نے خطابت کا سلسلہ شروع کیا تو اس میں ایسی برکت ہوئی کہ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ ان کو قبول کیا اور پورے ملک میں ان کی باتوں کو بغور سنا، ان کی تقریروں میں ملت کے لیے درد اور دین پر عمل کی روح ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ اگر انسان کی دین داری کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے پڑوس میں رہ کر یا اس کے ساتھ سفر کر کے اس کی دین داری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

الحمد للہ مجھے ان کے ساتھ ایک عرصے تک رہنے کا موقع ملا، میں نے ان کے دن رات بھی دیکھے، خلوت وجلوت کو بھی دیکھا اور میں نے ان کے ساتھ بے شمار اسفار بھی کیے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے انہیں ہمیشہ ایک شریف النفس، پاک دل اور پاک باز انسان پایا۔اگر سفر کے اندر انہیں تکلیف ہوتی یا جس جگہ کا سفر ہوتا اور وہاں خاطر خواہ انتظامات نہ ہوتے، تو وہ ایسا کوئی طریقہ اختیار ہرگز نہیں کرتے تھے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ بات ان کے خلافِ مزاج ہوئی ہے بلکہ وہ ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہوئے ہی وہاں سے رخصت ہوتے۔ان کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ پروٹوکول کی دنیا سے بالکل دور تھے اور انہیں ہٹو بچو کی رسوم سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ عزلت نشینی میں عافیت سمجھتے تھے اور اسی کو پسند کرتے تھے۔

مجھے ان کے ساتھ جن اسفار میں ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا، تو میں نے دیکھا کہ وہ اثنائے سفر زیادہ تر خاموش رہتے، لبوں پر تبسم بکھرا ہوا رہتا، ادھر ادھر کی دنیاوی باتوں سے محتاط رہتے، اگر تکلم فرماتے تو کوئی دینی بات یا ندوہ کے تعلق سے کوئی مشورہ، ورنہ آہستہ آواز میں مسلسل تلاوتِ قرآن مجید کے اندر مشغول رہتے۔کم گوئی ان کی عادت تھی، جب بولتے تو مختصر بولتے مگر بڑی محکم اور جامع بات ارشاد فرماتے، اگر ان سے کوئی مخاطب ہوتا تو ایک طالب علم سے بھی بڑھ کر سعادت مندی اور خندہ جبینی کے ساتھ اس سے محو گفتگو ہو جاتے اور یہ ان کی وہ ادا تھی جسے دیکھ کر سب ان کے عاشق ہو جاتے تھے۔

مجھے ان کی معیت میں علی گڑھ حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ کی خدمت میں دو مرتبہ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی جن میں سے دوسری مرتبہ ابھی وفات سے چند روز پہلے مجھے ان کی معیت میں علی گڑھ کے سفر کا موقع ملا تو میں نے ان کی دین داری کا اور بھی مشاہدہ کیا، وہ علی گڑھ میں ندوہ کی ایک شاخ میں مدعو تھے، وہاں وہ تشریف لے گئے اور بڑی عمدہ نصیحتوں سے مستفیض کیا، پھر اس کے بعد وہ شدید تکان کے باوجود علی گڑھ میں مقیم حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب دامت برکاتہم کے یہاں بھی نیاز مندانہ حاضر ہوئے اور ان کی توجہات ودعائیں حاصل کیں۔حضرت حکیم صاحب کی آپ کو بڑی شفقتیں اور عنایتیں حاصل تھیں، حضرت حکیم صاحب ان سے فرماتے تھے کہ یہ تمہارا گھر ہے، تمہارے یہاں آنے سے دلی خوشی ہوتی ہے۔ان کے لیے حضرت حکیم صاحب کی محبت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے مولانا کا قیام اس حجرہ میں کرایا جو حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جائے قیام تھا اور انتہائی خیال بھی فرمایا۔

مولانا جعفر صاحبؒ کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے کبھی خود کو کسی سے بڑا نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو چھوٹا بنا کر پیش کیا اور خود رائی کے مرض سے وحشت محسوس کی۔نہ عہدہ ومنصب اور نہ ہی خاندانی نسبت کا ان کے اندر کبھی گھمنڈ آیا اور نہ ہی کبھی اس کا اظہار کیا۔مولانا کو خاص طور سے میں نے دیکھا کہ شب بیداری بھی ان کا خاص وصف تھی، الحاح وزاری اور اللہ سے لو لگانے میں وہ سو فیصد اپنے اسلاف کے نقش قدم پر تھے۔آج ان کی ناگہانی موت نے ایک بہت بڑا خلا پیدا کر دیا ہے، ہر ایک غمگین واداس ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے جنہوں نے مختصر سے عرصے میں برسوں کا کام کر دیا اور ندوہ کی بنیادوں کو کم وقت میں بہت حد تک مضبوطی بخش دی۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔آمین!

☆☆☆☆☆

'……لیکن تو چیزے دیگری'

مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی☆

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی اب ہمارے درمیان نہیں رہے، انہوں نے اس وقت آخرت کے لیے اچانک اپنا رخت سفر باندھ لیا اور روانہ ہو گئے جب کہ ہم سب کو بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو ان کی سخت ضرورت تھی، گذشتہ کئی سالوں سے ملک وملت کے بڑے بڑے دینی وعلمی اور فکری رہنما یکے بعد دیگرے وفات پا رہے تھے، ایسی حالت میں ان بزرگوں کی جگہ پُر کر کے ملت کی زمام قیادت تھامنے والوں میں مولانا جعفر مسعود ندوی صاحب کا بہت اہم کردار تھا، مسلمانان ہند اور خاص طور پر مادر علمی ندوۃ العلماء کے فکر ومنہج اور طریقہ کار سے وابستہ اور ذہنی طور پر منسلک لوگوں کے لیے امید وحوصلہ کی کرن تھے جعفر بھائی، اپنے والد گرامی حضرت مولانا سید واضح رشید ندوی اور مرشد ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہما اللہ کے بعد ان کے جانشین کے طور پر دیکھے جا رہے تھے، مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کے سر پر جب اربابِ شوریٰ نے ندوۃ العلماء کی نظامت کا تاج سجایا اور ساتھ ہی ساتھ جعفر بھائی کو ناظر عام ندوۃ العلماء کی ذمہ داریوں سے بھر پور منقش چار اوڑھائی تو ہم جیسے ہزاروں فرزندان ندوہ کو یقین ہو چلا تھا کہ ندوۃ العلماء محفوظ، مضبوط اور مقبول ہاتھوں میں سونپا گیا ہے، فکر واندیشہ کی کوئی بات نہیں ہے، ورنہ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ناظم ندوۃ العلماء کی رحلت کے بعد ذہنوں میں وسوسے جنم لینے لگے تھے کہ اب ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم کا مستقبل کیا ہوگا؟ لیکن ان دونوں نئے ذمہ داران نے جس اعتماد ویقین اور توکل علی اللہ کی اساس پر نظامت اور ناظر عام کی اہم ترین ذمہ داریوں سے بھر پور مناصب کو مجلس انتظامی (شوریٰ) کے اصرار وانتخاب پر قبول کیا اور ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہی اپنے آپ کو دار العلوم ندوہ اور تنظیم ندوۃ العلماء کی تعمیر وترقی، استحکام وانتظام کے لیے وقف کر دیا تھا، اس کے اثرات وثمرات چند ماہ کے اندر ہی نمایاں طور پر نظر آنے لگے تھے، ندوۃ العلماء جیسی اہم مسلمانوں کی بین الاقوامی سطح پر معروف علمی ودینی، دعوتی واصلاحی، اور فکری وتربیتی امانت کو لوگوں نے نہ صرف امانت دار ہاتھوں میں دیکھا بلکہ اس کو اپنی سابقہ روایات کے ساتھ مضبوط ہوتے آگے بڑھتے اور منظّم ہوتے پایا، تو ہر دل مطمئن اور خوش تھا کہ اچانک ۱۵؍جنوری ۲۰۲۵ء بروز بدھ بعد مغرب وہ سانحہ پیش آ گیا جس نے اس اطمینان وسکون کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی، جیسے ہی سوشل میڈیا پر آگ کی طرح یہ خبر وائرل ہونے لگی کہ مولانا جعفر مسعود حسنی کو رائے بریلی میں سڑک پر ایک کار نے شدید ٹکر ماری اور وہ جائے حادثہ پر ہی جاں بحق ہو گئے انا للہ وانّا الیہ راجعون، یہ خبر نہیں بلکہ وہ برق تپاں تھی جس نے لمحوں میں اسلامیان ہند کے بہت بڑے طبقہ کے خرمن سکون کو خاکستر کر دیا، جس نے سنا، ساکت وجامد کھڑا رہ گیا، ہوش وحواس باختہ اور دل شکستہ ہو گئے، لیکن خبر میں صداقت تھی، انکار کی گنجائش بالکل نہ تھی، اس لیے ایمان نے پکار لگائی: "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ"

یہی نظام قدرت ہے اور حقیقت ہے کہ جو اس دنیا میں آتا ہے وہ ایک دن بالیقین یہاں سے جاتا ہے کب، کیسے، کس جگہ، کس حالت میں یہ سب وہ ذات واجب الوجود ہی جانتی ہے جو ازل سے ہے، وہی پیدا کرنے والی اور موت سے ہم کنار کرنے والی ہے، اس نے فرمایا ہے: "وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ"۔

مولانا جعفر حسنی ندویؒ ہمارے لیے جعفر بھائی تھے، درسی ساتھی اور بے تکلف دوست، ہم نے ایک ساتھ ندوۃ العلماء کے ماحول اور فضا میں کئی سال گزارا ہے، ہمارا ایک گروپ تھا جس نے ہم سب کو محبت والفت، رواداری وغمگساری اور بے تکلفی کی مضبوط ڈور میں باندھ رکھا تھا، یہ تعلق اتنا مضبوط اور خلوص وللّٰہیت، احترام ذات پر مبنی تھا کہ چالیس پینتالیس سال کے بعد افتراق اور خانگی وملازمتی مصروفیات کے باوجود بھی باقی تھا، ادھر دس سالوں سے وہاٹس اپ گروپ دیوان الندویین اور ملتقی الندویین کے توسط سے اس تعلق میں وسعت و شدت بھی پیدا ہو گئی تھی، جعفر بھائی میرے ساتھ اس کے ایڈمن پینل میں شامل تھے، اس گروپ کے بانی مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی- آکسفورڈ ہیں، جنھوں نے گذشتہ ساتویں آٹھویں دہائی کے دار العلوم ندوۃ العلماء کے تمام دوستوں کو یہ گروپ بنا کر یکجا کر دیا۔

مولانا جعفر مسعود حسنی جن کو ہم احباب بے تکلفی اور محبت میں جعفر بھائی کہتے تھے اور وہ بھی اپنے تمام تر بلند مناصب اور عہدوں کے باوجود ہمیشہ ضیاء الدین بھائی کہہ کر مخاطب کرتے، کبھی ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ اب وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظر عام ہیں، ادب واحترام کے ساتھ ان سے ملا جائے، بلکہ ان کی بے تکلفی اور رواداری اس ذمہ داری کے ساتھ ہمارے لیے اور زیادہ بڑھ گئی تھی، یہ ان کی

☆خیرآباد، مئو

خاندانی شرافت ونجابت، اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، وسعت قلبی، اعلیٰ ظرفی تھی، یہی اس علم الٰہی حسنی خانوادہ کے ہر چھوٹے بڑے فرد کی اسلامی ثقافتی اور تربیتی شناخت ہے، اس خمیر میں تکبر وریاء اور نمود کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پایا جاتا، ہم نے چالیس سالہ رفاقت ومحبت کے دوران بار بار جعفر بھائی سے ملاقاتیں کیں، فون پر دیر دیر تک باتیں کیں، مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کیے، کسی موقع پر یہ احساس ہوا ہی نہیں کہ جعفر بھائی میں کچھ اخلاقی تبدیلی ہوئی ہے، لب ولہجہ میں فرق آیا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، تدریسی پختگی آتی گئی اور تدریس سے ریٹائرمنٹ کے بعد ندوۃ العلماء کے ناظر عام جیسا اہم اور بڑا منصب تفویض کیا گیا، جعفر بھائی میں تواضع وانکساری بڑھتی گئی، ندوۃ العلماء میں ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک یہ راقم سطور طالب علم کی حیثیت سے مقیم رہا، اس وقت کبار اساتذۂ کرام کی ایک ایسی کہکشاں تھی جن کو منتخب وچنیدہ مردم گرد مانا جاتا ہے، حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظامت وقیادت کا عہد زریں تھا، مولانا محب اللہ لاری ندوی علیگؒ جیسے مہتمم کا دور تھا، کلیۃ الشریعہ وکلیۃ اللغہ میں اپنے عہد وزمانہ کے مایۂ ناز اساتذہ تھے، جن کی عظمت کا آفتاب ایشیاء وافریقہ کو منور کر رہا تھا، عالم اسلام میں ندوۃ العلماء کی عظمت واہمیت کا ہر طرف اعتراف کیا جا رہا تھا، امام کعبہ اور شیخ یوسف قرضاوی، شیخ ابوالفتاح ابوغدہ جیسے نہ جانے کتنے جہابذۂ عصر کے محاضرات وخطبات سے ہم طلبہ سیرابی حاصل کرتے تھے، حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، شیخ عبدالنور عبدالعظیم ازہری، مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری جیسے مثالی اور منفرد و اسلوب وطرز تدریس کے اساتذہ کلیۃ اللغۃ میں جلوہ افروز تھے تو کلیۃ الشریعۃ میں شیخ الحدیث مولانا عبدالستار اعظمی، مولانا ضیاء الحسن ندوی، مولانا شہباز اصلاحی ہندی، شیخ ناصر حسین، مولانا شفیق الرحمٰن ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن سلطان پوری جیسے باکمال وماہر فن اساتذہ تھے جو تفسیر وحدیث کے رموز واسرار اور مسائل واحکام سے طلبہ کی ذہن سازی فرما رہے تھے۔

طلبہ بھی منتخب ہوتے، باذوق، بلند خیال، محنت کش اور ذہن وسلیقہ مند ہماری ایک ٹیم بن گئی تھی، مولانا جعفر مسعود حسنی، ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، مولانا حشمت اللہ ندوی مرحوم، مولانا عبد الحی چمپارنی ندوی مقیم حال قطر، مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی (شارجہ)، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، مولانا آفتاب عالم اعظمی ندوی (قطر)، مولانا خالد کانپوری ندوی (دبئ) ہمارے سینئر تھے، مولانا عرفان حسنی ندوی، خورشید انور ندوی، شعیب اسلم وغیرہ، ہم سب اسی ماحول کے پروردہ ہیں، جس میں علم وادب کا شہرہ تھا، صحافت وخطابت کے جلوے تھے، محبت وپیار کی رعنائیاں تھیں، شائستگی وشرافت کی فضا تھی، الاصلاح اور النادی کی سرگرمیاں تھیں، ایک سے بڑھ کر ایک ذہین وفطین اور شعر وسخن، زبان وادب کے رسیا طلبہ تھے، جعفر بھائی کو پڑھنے سے زیادہ اس دور میں کرکٹ سے دلچسپی تھی؛ لیکن ذہانت اور قوت حافظہ اس غضب کا، اس پر زبان وادب سے موروثی خاندانی تعلق کہ کھیل وکود کی دنیا نے ان کے اخلاق وکردار پر ذرہ برابر اثر نہیں ڈالا، وہ مطالعہ کے شوقین تھے، اردو وادب میں مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے طرز نگارش پر فریفتہ اور ان کی تحریروں کے شیفتہ عربی ادب تو خاندانی ذوق ومزاج تھا، "الرائد" کے صفحات ان کے عربی مضامین سے مزین ہوتے تھے، عربوں کا لب ولہجہ اسلوب و انداز روانی، سلاست، فصاحت اور موضوع کی گہرائی ان کے عربی مضمون کی شناخت ہوتی تھی، یہاں تک کہ جب وہ مدرس ہوئے تب بھی "الرائد" سے تعلق قائم رہا، پھر تو وہ مدیر التحریر بنا دیئے گئے اور "الرائد" میں "براعم الایمان" کے عنوان سے انھوں نے نو عمر طلبہ کی ذہن سازی کا جو آغاز کیا تو ہزاروں طلبہ کو قلم پکڑتے اور عربی میں مضمون لکھنے کا سلیقہ وشعور بخش دیا، جب ہمارے محسن ومربی مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ کی وفات کے بعد "الرائد" کے رئیس التحریر کا منصب سونا سونا سا ہو رہا تھا، حضرت مولانا سید محمد رابع ندویؒ نے بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء جعفر بھائی کو "الرائد" کا رئیس التحریر یعنی چیف ایڈیٹر بنا دیا، میں یہاں پر مرشد امتؒ کے ہی الفاظ جعفر بھائی کے بارے میں تبرکاً پیش کرتا ہوں کہ ان کی زبان وادب پر ہمارے اساتذہ کبار کو کتنا اعتماد تھا جو خود بین الاقوامی ادیب مانے جاتے تھے:

"عزیز مولوی جعفر مسعود حسنی ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء کے فاضل اور عربی جریدہ "الرائد" کے چیف ایڈیٹر اور تدریسی تجربہ رکھنے کے ساتھ اردو زبان وادب اور صحافت کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور عالم اسلام کے حالات کا بھی اچھا مطالعہ رکھتے ہیں انھوں نے اپنے مضامین میں جو طریقہ اور اسلوب اختیار کیا ہے وہ اثر انگیزی رکھتا ہے، ان کے مضامین "راشٹریہ سہارا" اور "تعمیر حیات" کے مختلف شماروں میں شائع ہونے اور بعض دوسرے رسالوں میں بھی اس طرح انھوں نے اس ذریعہ سے اپنی آواز ملت اسلامیہ کے مفاد کے لیے دور تک پہونچانے کا کام کیا ہے"۔

ہم احباب تو جعفر بھائی کے اخلاق وکردار، ادب وصحافت، خطابت اور اسلوب کی سلاست کے معتقد ومعترف ہیں ہی، ذرا یہ دیکھیں مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء مخدومنا الکریم ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن

اعظمی ندوی دامت برکاتہم اپنے شاگرد رشید کے بارے میں کیا فرما رہے ہیں، ان کی شہادت کے بعد تعزیتی مضمون میں مہتمم صاحب رقم طراز ہیں:

"مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر کے ساتھ تقریر وخطابت میں بھی امتیاز رکھتے تھے، وہ ندوۃ العلماء کے ناظر منتخب ہونے کے بعد متعدد جلسوں میں شریک ہوتے اور ان میں اپنے بیانات سے سامعین کو مستفید کرتے تھے، میں نے ان کے انتقال پر اپنے ایک پیغام میں کہا ہے کہ مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی ایک باکمال ادیب، اچھے خطیب، کامیاب استاذ اور کہنہ مشق صحافی تھے، انھوں نے اپنے والد کی نگرانی میں عربی صحافت میں کمال پیدا کیا تھا، وہ صحافیانہ مہارت کے ساتھ عربی رسالہ نکال رہے تھے، ان کے اخلاق میں نرمی اور تواضع تھی، وہ جب بھی ملتے محبت واپنائیت کے احساس کے ساتھ ملتے، ان کا حادثۂ وفات میرے لیے اور ندوۃ العلماء کے لیے گہرے صدمے کا باعث ہے"۔

جعفر بھائی جب ناظر عام بنائے گئے تو کسی کو بھی ان کی بے پناہ انتظامی صلاحیت کا احساس نہیں تھا، ہم احباب نے کبھی ان کو کوئی انتظامی ذمہ داری نبھاتے نہیں دیکھا تھا، ایک ادیب کی روشن ونمایاں شبیہ ہی ہمارے خانۂ دل میں آویزاں تھی اور اخلاق و اخلاص کا سراپا ہی ہمارے ذہن میں تھا، لیکن چند ماہ کے اندر ہی ان کی انتظامی صلاحیتوں کے جوہر نے ان کو ہمارے سامنے ایک تجربہ کار، دور اندیش اور فکرمند منتظم کی شکل میں لا کھڑا کیا، دل پر خوشیوں کی برسات ہونے لگی تھی، ندوۃ العلماء لکھنؤ کو ایک ایسا ناظر عام مل گیا ہے، جس نے چند مہینوں میں ہی اساتذہ کرام اور ملازمین کو اپنا گرویدہ اور ثناخواں بنالیا ہے، نظام میں کئی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں، مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ کو ایک طاقتور بازو مل گیا ہے، صائب الرائے مشیر اور بلند حوصلہ معاون دستیاب ہوگیا ہے، خود مولانا سید بلال حسنی ندوی دامت برکاتہم نے مجھ ناچیز سے فرمایا کہ جعفر بھائی نے اتنی فرصت اور آزادی فراہم کردی ہے کہ ہم بے فکر ہوکر ندوہ کے مفاد کے لیے سفر کرسکیں، لوگوں سے مل سکیں اور اطمینان رہے کہ ہماری عدم موجودگی میں ندوۃ العلماء میں سب کچھ چست ودرست چل رہا ہے"۔

وہ اپنے تعزیتی بیان میں بھی لکھتے ہیں:

"جعفر بھائی ہم سے عمر میں نو(۹) سال بڑے تھے، اس لیے ہم ان سے کہتے تھے کہ آپ ہمارے سرپرست ہیں اور واقعۃً انھوں نے اس کا حق بھی ادا کردیا جب ضرورت سمجھی تنبیہ بھی کی، وہ بڑے صائب الرائے تھے، اکثر امور میں ہم ان ہی سے مشورہ کرتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی عم مخدوم ومعظم حضرت مولانا رابع صاحب بھی ان سے مشورہ کرتے تھے، اور ان کی رائے کو فوقیت دیتے تھے، الحمدللہ ندوہ کے کاموں میں ان کا بہت ساتھ رہا، ان سے بڑے مشورے بھی حاصل ہوتے رہے اور بہت فائدہ پہنچا، انتقال سے تین دن پہلے ہم اور مولانا اسماعیل بھولا ندوی ان کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے اور بہت سے امور پر ان سے مشورے ہوتے رہے گویا ان کا وہ بیٹھنا ایک وصیت تھی کہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل کیا ہو، سچی بات یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی چیزوں کو پوری طرح سنبھال لیا تھا اور گویا ہم کو بالکل فارغ کردیا تھا"۔

جعفر بھائی سے متعلق لکھنے بیٹھا تو یادوں کے دریچے نکلتے چلے گئے، بہت ساری باتیں ہیں، یادیں ہیں، داستانیں ہیں، کن کن کو حیطۂ قلم و قرطاس میں لایا جائے، فون پر ان سے اکثر باتیں ہوا کرتی تھیں، میں دو تین ماہ کے وقفہ سے مادر علمی ندوۃ العلماء حاضر ہوا کرتا تھا، جعفر بھائی میزبان ہوتے، اساتذہ کرام سے ملاقاتیں ہوتیں، محفل نا ونوش سجتی، کبھی یاسین کی مشہور بریانی سے قاری طٰہٰ اطہر ندوی میزبانی فرماتے تو کبھی جعفر بھائی اپنے گھر یا کسی ہوٹل میں ہم سب احباب کی ضیافت کا حق ادا کرتے، کبھی مولانا محمد وثیق ندوی کسی مشہور جگہ کی آئس کریم سے احباب کی محفل میں چار چار چاند لگاتے، کبھی سہانی رات میں ہم پارک کی مخملی ہری گھاس پر خوش گپیاں کرتے اور ماضی کی یادوں کو یاد کرکے ہنستے مسکراتے، ہر محفل میں جعفر بھائی خوش دلی سے شریک ہوتے، ذرہ برابر بھی خودنمائی، برتری کا اظہار نہیں ہوتا تھا، لب ولہجہ کی وہی مٹھاس جس کے ہم عادی تھا بعض خالص پرسنل باتیں بھی ہوتیں، مشورے ہوتے، ہر موقع پر ہم نے ان کو ایک مثالی انسان پایا، معتدل مزاج، جدید وقدیم روایتوں کا حامل، ندوی فکر ونظر پر کاربند، خانوادہ حسنی کے تمدن وثقافت اور تہذیب کا پیکر جمیل، اپنے والد بزرگوار اور خسر محترم (مولانا سید محمد رابع حسنی) کے اوصاف حمیدہ کو اپنے وجود میں اتار لینے والا دوستوں کا دوست پایا، جب برادر صغیر صلاح الدین کی وفات کا غم لاحق ہوا تو جعفر بھائی نے بڑی محبت اور دور وسوز کے ساتھ اپنے غم کا اظہار فرما کر تعزیت کی تسلی کے کلمات کہے، کیا خبر تھی تین دن بعد وہ خود ہم سب کو غموں کے طوفان میں سرگرداں، وحشت زدہ، شکست خوردہ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جنت کے مکین بن جائیں گے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم نے دل کی آواز کو صفحۂ قرطاس پر صداقت کے ساتھ اتار دیا ہے، وہی لکھا جیسا اپنے دیرینہ دوست جعفر بھائی کو پایا، دیکھا، برتا، سمجھا اور جانا، اور آخر میں نعت رسول کا یہ مشہور شعر ان کی نذر کرنے میں جامع تعارف سمجھ میں آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا جعفر حسنی فکر ونظر کے آئینہ میں

مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی ☆

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم گوناگوں صفات کے مالک تھے، وہ ایک کامیاب مدرس، عظیم مفسر، بلند پایہ صحافی، بلند مرتبت منتظم اور عربی اردو دونوں زبانوں کے صاحب طرز ادیب تھے۔

اس تحریر میں اردو ادب میں ان کی بصیرت اور ژرف نگاہی کا جائزہ لیا جائے گا۔

عربی زبان وادب میں جس قدر ان کو درک حاصل تھا، اس سے ہر کس وناکس واقف ہے۔ ''الرائد'' کے صفحات ان کی ادبی وفکری اور علمی صلاحیتوں کا بہترین مظہر ہیں۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی خانوادۂ حسنی سے تعلق رکھتے ہیں، یہ خانوادہ علم وفضل کا گہوارہ ہے، اس خانوادہ میں بہتیرے علماء ربانیین، صلحاء امت، شعراء اور ادباء نے جنم لیا ہے، مولانا سید جعفر مسعود حسنی مرحوم کے والد گرامی علیہ الرحمہ عربی اور اردو زبان کے صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔

استاذ گرامی مولانا سید محمد واضح رشید صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۳۳-۲۰۱۹ء) نے اپنے فرزند ارجمند مولانا سید جعفر مسعود حسنی مرحوم کی اس انداز میں تربیت کی کہ استاذ مکرم کی تمام فکری ادبی اور اخلاقی خوبیاں مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کی ذات میں جلوہ گر ہوگئیں۔

اردو ادب میں مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کی مہارت وپختگی پر گفتگو سے قبل ہم ادب کی تعریف کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی اردو ادب میں ید طولی رکھتے تھے اور ان کی تحریریں اردو ادب کی شاہکار ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۹۲۹-۲۰۱۹ء) ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب زندگی کے اظہار کا نام ہے، ادب چونکہ لفظوں کی ترتیب وتنظیم سے وجود میں آتا ہے، ان لفظوں میں جذبہ وفکر بھی شامل ہوتے ہیں، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ لفظوں کے ذریعہ جذبہ احساس یا فکر وخیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔''

آگے وہ مزید لکھتے ہیں:

''اسی تحریر کو ادب کہا جاسکتا ہے جس میں الفاظ اس ترتیب وتنظیم سے استعمال کیے گئے ہوں کہ پڑھنے والا اس تحریر سے لطف اندوز ہو اور اس کے معنی سے مسرت حاصل کرے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب لفظ ومعنی اس طرح گھل مل گئے ہوں کہ ان میں رس پیدا ہوگیا ہو، یہی رس کسی تحریر کو ادب بناتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

''اس مسرت کا تعلق ہمارے باطن میں چھپے ہوئے اس احساس سے ہوگا جس کا ہمیں ادراک ہوا ہے، یہ وہ تحریر ہوگی جس نے ہمارے شعور اور ہمارے تجربوں کے خزانے میں اضافہ کیا ہے اور ان دیکھے تجربات سے اس طرح مانوس کردیا ہے کہ وہ تجربے ہمارے تجربے بن گئے ہیں، یہ وہ تحریر ہوگی جس کا اثر وقتی اثر کا حامل نہیں ہوگا بلکہ اس میں ابدیت ہوگی اور جو زبان ومکان سے آزاد ہوکر آفاقیت کی حامل ہوگی، انہی خصوصیات کی وجہ سے مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ، کلام غالب، اشعار میر، تخلیقات شیکسپیئر اور مکالمات افلاطون آج بھی متاثر کرتے ہیں اور ہمارے تجربات وشعور میں احساس مسرت کے ساتھ اضافہ کرتے ہیں۔''

(بحوالہ چشم بیدار لاہور سن ۲۰۰۴ء)

ادب کی اس تعریف کی روشنی میں جب ہم مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ مولانا کی تحریر میں افکار کی بہتات بھی ہے اور جذبات کی روانی بھی، الفاظ کی ترتیب وتنظیم بھی ہے اور الفاظ ومعنی میں ارتباط نے ان کی تحریر کو دل کشی ورعنائی بخش دی ہے، ذیل میں ہم ان کی معرکہ آراء کتاب ''دعوتِ فکر ونظر'' سے ایک دو اقتباس پیش کریں گے تاکہ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کی ادیبانہ شان اور صنف ادب میں ان کی غیر معمولی دسترس کو واضح کیا جاسکے۔

ربیع الاول کے پیغام کے عنوان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر طائف کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''طائف کی گلیاں ہیں، آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پیچھے کفار کے لگائے ہوئے شر پسند اوباش لڑکے، پتھر آپ پر برساتے جارہے ہیں، جملے آپ پر کستے جارہے ہیں، ٹھٹھے آپ پر لگاتے جارہے ہیں، قدم مبارک لہولہان ہوچکے ہیں، دل کی کیفیت کا پوچھنا کیا لیکن زبان پر ایسا قابو اور جذبات پر ایسا کنٹرول کہ عقل حیران رہ جائے، نہ زبان سے کوئی سخت لفظ نکلتا ہے اور نہ بد دعا کے لیے ہاتھ اٹھتا ہے، فرشتہ منتظر ہے کہ اجازت ہو تو پہاڑوں کو ملاکر ان سرکشوں کا سرمہ بنا دیا جائے لیکن اس موقع پر بھی زبان مبارک سے جو کلمات نکلتے ہیں وہ محبت میں ڈوبے ہوئے اور

☆ مقیم متحدہ عرب امارات

رحمت میں گندھے ہوتے ہیں: "اللّٰھم اھد قومی فإنھم لا یعلمون" (اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما وہ جانتی نہیں۔) (دعوت فکر ونظر، صفحہ ۲۲)

اس تحریر میں الفاظ ومعانی اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ پڑھتے وقت قاری ایک عجیب سی لذت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ ان کی ایک اور تحریر پیش خدمت ہے۔ "ضرورت مطالبہ کی نہیں اپنے محاسبہ کی ہے" کے عنوان سے امت اسلامیہ کی ناکامی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم جگہ جگہ ناکام ہیں اور ہمیں اپنی ناکامی کا احساس بھی ہے اور ناکامی کے اسباب کی تلاش بھی، ناکامی کی ایک بڑی وجہ اگر یہ قرار دی جائے کہ ہم ریت کے ذرات کی طرح بکھرے ہوئے اور خود رو پودوں کی طرح ادھر ادھر اگے ہوئے ہیں تو شاید غلط نہیں ہوگا، ہمیں صرف اپنی ذات سے دلچسپی ہے، صرف اپنی عزت وشہرت اور دولت ومنصب کی فکر ہے، اپنی ذات کے خول سے جب باہر نکلتے ہیں تو اولاد تک پہنچ کر ہمارے قدم رک جاتے ہیں، خیال صرف یہ رہتا ہے کہ ہماری اولاد پڑھ جائے، جلدی سے کام میں لگ جائے اور ایک خوش حال اور آرائش وآسائش سے بھرپور زندگی گذارنے کا اسے موقع مل جائے، اولاد سے اوپر اٹھتے ہیں تو اپنی تنظیم، اپنی پارٹی، اپنی سوسائٹی اور اپنے ادارے میں محصور ہوکر ہر طرف سے اپنی آنکھیں موند لیتے ہیں، یہی ہماری سوچ کا دائرہ اور یہی ہماری فکر کا محور ہے۔"

آگے وہ مزید لکھتے ہیں:

"قرآن کریم نے فکر وتدبر اور عقل وشعور کے استعمال پر جتنا زور دیا ہے، ملت میں اس کا احساس بہت کم پایا جاتا ہے۔ افسوس کہ بعض دوسری قومیں عقل وشعور سے کام لینے میں ہم سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں، مگر انھوں نے اس ہتھیار کا استعمال صرف مادی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کیا ہے، ان کے برخلاف ہم نے عقل پر جذبات کو ترجیح دی اور یہی جذباتیت اب ہماری شناخت بن گئی ہے۔ جوش نے ہمیں دیوانہ اور ہوش سے ہمیں بیگانہ کردیا۔ جذباتیت کی رو میں بہنا ہی اب ہمارا شیوہ بن گیا ہے، نتیجہ اس کا شکست، ناکامی اور رسوائی کی شکل میں ہمارے سامنے آرہا ہے، ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ہانڈی کو تیز آنچ میں پکا کر جلا تو سکتے ہیں، لیکن اس کو دھیمی آنچ میں پکا کر کھانے کے لائق نہیں بنا سکتے، ہم ساری توقعات دوسروں سے رکھتے ہیں اور خود ان توقعات پر پورا اترنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔"

(دعوت فکر ونظر، صفحہ ۱۳۳-۱۳۴)

یہ دونوں پیراگراف اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم صاحب طرز ادیب تھے، ان کی نگارشات اور مقالات اردو ادب کے وہ گنج گراں مایہ ہیں جن میں لطافت بھی ہے اور چاشنی بھی۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کے اسلوب تحریر کی نمایاں خصوصیت اختصار ہے، وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسلوبِ تحریر کی وضاحت کے لیے میں اپنی کتاب "یاران مہر ووفا" کے ایک دو اقتباسات پیش کروں۔ راقم الحروف نے مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کے طرز تحریر کی کچھ یوں وضاحت کی ہے:

"مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کا اشہب قلم تیس برسوں سے رواں دواں ہے، ان کا طرز نگارش جداگانہ اور منفرد ہے، ان کے اسلوب تحریر کی نمایاں خصوصیت اختصار واستدلال ہے، وہ سیدھے سادھے لفظوں میں جملوں کی سادگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری جملوں کی لطافت وشیرینی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اپنے دعوے کی دلیل کے لیے ان کی تحریروں کے بعض اقتباس نقل کرتا ہوں۔ اپنے ایک معرکہ آراء مضمون "میڈیا - سچ یا جھوٹ" میں میڈیا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کبھی آپ نے سوچا کہ یہ میڈیا پرنٹ ہو یا الکٹرانک، کس کے اشارہ پر کام کررہا ہے، فائنانس اس کو کون کرتا ہے؟ اجارہ داری اس پر کس کی ہے؟ اب سنئے! یہ سچ ہے اور بالکل سچ کہ دنیا کے میڈیا کا ۹۶رفیصد حصہ صرف اور صرف چھ کمپنیوں کی ملکیت ہے اور وہ چھ کی چھ کمپنیاں یہودیوں Jews کی ہیں، دنیا کی سب سے بڑی کمپنی والٹ ڈیزنی Walt Disney ہے، اس کمپنی کے امریکہ میں سب سے زیادہ پروڈکشن ہاؤس ہیں، کمپنی کے پاس سات بڑے نیوز پیپرس، تین میگزین اور بڑا کیبل نیٹ ورک ہے، جس کے چودہ ملین صارفین ہیں۔ دوسری بڑی کمپنی Time Warner ہے، جس کی ملکیت ایچ بی او امریکہ کا سب سے بڑا ٹی وی کیبل نیٹ ورک ہے، اس کے علاوہ امریکہ کی سب سے بڑی میگزین ٹائم میگزین Time Magazine بھی اسی کی ملکیت ہے۔ یہ میگزین امریکہ میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا میگزین ہے، یہ کمپنی خالصتاً یہودیوں کی ہے۔ تیسری کمپنی Wai Com ہے اور ایم ٹی وی اسی کی ملکیت ہے، یہ لوگ نہ صرف میڈیا کو کنٹرول کر رہے ہیں بلکہ انسانی ذہنوں کو تبدیل کرنے کا کام انجام دے رہے ہیں، بچوں کے کارٹون چینل کے ذریعہ اپنے مخصوص انداز میں ہر گھر میں داخل ہوگئے ہیں، بچوں، بڑوں، خواتین ہر ایک کو اپنی

گرفت میں لے لیا ہے۔''

(دعوت فکر ونظر،صفحہ۲۷)

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کے اسلوب کی ایک نمایاں صفت انفرادیت، تجزیہ اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ اگر ہم مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کی تحریروں اور ان کے اسلوب نگارش کا باریکی سے جائزہ لیں تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ ان کی تحریروں میں مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے اسلوب نگارش کا عکس جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کی کتاب ''دعوتِ فکر ونظر'' کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں۔ آج کے مسلمانوں کے اصل مرض کی نشاندہی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''صحابہ کرام شریعت کے پیچھے چلتے تھے، ہم نعروں کے پیچھے چلتے ہیں، انھوں نے سر جھکایا پھر کٹایا، ہم شریعت کی بات پر سر کٹانے کی بات تو کرتے ہیں لیکن شریعت کی خاطر سر جھکانے کو تیار نہیں ہوتے، ہم ہنگامہ پسند، جلوس پسند، جلسے پسند، مظاہرے پسند، نعرے بازی پسند، لیکن پرسکون انداز میں، دستور اور قانون کے دائرے میں، افہام وتفہیم کے راستہ سے ان مسائل کو حل کرنا شاید ہم اپنے لیے باعث عار اور کسر شان سمجھتے ہیں۔''

راقم الحروف نے اپنی کتاب ''یاران مہر ووفا'' میں ان چند اقتباسات کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ اقتباسات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ان کے طرز تحریر میں وہ ساری خوبیاں جلوہ فگن ہیں جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسلوب نگارش کی شناخت اور پہچان ہیں، اس تحریر کے اختتام پر اپنے دعویٰ کے استدلال میں مناسب سمجھتا ہوں کہ استاذ محترم ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء مدظلہ العالی کا وہ اقتباس پیش کردوں جو انھوں نے مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کی کتاب ''دعوت فکر ونظر'' کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے۔

استاذ محترم مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے مؤلف ومرتب مولانا سید جعفر مسعود حسنی ہیں جو سادات حسنیہ رائے بریلی کے معروف عالم دین اور عربی واردو کے ادیب کی حیثیت سے ایک بلند مقام کے حامل ہیں، ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے عربی پندرہ روزہ "الـرائـد" کے مدیر اور ادب الاطفال کے خصوصی ایڈیٹر ہیں، ہر شمارے میں ان کے لیے عربی زبان وادب کا ایک گراں قدر تحفہ پیش کرتے ہیں اور ادب الاطفال میں عربی زبان کے ایک خاص اسلوب تعبیر میں ان سے ہم کلام ہوتے ہیں، اردو زبان وادب میں ان کے مقالات ایک خاص وزن رکھتے ہیں، ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں اور وہ طرز تحریر میں ایک جداگانہ رنگ رکھتے ہیں، واقعات کے تجزیہ اور ان سے مثبت ومنفی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور اس کے لیے نہایت مؤثر اور عبرت انگیز نتائج نکالنا ان کی خاص پہچان ہے، میں جہاں تک سمجھتا ہوں ان کے منفرد اسلوب بیان کی یہی دراصل امتیازی شان ہے۔ ان کے اسلوب تحریر میں میں نے محسوس کیا ہے کہ اس ملک کے صاحب طرز ادیب مولانا دریابادی کا رنگ کسی حد تک شامل ہے''۔

(یارانِ مہر ووفا،صفحہ۷۲-۷۴-۷۵)

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کی شخصیت میں بڑی بوقلمونی تھی، وہ بیک وقت عربی واردو کے مایہ ناز صحافی تھے تو دوسری طرف وہ بہترین خطیب وکامیاب ومقبول مدرس تھے، ادب اسلامی کے نقیب تھے تو میدان دعوت وارشاد کے عظیم شہ سوار بھی۔

اردو میں ان کی معرکہ آراء کتاب ''دعوت فکر ونظر'' ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے، اس کتاب کی روشنی میں ان کی دل آویز شخصیت کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنے اور منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی۔

ان کی کتاب ''دعوت فکر ونظر'' ان کے افکار ونظریات کا آئینہ ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کی شخصیت کے متنوع ودلکش نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

دو سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب دار الرشید خاتون منزل حیدر مرزا روڈ گولہ گنج لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے، عرض مصنف کے بعد مربی جلیل حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی رحمہ اللہ کا ابتدائیہ ہے، بعد ازاں یہ کتاب استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی تقریظ سے مزین ہے، مقدمہ استاذ مکرم ادیب لبیب ڈاکٹر حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ العالی کے اشہب قلم سے ہے۔

یہ کتاب مختلف النوع ۲۹/مقالات پر مشتمل ہے، یہ مقالات ہندوستان کے مؤقر رسائل، تعمیر حیات، راشٹریہ سہارا اور دیگر جرائد میں شائع ہوئے ہیں، ان مقالات کی سرخیوں سے ان کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ذیل میں چند عنوان پیش خدمت ہیں: ۱-صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین واقعات کی روشنی میں، ۲-حاجی اور حج، ۳-عورت، ۴- دس ڈکٹیٹر حکمراں، ۵-ایک ملاقات جرمن نومسلم مراد ہوف مین سے، ۶-یورپین چیریٹیبل آرگنائزیشن، حقیقت یا سراب، ۷-میڈیا: کتنا سچ، کتنا جھوٹ، ۸-کچھ باتیں امریکی وزیر خارجہ جان کیری

سے، ۹-کھیل کے میدان سے زندگی کے میدان تک، ۱۰-ویٹکن اور اسلام، ۱۱-نسخہ معاشرہ کی اصلاح کا، ۱۲-مدارس-اندیشے، تبصرے اور تجویزیں، ۱۳-مغربی خواتین میں اسلام کی بڑھتی مقبولیت، ۱۴-ضرورت مطالبہ کی نہیں محاسبہ کی ہے، ۱۵-مہذب قوم کی غیر مہذب باتیں۔

اس کتاب میں مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کبھی تو عظمت قلم کو اپنے دلچسپ و دل آویز اسلوب میں یوں اجاگر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

”ذرا سوچیے! قلم کا ذکر کب ہوا؟ اس وقت جب پہلی وحی کا نزول ہوا، جب آسمان سے زمین کو ایک پیغام ملا، جب فخر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو پروردگار عالم کی جانب سے یہ حکم ہوا: ”اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربك الأكرم، الذی علم بالقلم، علم الإنسان ما لم يعلم“ (پڑھیے! اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے تخلیق فرمائی، انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا، پڑھیے اور آپ کا رب) کریم (خوب نوازنے والا، کرم فرمانے والا ہے، جس نے قلم کو ذریعہ تعلیم بنایا، اور انسان کو ان تمام چیزوں کا علم عطا کیا جن سے وہ واقف نہیں تھا“۔

کتاب کی عظمت اس کے ایجابی اور سلبی پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے اس کتاب کے مقدمہ میں صاحب کتاب رقم طراز ہیں:

”کتاب ہی ہے جو ذھن تیار کرتی ہے، فکر کی تشکیل کرتی ہے، خیالات کو ایک سانچہ فراہم کرتی ہے، قاری کو ایک جہت عطا کرتی ہے، اس کی سوچ کی ایک سمت متعین کرتی ہے، کتاب ہی ہے جو ذہن کو پکارتی ہے، فکر کی تشکیل نو کرتی ہے، لیکن غلط بنیادوں پر، خیالات کو سانچہ فراہم کرتی ہے، لیکن ٹیڑھا، قاری کو جہت تو عطا کرتی ہے لیکن الٹی، سوچ کی سمت تو متعین کرتی ہے لیکن ایسی جو قاری کو منزل سے اور دور کر دیتی ہے، ٹیڑھی عقل والے آپ کو جہاں بھی ملیں گے، فکر کی کجی والے آپ کو جہاں بھی نظر آئیں گے، الجھے خیالات کی ڈور میں بندھے لوگ جہاں بھی دیکھیں گے وہ کتاب کی اسی دوسری قسم کا نتیجہ ہوں گے“۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم اس کتاب میں ایک مفکر کی حیثیت سے بھی جلوہ گر ہیں، ان کی کتاب کے دو پیراگراف ملاحظہ کیجیے، اور ان کے فکری توازن کی داد دیجیے۔ ”دعوت فکر و نظر“ میں ”غلط فہمیوں کے ازالہ کی ایک شکل یہ بھی“ کے عنوان سے امریکہ یوروپ اور مغرب میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا رخ موڑنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

” نفرت کے اس ماحول میں نفرت کی آندھیوں کا رخ اگر کوئی عمل موڑ سکتا ہے تو وہ ہمارے خالق اور ہماری نماز ہے، نماز اور خالق کی درمیان بڑا گہرا ربط ہے، نماز جہاں بندے کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، وہیں خالق کو سنوارنے اور کردار کو ایک خوبصورت سانچے میں ڈھالنے میں بڑا حصہ ہے، جس طرح اسلامی خالق کا نمونہ پیش کر کے الزامات سے بچا جا سکتا ہے، غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکتا ہے، بدنما تصویر کو خوش نما بنایا جا سکتا ہے، اسی طرح نماز کے دوران نمازی کا قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ اور پھر سالم بھی ایک ایسا دلفریب منظر پیش کرتا ہے، جو اس نمازی کے بارے میں پائے جانے والے ہر اس برے تصور کو دور کر دیتا ہے، جو اخبارات پڑھ کر قارئین کے ذھن میں قائم ہوتا ہے، آگے مزید لکھتے ہیں: ہوسکتا ہے کہ آپ میری اس بات کو مبالغہ پر محمول کریں، لیکن اگر آپ غور سے کسی ایسے نمازی کو دیکھیں جو واقعی نماز پڑھ رہا ہو، اس کیفیت کے ساتھ جو نماز کے دوران اس پر طاری ہوتی ہے، اس رقت کے ساتھ جو اس کے ایک ایک عمل سے ظاہر ہوتی ہے، اس خشوع کے ساتھ جس کی چھاپ اس کے ایک ایک عضو پر نظر آتی ہے، اس نورانیت کے ساتھ جو اس کے چہروں کو فرشتوں کی سی معصومیت عطا کرتی ہے، اس روحانیت کی ساتھ جس سے آس پاس کی پوری فضا روحانی بن جاتی ہے تو آپ خود یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ آدمی غلط نہیں ہوسکتا“۔

ان کی فکری بلندی اور معتدل طرز فکر کے ملاحظہ کے لیے ان کی کتاب کا ایک اور اقتباس پیش خدمت ہے:

”یورپ میں بچوں میں پھیلتی بے راہ روی، ذمہ دار کون؟“ کے عنوان سے رقم طراز ہیں:

”مغرب میں بچوں کے بگاڑ کی ذمہ داری اگر ایک طرف خاندان اور معاشرہ پر عائد ہوتی ہے، تو دوسری طرف حکومت اور تعلیمی اداروں کو بھی اس سے بری نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ بات اپنی جگہ درست ہے، کہ والدین کو اپنے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر جتنا وقت صرف کرنا چاہیے تھا دیگر مشغولیات کی بناء پر وہ اتنا وقت صرف نہیں کر سکے، اپنے آرام، اپنی راحت، اپنی تفریح، اپنی لذت، اپنی آزادی اور اپنی دلچسپیوں کے عالوہ انھوں نے کچھ سوچا نہیں، زیادہ سے زیادہ کمانے، بہتر سے بہتر زندگی گذارنے، اور خوب سے خوب تر حاصل کرنے کے علاوہ کوئی خیال ان کے دل میں نہیں آیا“۔

آگے وہ اس بے راہ روی اور بگاڑ کا حل پیش

کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

’’لیکن والدین کی اس کوتاہی اور بچوں کی طرف سے اتنی لاپرواہی کے باوجود بھی بچوں کی لاپرواہی پر روک لگائی جاسکتی تھی، اور یہ روک لگ سکتی تھی تعلیم گاہوں کے ذریعہ، تعلیم گاہ وہ مقام ہے جہاں ماں باپ کی کوتاہیوں کی تلافی ہوسکتی ہے، اور ان کی طرف سے رہ جانے والی کمیوں کو پورا کیا جاسکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ تعلیم گاہ صرف تعلیم گاہ نہ ہو، بلکہ تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ وہ ایک تربیت گاہ بھی ہو، لیکن افسوس کہ ہمارے مغربی ممالک اپنی تمام تر ترقیات کے باوجود اب تک تعلیم وتربیت کو یکجا نہ کرسکے، وہاں تعلیم تو جتنی عام ہے تربیت کا اتنا ہی فقدان ہے‘‘۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی علیہ الرحمہ اسلامی صحافی کی حیثیت سے صحافت کے رموز و اسرار کو واشگاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مغربی تہذیب کے دیوالیہ پن اور اس کے بالمقابل اسلامی تہذیب ومعاشرت کی دل آویزی اور اس کی اثر پذیری کا تذکرہ ان کی اس کتاب میں جابجا ملتا ہے۔ مغربی خواتین میں اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اسلام نے نقاب کے ذریعہ عورت کی حفاظت کا بھرپور انتظام کیا ہے، پردہ نہ صرف یہ کہ عورت کو محفوظ رکھتا ہے، بلکہ پردہ عورت کو محفوظ ہونے کا احساس بھی دلاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کو پردہ کے خالف تحریک چالنے والوں میں عورتوں کی تعداد کم ہی نظر آئے گی، مردوں کا عورتوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ چہرہ کھال رکھیں اس بات کا ثبوت ہے کہ مرد ابھی تک عورتوں کو اپنا غلام سمجھتا ہے، ورنہ مردوں کو اس سے کیا لینا دینا، یہ مسئلہ عورتوں کا ہے، مردوں کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ قانون بنا کر عورتوں کو اپنا چہرہ کھال رکھنے پر مجبور کریں، کیا مرد اس اصرار کی وجہ بتا سکتے ہیں، اگر مسلمان مرد عورت کو پردہ کی تلقین کرتا ہے، تو اس کی بنیاد مذہبی ہے، اور عورت کی حفاظت کے پیش نظر ہے، لیکن پردہ کی مخالفت کرنے والے آج تک پردے کی مخالفت کی کوئی معقول وجہ نہیں بتا سکے۔

اپنی بات کو مستحکم کرتے ہوئے ایک بیباک اور آزاد مسلم صحافی کے لہجہ میں یوں گویا ہیں:

’’اسلام قبول کرنے کے جو واقعات یورپ میں کثرت سے پیش آرہے ہیں، آیئے خود انہی نومسلموں کی زبانی سنیئے اور اس طرح اس مایوسی کو جو عالم اسلام کے حالات دیکھ کر آپ کے دلوں پر چھائی ہوئی ہے، دور کرنے کی کوشش کیجیے:

اس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اب اسلام برطانوی: The Times برطانیہ سے شائع ہونے والے ایک کثیر الاشاعت اخبار خواتین کا پسندیدہ مذہب بنتا جارہا ہے، اور وجہ اس کی یہ بتائی ہے کہ اسلام میں خواتین کے حقوق کی جو رعایت رکھی گئی ہے، اور اسالم کی بدولت معاشرہ میں ان کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے وہ کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرکے حاصل نہیں ہوپاتا۔

اخبار لکھتا ہے کہ برطانوی خواتین کے اسلام کو بحیثیت مذہب کے پسند کرنے کی وجہ یہ نہیں قرار دی جاسکتی کہ ان میں سے بعض کی شادیاں افریقہ اور ایشیا سے آئے بعض مسلم خاندانوں کے افراد سے انجام پائیں، جیسا کہ ماضی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسالم اپنی تعلیمات، عورتوں کے حقوق کی رعایت اور ان کی عزت وآبرو کی حفاظت کی پوری صالحیت رکھنے کی وجہ سے برطانوی خواتین میں تیزی کے ساتھ مقبول ہورہا ہے۔

ان کی کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے، یورپ میں سمٹتی مسیحیت کے عنوان سے لکھتے ہیں:

’’خواب نہیں، تمنا نہیں، آرزو نہیں، ایک حقیقت ہے، اور حقیقت بھی ایسی جس سے پورا یورپ بے چین ومضطرب ہے، کیوں کہ وہ اس کی روشنی اپنی سرحدوں کو سمٹتے، آبادی کو گھٹتے، نسل کو ناپید ہوتے، اپنے ہی لوگوں کو بغاوت پر آمادہ ہوتے اور اسلام کی طرف عقیدت ومحبت کے ساتھ قدم بڑھاتے دیکھ رہا ہے، دیکھئے وہیں کے اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹس کیا کہتی ہیں‘‘۔

آگے وہ ایک رپورٹ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’ڈنمارک جس نے اسلام دشمنی کی ساری حدیں توڑ دیں، خود عیسائیت کی قتل گاہ بنا ہوا ہے، چرچوں کی فروختگی وہاں ایک وبائی شکل اختیار کرچکی ہے، بقول بعض عیسائیوں کے اگر یہ چرچ نہ بیچے گئے تو مسلسل خالی رہنے کی وجہ سے یہ بھوتوں، جناتوں اور جرائم پیشہ افراد کا اڈہ بن جائیں گے، لہٰذا ان کا بیچ دینا ہی بہتر ہے‘‘۔

وہ اپنے اس دعویٰ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ڈنمارک چرچ کمیٹی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

’’ڈنمارک چرچ کمیٹی کے بیان کے مطابق چرچوں میں ۸۲ فیصد لوگوں کا رجسٹریشن ہے اور حاضری صرف ۸ فیصد ہے، کمیٹی کی طرف سے ان چرچوں کے سلسلہ میں ایک یہ بھی پیش کش رکھی گئی ہے کہ اگر ان چرجوں میں عبادت نہیں کی جارہی ہے تو ان کو اصطبل بنا دیا جائے یا میوزیم میں تبدیل کردیا جائے، یا پھر فلم ہال کے طور پر ان کا استعمال کیا جائے، لیکن ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں بیچا جائے کیوں کہ یہ چرچوں کی توہین کے مترادف ہے‘‘۔

یہ اقتباسات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کاروان اسلامی صحافت کے نیر تاباں تھے، وہ موجودہ صحافت میں بسی دروغ گوئی، افتراء پردازی اور کذب بیانی سے بخوبی آگاہ تھے، وہ صحافت کی کذب بیانی کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’دس بارہ ہی دن گذرے ہوں گے، ایک معروف اردو روزنامہ ’’انقلاب‘‘ میں ایک خبر شائع ہوئی، پہلے صفحہ پر، پہلی خبر، موٹی سرخی کے ساتھ، برطانیہ کے ایک مشہور اخبار کے حوالہ سے، خبر تفصیلی تھی، نقل کا یہاں موقعہ نہیں، ہاں خبر پر سرخی کچھ اس طرح لگی ہوئی تھی: ’’جسم اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد نبویؐ سے منتقل کر کے کسی دوسری جگہ رکھنے کی تجویز‘‘، خبر کیا تھی، زہر میں بجھا ہوا ایک تیر تھی، جو سیدھا دل پر لگا، دل کی جو کیفیت ہوئی وہ ہر صاحب ایمان سمجھ سکتا ہے، خبر بالکل ناقابل یقین تھی، لیکن پھر بھی خبر تھی، ہلا کر رکھ دیا، سعودی حکومت کے بارے میں کیا کچھ خیالات دل ودماغ میں نہیں آئے‘‘۔

ایک دوسری خبر میں افترا پردازی، کذب بیانی اور دروغ گوئی کو واشگاف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’دوسری خبر اٹلی کے ایک اخبار کے حوالہ سے برطانیہ ہی سے شائع ہونے والے عربی اخبار ’’القدس‘‘ نے نقل کی ہے، خبر یہ تھی کہ سعودی ولی عہد (موجودہ بادشاہ سلمان بن عبد العزیز) نے مراکش کے شاہ محمد خامس کی بہن کو ایک نہایت قیمتی محل خرید کر تحفہ میں دیا، آگے وہ مزید لکھتے ہیں: اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس خبر سے شاہی گھرانہ اور خاص طور پر سلمان بن عبد العزیز (۸۰ سالہ) کے اہل خاندان پر کیا اثرات پڑے ہوں گے، اور خود مسلمانوں میں اور خاص طور پر سعودی بے روزگار نوجوانوں میں اس خبر کو لے کر کیسے کیسے تبصرے ہوئے ہوں گے، سلمان بن عبد العزیز کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے کافی تھی، لیکن ایک ہی دن کے بعد اسی اخبار نے اپنی ہی خبر کی تردید شائع کرتے ہوئے کہا کہ سلمان بن عبد العزیز نے وکیلوں کی ایک ٹیم اس اٹالین اخبار کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لیے روانہ کردی ہے‘‘۔

ان دو خبروں کو نقل کرنے کے بعد صاحب کتاب ’’دعوت فکر ونظر‘‘ لکھتے ہیں:

’’یہ صرف دو مثالیں ہیں جو آج ہی کل کی ہیں، اگر آپ اخبارات کے پچھلے شمارے دیکھیں تو آج سچ اور جھوٹ ثابت ہونے کے بعد ان اخبارات کی شائع کردہ بعض خبروں کو پڑھ کر آپ ہنسیں گے‘‘۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم نونہالانِ امت کی تربیت کے وہ خطوط کھینچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو بچوں اور اولاد کی تربیت کے رہنما اصول ہیں، بچوں اور بچیوں کی تربیت کے رہنما اصول پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

اکثر ماؤں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کی اولاد ان کا کہنا نہیں مانتی جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی الجھن کا شکار اور ذہنی کوفت میں مبتلا رہتی ہیں، حالانکہ اس مسئلہ کا حل اتنا مشکل نہیں جتنا کہ وہ سمجھتی ہیں، پھر وہ اس کا حل پیش کرتے ہوئے نہایت دلچسپ و دل آویز انداز میں یوں گویا ہیں:

’’خلیل دس سال کا ایک لڑکا ہے، جو اپنے دوست کے گھر جانے کے لیے اپنی والدہ سے اجازت مانگ رہا ہے، والدہ سے اجازت ملنے کے بعد وہ اپنے دوست سے ملنے کے لیے اس کے گھر روانہ ہو جاتا ہے؛ لیکن بجائے اس کے وہ پانچ بجے لوٹے جیسا کہ اس نے اپنی والدہ سے وعدہ کیا تھا، وہ چھ بجے لوٹتا ہے، اب اس کی والدہ کو کس طرح پیش آنا چاہیے؟ اور اس کی تاخیر پر اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ اس کے دو طریقے ہیں‘‘:

آگے وہ ان دو طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اس کے آتے ہی اپنی خفگی کا اظہار کرے، وعدہ خلافی پر اس کی سرزنش کرے اور یہ کہے کہ وعدہ خلافی تو تمہاری عادت ہے، تم نے کبھی وقت کی پابندی نہیں کی اب تم لیٹ آکر دیکھو، خاموشی اختیار کرے اور اس کو اس بات کا احساس بھی نہ ہونے دے کہ اس نے کوئی غلطی کی ہے، اس کا موقعہ دے کہ وہ لباس وغیرہ تبدیل کرلے، تھکا ہوا ہو تو ستا لے، بھوکا ہو تو کھانا کھا لے، کوئی ضرورت ہو تو اس سے بھی فارغ ہو جائے اور سکون واطمینان کے ساتھ رات گذارے، اگلے دن جب وہ دوبارہ اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے والدہ سے اجازت طلب کرے تو ماں یہ کہتے ہوئے اس کو جانے سے روک دے کہ چونکہ تم وعدہ پورا نہیں کرپاتے، لہٰذا آج میں تم کو جانے کی اجازت نہیں دوں گی‘‘۔

آگے وہ تربیت کے ان دونوں طریقوں کی افادیت اور اثر پذیری کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’سمجھانے کا یہ سنجیدہ طریقہ پہلے طریقہ سے بہتر ہے، جس میں چیخ وپکار مچتی ہے نہ ماں کی ذہنی کوفت گھٹنے کے بجائے اور بڑھتی ہے، لڑکے کے اندر محاذ آرائی اور ہٹ دھرمی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور ماں کے طرز عمل میں لڑکے کو ایک ماں کا نہیں اجنبی عورت کا عکس نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی ماں سے دور ہوتا چلا ہوجاتا ہے‘‘۔

بچوں اور بچیوں کی تربیت کے اصول پر روشنی ڈالتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں:

اسی طرح تربیت کے سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ ماں سختی اور پختگی کے فرق کو سمجھے، پختگی یہ ہے کہ ماں کوئی فیصلہ کرے تو اس پر

قائم رہے، جو معاملہ طے کرے اس کو پورا کرے اور اپنے موقف سے ذرا بھی پیچھے نہ ہٹے پھر مثال سے اس کو واضح کرتے ہوئے یوں گویا ہیں:

''بشریٰ نو سال کی ایک بچی ہے، جو اپنی سہیلی کے گھر ایک پارٹی میں مدعو ہے، پارٹی سے ایک روز قبل جب وہ اپنی والدہ سے پارٹی میں جانے کے لیے اجازت چاہتی ہے، تو اس کی ماں اس شرط کے ساتھ پارٹی میں شرکت کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنا ہوم ورک پارٹی میں جانے سے پہلے کرلے ورنہ اس کو پارٹی میں جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، بشریٰ اس شرط کو منظور کرلیتی ہے؛ لیکن وہ تھوڑی دیر ہی میں ماں سے کیے گئے وعدہ کو بھول جاتی ہے، اور کھیل کود میں لگ جاتی ہے، یہاں تک کہ جب پارٹی میں جانے کا وقت آتا ہے تو وہ دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس آتی ہے، اور کہتی ہے کہ وہ اس کی سہیلی کے گھر پہونچادے؛ لیکن اس کی ماں اس کو سہیلی کے گھر پہنچانے سے انکار کردیتی ہے، کیونکہ بشریٰ نے وعدہ کی پابندی نہیں کی تھی اور اسکول کا کام گھر پر نہیں کیا تھا، بشریٰ یہ دیکھ کر اصرار کرتی ہے اور رونے لگتی ہے اور وعدہ کرتی ہے کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گی، بس اس مرتبہ جانے کی اجازت دے دی جائے؛ لیکن اس کی ماں اس کے رونے سے متاثر نہیں ہوتی اور اپنے فیصلہ سے پیچھے نہیں ہٹتی؛ بلکہ وہ بشریٰ کی سہیلی کے گھر جاتی ہے اور اس سے بشریٰ کے نہ آنے پر معذرت کرلیتی ہے''۔

یہ دونوں اقتباسات اس حقیقت کے غماز ہیں کہ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم نونہالوں کی تربیت کے اصول وضوابط سے نہ صرف آشنا تھے؛ بلکہ وہ ان اصول وضوابط پر بچوں اور نونہالوں کی تربیت کے پرزور داعیوں میں تھے۔

☆☆☆☆☆

مولانا جعفر مسعود حسنی جوارِ رحمت میں

حافظ عتیق الرحمٰن طیبی ☆

نگہ بلند، سخن دلنواز، جان پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

یوں تو دنیا میں انسانوں کی کمی نہیں؛ لیکن باکمال اور عبقری شخصیتیں خال خال نظر آتی ہیں، مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی ۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ایک علمی وروحانی خانوادے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی عربی زبان وادب کے معروف اسکالر اور صحافی تھے۔

مولانا جعفر مسعود نے ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کیا اور قرآن مجید حفظ کیا، بعد ازاں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تدریسی خدمات کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی سند حاصل کی اور ۱۹۸۵ء میں آپ نے بطور استاذ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں تدریسی خدمات کا آغاز کیا۔

آپ ایک باصلاحیت معلم ہونے کے ساتھ ایک اچھے صاحب قلم بھی تھے، آپ نے تدریسی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ تصنیفی وتالیفی سلسلہ بھی جاری رکھا۔

آپ کی خوبیوں وصلاحیتوں کے پیش نظر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا اہم منصب ''ناظر عام'' مجلس شوریٰ کے اتفاق سے تفویض کیا گیا۔

اس دلدوز حادثہ کے بعد ایک تعلق والے جناب ڈاکٹر عبد القدوس ہاشمی کا بجنور سے تصدیق کے لئے فون آیا، میں نے لاعلمی کا اظہار کرکے فون منقطع کیا تو میرے سمدھی جناب سلطان شاکر ہاشمی نے تصدیق چاہی تو دل کی دھڑکن اور بڑھ گئی، بالآخر دل دہلا دینے والے اس واقعے کی تصدیق ہوگئی زبان سے انا للہ و انا الیہ راجعون جاری ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ سبھی اہل خانہ اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

میرے بڑے لڑکے ڈاکٹر محمد اسلم ندوی جو اپنی والدہ کی علالت کی خبر پاکر ایک روز قبل آئے تھے، ان کے ساتھ رائے بریلی کے لئے جانا طے ہوا، اسی دوران مولانا شمیم احمد ندوی ناظم جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر کا فون آیا کی میں بھی تکیہ رائے بریلی جنازہ میں شرکت کے لئے تیار ہوں۔ پھر ہم لوگ وقت سے رائے بریلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر جنازہ اور تدفین میں شرکت ہوئی۔

جم غفیر کی وجہ سے تمام وسعتوں کے باوجود مسجد اور اس کے سامنے کا میدان تنگ ہوگیا تھا۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی ایک سادگی پسند، سیدھے سادے، خلیق وملنسار عابد وزاہد انسان تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کی ملی، رفاہی اور علمی خدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین یارب العالمین، اللّٰھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وأكرم نزله۔

☆☆☆☆☆

☆ مسجل دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دعوتِ فکر ونظر: ایک تعارف

مولانا ضیاء الحق خیر آبادی☆

''دعوتِ فکر ونظر'' مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو سالوں پہلے ملک کے مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے۔ تین سال قبل اس کے مصنف مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ نے مجھے یہ کتاب دی تھی کہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کروں، لیکن افسوس کہ ان کی زندگی میں اس کی نوبت نہ آسکی، جس کا قلق ہمیشہ رہے گا، آج جب ان کی یاد میں ''تعمیر حیات'' کی خصوصی اشاعت منظر عام پر آرہی ہے تو خیال ہوا کہ اسی موقع سے ان سے کیے گئے عہد کو پورا کروں۔

یہ مولانا مرحوم کی پہلی کتاب ہے جو میں نے بالاستیعاب پڑھی ہے، اس سے پہلے ان کے کچھ مضامین، کتابوں پر لکھی گئیں تقریظات اور مقدمے وغیرہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا، جس سے ان تحریروں کے بارے میں کوئی خاص تاثر ذہن میں نہیں تھا، اس مجموعۂ مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ ایک سدا بہار قلم کے مالک اور ان کی تحریروں میں غضب کی روانی وبرجستگی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خیالات کا ایک سیل رواں یا کوئی پہاڑی آبشار ہے جو اپنے قارئین کو اپنے ساتھ بہائے لے جارہا ہے، اس مجموعہ کا کوئی بھی مضمون اٹھالیں ختم کیے بغیر اس کی سحر انگیزی سے نکلنا مشکل ہوگا، خصوصاً اس کا پہلا مضمون ''ربیع الاول کا پیغام'' اور ''نسخہ معاشرہ کی اصلاح کا'' تو اپنے اندر غضب کی اثر آفرینی لیے ہوئے ہے۔

اس کا آغاز عرض مصنف سے ہوتا ہے، جس کا شاندار ابتدائیہ ملاحظہ ہو:

''مختلف مضامین کا یہ بے ترتیب سا مجموعہ آپ کی خدمت میں پیش ہے، سچ تو یہ ہے کہ نہ تو اس کی کوئی ضرورت تھی اور نہ کوئی خاص وجہ؛ لیکن کیا کہا جائے ہر شخص کو اپنے خیالات عزیز ہوتے ہیں اور ان خیالات کی ترسیل اس کی طبعی خواہش، ہر شخص کو اپنی چیز پیاری ہوتی اور پیاری چیز کی حفاظت اس کے نزدیک ضروری۔

اخبارات ورسائل میں شائع شدہ مضامین یا تو ردی کی نذر ہوجاتے ہیں یا ماچس کی تیلی کے، اس انجام سے بچنے کی بس یہی ایک شکل نظر آئی کہ ان مضامین کو بے ترتیب ہی سہی، غیر معیاری ہی سہی، بے ضرورت ہی سہی، کتابی شکل دیدی جائے''۔ (ص:۷)

مولانا کی عملی زندگی ہر طرح کے تصنع وبناوٹ کے شائبہ سے پاک تھی، وہ سادگی اور تواضع و انکسار کا پیکر تھے، تحریری دنیا میں بھی ان کے یہاں کسی قسم کے تکلف یا آورد کا گزر نہ تھا، بے تکلف وارد ہونے والا خیالات کو نقوش وحروف کے پیکر میں ڈھال دیتے تھے، اسی ابتدائیہ کو دیکھیں کس قدر سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنی بات قارئین کے روبرو کردی۔ پوری کتاب میں یہی رنگ ہے، جو بات کہتے ہیں پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں، اسلوب خطابی اور تحریر ادب وانشاء کی چاشنی سے بھرپور ہوتی ہے۔

مولانا کی شخصیت بڑی باغ وبہار تھی، وہ نرے مدرس نہ تھے، ان کے مطالعہ کا دائرہ بڑا وسیع تھا، قدیم وجدید اردو وعربی ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی، حالات حاضرہ سے بھی پوری طرح واقف اور ان کے اثرات ونتائج سے پوری طرح باخبر تھے، اس کتاب میں جہاں تاریخ وسیرت اور ٹھیٹھ اسلامی موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے وہیں مغربی افکار کی کمزوری اور اس کی ناکامی کو بھی اجاگر کیا گیا ہے، اور سب سے اہم بات یہ کہ ان مضامین سے ہمیں عملی زندگی میں کیا سبق ملتا ہے اس کو بطور خاص پیش کیا گیا ہے، اس میں مولانا کہیں عالم دین، کہیں ایک مورخ، کہیں داعی و مفکر تو کہیں ایک بے باک صحافی وتجزیہ نگار کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ کتاب کے متنوع مضامین ومقالات کی وجہ سے ہر ذوق وفکر کے افراد کے لئے اس کتاب میں دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ حضرت مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی اپنے مقدمہ میں کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان مقالات میں تاریخ اسلام کے واقعات، مغربی تمدن کی ناکامی، اور بلاد مغرب کے مفکرین کی ناسمجھی اور اسلامی زندگی کی ضرورت، اور اس کا پیغام، مغرب زدہ اشخاص کی بے کیف زندگی، یورپ و امریکہ میں اخلاقی انارکی، اور دم واپسیں میں مبتلا ان کا ''نظام حیات'' یہ اور اس جیسے زندہ و تابندہ عناوین کے مشتملات پر یہ کتاب ہر طبقہ کے لیے انتہائی مؤثر اور چشم کشا ہے''۔ (ص:۸۱)

اس مقدمہ کے علاوہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا ابتدائیہ اور مصنف کے گرامی قدر والد حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی

☆خیرآباد، مئو

کی تقریظ موضوع کتاب اور مصنف کتاب کا بہترین تعارف ہے۔

میرے سامنے کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جو مصنف مرحوم کی وفات کے بعد رائے بریلی کے تعزیتی سفر میں ان کے صاحبزادے مولانا محمد خلیل حسنی کی توجہ وعنایت سے حاصل ہوا تھا، اس طبع دوم میں کل ۴۳ مضامین ہیں، جبکہ طبع اول میں ۲۹ مضامین تھے، اس ایڈیشن میں ۱۴ مضامین کا اضافہ ہے، طبع اول کے صفحات ۲۰۰ تھے اور قیمت ۱۵۰ روپئے تھی۔ اضافہ شدہ مضامین کی تفصیل یہ ہے:

حدیث رسولؐ، رحمۃ للعالمینؐ۔ اسوۂ حسنہ۔ نعت پاک، قدسی جماعت۔ انسانی حقوق۔ موجودہ تہذیب۔ انسان کی تعمیر۔ بچوں کا ادب۔ میڈیا۔ عالمی نظام۔ اسلامی نظام حیات۔ یورپ کا ماضی۔ رخصتی کے وقت ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عمر۔

یہ مجموعہ مضامین اس لائق ہے کہ اسے اہتمام سے پڑھا جائے اور اس کے مندرجات پر عمل کی کوشش کی جائے، خصوصاً ہمارے نئے فضلا کے لیے۔ مضمون کے اختتام پر کتاب کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

’’ضرورت آج بھی قربانی کی ہے، لیکن آج کی قربانی پچھلی قربانی سے مختلف ہے......آپ سے بس اتنا مطالبہ ہے کہ اپنے کسی عمل سے اسلام کو نقصان نہ پہنچایئے، اپنے نقصان کو دین کی خاطر گوارہ کر لیجیے، اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا بندوبست کیجیے، اسلام کی عظمت ان کے دلوں میں پیدا کیجیے، اسلامی تعلیمات سے ان کو روشناس کرایئے، ان کی علمی، فکری اور دعوتی بنیاد اتنی مضبوط کر دیجیے کہ کوئی باطل تحریک ان کو ہلا نہ سکے۔

☆☆☆☆☆

مولانا جعفر مسعود حسنی کی یاد میں

جناب فیروز عطا ندوی☆

کہتے ہیں خامشی کی چیخ سب سے زیادہ بلند، سادگی کی ادا سب سے زیادہ حسین اور خودنمائی سے دوری سب سے بہترین آرائش ہوتی ہے۔ مولانا جعفر مسعود صاحب کی شخصیت ان زریں حقائق کی سچی تصویر تھی۔ ندوہ کے در و دیوار اور فرزندانِ ندوہ کے دل و دماغ اس ناگہانی نقصان پر حقیقتاً کراہ اٹھے۔ ابھی مولانا حمزہ صاحب اور مولانا رابع صاحب کی پے درپے اموات سے سونامی زدہ سمندر کی لہریں پرسکون ہوئی تھیں ابھی مولانا بلال صاحب اور مولانا جعفر صاحب کی ہم آہنگ قیادت میں ندوہ کا نظام پختہ گام ہوا ہی تھا کہ پھر حلقۂ زنجیر ٹوٹ گیا۔ مولانا جعفر صاحب نے اپنی فطری جفاکشی اور دوراندیشی کے ذریعے انتظامی امور کے خار وخشت سے ناظم صاحب کو بچا رکھا تھا ایک طرح سے بفر بن کر انھوں نے مولانا بلال صاحب کو ہر قسم کے سر درد سے تحفظ فراہم کر رکھا تھا۔ ندوہ کے خیر خواہوں کے مطابق دونوں جواں عزم سالاروں کی محنت اور اخلاص کے نتیجے میں مادر علمی میں بہت خوش کن اور مثبت تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور لگ رہا تھا کہ ایک لمبی مدت کے لئے ٹھہراؤ کا سکون اور سفر کی کامرانیاں ندوہ کا مقدر بن چکی ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ نظام جہان کو چلانے میں رب ذوالجلال خودمختار ہے اور مستقبل کے احوال سے باخبر بھی سو اس کی مرضی اور اس کے فیصلوں کی بہتری پر ہمارا ایمان ہے۔ وہ ہمارے سوئے اعمال کا محاسبہ اور ہمارے مستقبل کی بہتری کا سامان مناسب انداز میں کرتا ہے۔ ہم ظاہری خسارے پر بھی رب کریم سے خیر کی امید رکھتے ہیں۔

ندوہ میں تعلیم کے دوران یادوں کے جھروکے میں بس ان کا کرکٹ بیک گراؤنڈ محفوظ ہے کہ وہ اس کھیل کے دلدادہ اور ماسٹر کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے اور ہم باؤنڈری کے باہر کھڑے تماشائی ہوتے تھے۔ ناظر ندوہ کی حیثیت میں ان کا نام اور ان کے جوہر کھلنے شروع ہوئے تو واٹس ایپ ذرائع سے ان کی انتظامی صلاحیت، علمی اور ادبی لیاقت سے واقفیت بڑھتی گئی۔ ۲۰۲۳ء اپریل میں ڈاکٹر عبدالماجد صاحب اور عزیز دوست مجیب اختر کی معیت میں ندوہ کا دلبر سفر ہوا تو طفیل میں سہی ان سے بھی ملاقات رہی اور ان کی ضیافت ومحبت کا فیض اٹھانے کا بھرپور موقع ملا۔ روداد سفر لکھنے میں کچھ غیر ضروری تفصیل بیان کرنے اور مناسب القاب کے بغیر مولانا جعفر صاحب کا ذکر کرنے پر بگ برادر عبدالماجد صاحب کی ڈانٹ بھی سہنی پڑی تھی مگر اپنی افتاد طبع کا کیا کروں کہ القاب وآداب کے لاحقے اور سابقے لگانے سے وحشت سی ہے۔ ندوہ سے نکلنے کے بعد زیادہ تر اغیار کا لٹریچر پڑھنے کا موقع ملا مگر کہیں بھی القاب وآداب سے تحریر کو بوجھل ہوتے نہیں پایا۔ بڑی بڑی شخصیات کے ذکر میں صرف نام یا کوئی پروفیشنل ٹائٹل اور بس۔ یہ سچ ہے کہ کارناموں اور کردار سے جو شخصیت کا قد بلند ہوتا ہے القاب وآداب کے چوبی سہارے ان کا بدل نہیں ہو سکتے۔ کم سے کم مولانا جعفر صاحب ان سہاروں سے بے نیاز ہیں۔ ان کا تواضع ان کی دلگداز تحریریں ان کا اخلاص اور سب بڑھ کر ندوۃ العلماء کے انتظام وانصرام میں خود کو فنا کر دینے کی ان کی چاہ نے چہار جانب سے اپنے لئے عقیدت ومحبت کا نذرانہ وصول کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

☆مقیم نئی دہلی

علمی و روحانی ورثے کی ایک نمایاں کڑی

مولانا وحید احمد ندوی ازہری☆

موت ایک ایسی ہوش ربا اور روح فرسا حقیقت ہے جو اپنے پیچھے دل دہلا دینے والا کرب ناک منظر چھوڑ جاتی ہے، اشکوں کا سیلِ رواں، غم و اندوہ کا کوہ گراں، حزن و ملال اور آہ و فغاں کی صدائیں، رنج والم سے چور اور نڈھال دل، آہوں پر آہیں، سسکیوں میں ڈھلتی ہچکیاں، یا پھر ایسے زخموں پر صبر و تسلیم کی خاموش چادر، جو وقت گزرنے کے باوجود بھی بھرنے کا نام نہ لیں۔

یہ ایک ایسا کرب ہے جو دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے، ایک ایسی ٹیس جو دل کے نہاں خانوں میں پیوست ہو کر سراپا درد بن جاتی ہے، اور ایک ایسی بے بسی جو انسان کے دامن سے لپٹ کر عمر بھر کا سکون چھین لیتی ہے۔ یہ کیفیات اس قدر لطیف اور نازک، اور اس درجہ عمیق و ناپیدا کنار ہوتی ہیں کہ نہ کوئی بلیغ قلم ان کی مکمل تصویر کھینچ سکتا ہے، نہ کوئی فصیح زبان ان کی تہہ تک رسائی پاسکتی ہے۔ نہ کسی سخنور کی نکتہ آفرینی ان زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہے، نہ کسی کہنہ مشق ادیب کی دل گداز تحریر ان کی شدت میں کمی لاسکتی ہے۔ یہ وہ درد ہے جو لفظوں کی گرفت سے آزاد، اور تحریروں کی وسعت سے کہیں زیادہ گہرا، پُراسرار اور ناقابلِ بیان ہے۔

جب کوئی شخص اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے، تو اگر وہ عظیم المرتبت ہو، بلند مقام رکھتا ہو، تو لوگ اس پر لکھتے ہیں— دوست اپنی محبت و عقیدت کے جذبات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں، مخلصین اس کے کردار کی خوبیاں اجاگر کرتے ہیں، اور وہ جو اسے محض علمی و فکری حوالوں سے جانتے تھے، وہ اس کی عظمت سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

مگر جو خاموش رہ جاتے ہیں؟

جو دل پر پتھر رکھ کر غم کے گھونٹ پی رہے ہوتے ہیں؟

جن کی بے قراری کسی قرار کو نہیں پہنچتی؟

جنہیں نیند آتی ہے مگر سکون نہیں ملتا؟

جن کی آنکھیں آنسو روکنے پر مجبور ہو جاتی ہیں؟

وہی اصل سوگوار ہوتے ہیں...

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا اس جانے والے سے خونی رشتہ ہوتا ہے، جن کے دلوں میں اس کی محبت سرایت کر چکی ہوتی ہے۔

وہ جو باپ کی شفقت سے محروم ہو جائے، یا بھائی کی رفاقت کھو دے، یا ایسے شریکِ حیات سے جدا ہو جائے، جو اسے زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

اور پھر دینی اقدار، حیا، یا حالات کی نزاکت اسے اپنے غم کو چھپانے پر مجبور کر دے، آہوں کو ضبط کرنے آنسوؤں کو روکنے اور چہرے پر مصنوعی سکون طاری کر کے سامنے آنے پر مجبور کر دے۔

ایسے دل شکستہ لوگوں کے درد کی شدت کو نہ کوئی قلم لکھ سکتا ہے، نہ کوئی لفظ بیان کر سکتا ہے۔

یہ لوگ خاموش رہتے ہیں ... مگر ان کی خاموشی سب کچھ کہہ رہی ہوتی ہے۔

یہ روتے نہیں، مگر ان کے دل کی چیخیں فضا میں گونجتی ہیں۔

کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس گہرے درد کو سمجھ پائیں، خاص طور سے ان لوگوں کا درد جو نہ لکھ سکتے ہیں، نہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بول سکتے ہیں، مگر ان کی خاموشی ایک مکمل داستان ہوتی ہے، ایسی داستان جسے الفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

یہی موت کی حقیقت ہے —ایمان کی علامت، محبت کی نشانی، اور دنیا کی فنا پذیری کا واضح ثبوت۔

یہ آتی ہے اور سب کچھ بدل کر رکھ دیتی ہے۔

جو خوشیاں کبھی ہماری زندگی کا حصہ تھیں، جو راحت کے لمحات، جو انس و محبت کے رشتے ہمیں حاصل تھے—

ساتھ بیٹھنا، ساتھ چلنا، ساتھ گفتگو کرنا— یہ سب کچھ اچانک تڑپا دینے والی یادوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بیڑا غرق ہو ان یادوں کا!

یہ ماضی کے چھوٹے بڑے تمام لمحات کو اس طرح ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں، کہ وہ واقعات جس وقت پیش آئے تھے اس وقت کے حقائق اور معانی کو یکسر تبدیل کر دیتی ہے، پھر اپنے نئے حقائق اور معانی ان کو پہنا دیتی ہے، تاکہ انسان اس سچائی کو تسلیم کر لے کہ

نہ وہ اپنے حال کا مالک ہے، نہ ماضی پر اختیار رکھتا ہے، نہ اپنے مستقبل کو متعین کر سکتا ہے۔

جس لمحے میں ہم کبھی کسی کے ساتھ بے ساختہ ہنسے تھے، آج وہی لمحہ یاد میں تبدیل ہو جاتا ہے پھر یاد آتا ہے، تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

یہی حال پوری زندگی کا ہے— ہر خوشی، ہر غم، ہر راحت— یہ سب لمحے گزر کر ماضی میں دفن ہو جاتے ہیں، اور یاد بن جاتے ہیں۔

اور یادیں؟

☆مقیم متحدہ عرب امارات

وہ دل میں ہمیشہ ایک ایسا درد چھوڑ جاتی ہیں، جو وقت کے ساتھ گھٹنے کے بجائے اور گہرا ہوتا جاتا ہے..

جعفر بھائی کل تک ہمارے درمیان تھے، مگر آج وہ تاریخ کا ایک روشن باب بن چکے ہیں... کوئی انہیں یاد کر کے ماضی کے دریچوں میں کھو جاتا ہے، تو کسی کے سامنے ان کا ذکر آتا ہے تو آنکھیں بے اختیار برس پڑتی ہیں ... ہم بس اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان کے حق میں دعا کریں اور ان کی خوبیوں کا تذکرہ کریں۔

ان کی زندگی نصیحتوں اور عبرتوں کا مرقع تھی، ایسے واقعات پر مشتمل تھی جو شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں اور جو اپنے اندر ایمان و یقین کے دروس سموئے ہوئے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ وقت کو زبان عطا کر دیتا اور اسے گویائی بخش دیتا، تو وہ یہی کہتا کہ اللہ کی مشیّت اپنے بندوں میں ناقابلِ تسخیر ہے، اس کا حکم ہر شے پر غالب ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے جس چیز کے لیے چاہتا ہے انتخاب کرتا ہے، اور جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو کوئی اس کے ارادے کو روک نہیں سکتا۔

وہ کبھی اپنے کمزور بندوں کو عظیم مناصب کے لیے منتخب کرتا ہے تاکہ اپنی قدرت کا اظہار کرے اور یہ ثابت کر دے کہ وہ اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے: "وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ. (اور ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ زمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں، ان پر احسان کریں، اور انہیں پیشوا بنائیں، اور انہیں وارث بنائیں)۔

اسی طرح کبھی وہ بڑے صاحبِ فضل وکمال کی طرف دیکھتا ہے خود پسندی اور غرور دیکھتا ہے نظر پھیر لیتا ہے۔ اور اپنی بارگاہ سے دھتکار دیتا ہے، تاکہ اپنی بے نیازی اور اپنی صمدیّت کا اعلان کرے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ. (اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ بے نیاز، ستودہ صفات ہے)۔

اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، کیونکہ اس میں فروتنی، محبت، اطاعت اور نیازمندی ہے، اور ابلیس کو نکال دو، کیونکہ وہ تکبر اور خودسری میں مبتلا ہے، خود کو برتر سمجھتا ہے، اور اس مخلوق کو حقیر جانتا ہے جسے میں نے زمین میں خلیفہ بنایا۔

اللہ ہر دور میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرتا ہے: ''میں ہی بادشاہ ہوں، میں سب سے بے نیاز اور اغنی الأغنیاء ہوں''۔

پھر وہ تمام مخلوقات پر اپنی حکمرانی کو یوں ظاہر کرتا ہے: ''بتاؤ کون ہے عزت دینے والا؟ کون ہے غلبہ رکھنے والا؟ کون ہے ذلیل کرنے والا؟ کون ہے عطا کرنے والا؟ اور کون ہے محروم کرنے والا؟ بے شک وہ صرف اللہ ہے'': قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ، بِيَدِكَ الْخَيْرُ، إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. (کہو: اے اللہ! بادشاہت کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دے، اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے، اور جسے چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

اس موقع پر ایمان کی روشنی کو جلا بخشنے اور روحانی فیضان کے حصول کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان روح پرور اور ایمانی کلمات سے فیض حاصل کیا جائے جو اہلِ دل کی پاکیزہ بصیرت سے پھوٹے، اور جو قرآن وحکمت کے چشمۂ صافی سے سیراب ہوئے اور جن کی تاثیر دلوں میں سوز اور اذہان میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے، میں آپ کے سامنے ایک نہایت بلیغ، مؤثر اور وجد آفریں اقتباس پیش کر رہا ہوں، جو شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے گہربار کلام سے ماخوذ ہے۔

یہ اقتباس مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی مایہ ناز تصنیف ''تاریخ دعوت و عزیمت'' [جلد سوم، ص ۲۴۹-۲۵۱) سے اخذ کیا گیا ہے، جو ''مقامِ کبریا'' کے عنوان سے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی، اس کی صمدیت، اور اس کے فیصلوں کی حکمتِ بالغہ کو بیان کرتا ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کے سامنے عقلیں حیرت زدہ ہو جاتی ہیں، ذہن مبہوت رہ جاتے ہیں، اور نفس خشیت سے لرز اٹھتا ہے۔ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ایک مکتوب میں شہنشاہ مطلق کی بے نیازی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کہ کسی کو اس سے چون و چرا کی گنجائش اور یارائے سوال نہیں: "لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ" وہ جس کو چاہے دولت ایمان اور خلعت قبول سے نوازے اور جس کو چاہے راندۂ درگاہ اور مطرود بارگاہ بنا دے، جس کو چاہے خاک سے افلاک پر پہنچا دے اور جس کو چاہے افلاک سے خاک پر گرا دے اگر تم کہو کہ ایسا کیوں ہے؟ تو جواب دیا جائے گا: "ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ" کس کی مجال ہے کہ خدا سے یہ کہ سکے کہ کیوں فلان کو یہ دولت دی فلان کو نہیں دی؟ جیسا کہ اس عالم شہود میں ایک بادشاہ ایک کو منصب وزارت سے سرفراز کرتا ہے۔ دوسرے کو دربانی و کناسی پر مقرر کرتا ہے، اسی طرح جب وہ کسی کو دین کی دولت عطا فرماتا ہے تو کبھی اس کو خرابات سے اٹھا لاتا ہے کبھی بے حیثیت لوگوں خاکروبوں کٹریوں ظالموں اور حرام خوروں کے گروہ سے نکال

لاتا ہے، کس کا جگر ہے کہ کہے: "أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا"، حکم ہوتا ہے کہ فضیل بن عیاض کو اگر چہ وہ راہ زن ہے لاؤ وہ ہمیں مطلوب ہے، بلعم باعور کو جو ساتھ لاکھ برس تک مصلے سے نہیں ہٹا ہماری درگاہ سے باہر لے جاؤ کہ وہ ہمارے یہاں کا نکالا ہوا ہے، ہم عمر کو جو بت پرستی میں مشغول ہے چاہتے ہیں، عزازیل کو جو سات ہزار سال سے عبادت میں مشغول ہے نہیں چاہتے ہیں، کس کی مجال ہے کہ کہے کیوں؟ اگر مہربانی کی نظر ڈالے تو ہمارے سب عیب ہنر ہیں، ہمارے تمام نقص کمال اور ہماری تمام بدزیبی حسن وجمال۔

اے برادر! ایک مٹھی بھر خاک تھی، جو ذلت و خواری کی حالت میں راستہ میں پڑی، اور پاؤں کے نیچے آ رہی تھی، لطف ونوازش کی نظر پڑی اور صدا آئی: "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً".

اگر زمانے کو قوت گویائی حاصل ہوتی، تو وہ ان حقیقتوں کو بیان کرتا، کیونکہ یہ وہ الہامی صداقتیں اور ازلی قوانین ہیں جو بدلتے نہیں، اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی گود میں ودیعت کر دیا ہے، تاکہ وہ ان کا امین اور شاہد بنے: "وَالْعَصْرِ، إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ".

قسم ہے زمانے کی یعنی زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ ہر انسان گھاٹے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان کی روشنی سے منور ہیں، نیک عمل میں استقامت رکھتے ہیں، حق کی تلقین کرتے ہیں اور صبر کی دولت بانٹتے ہیں، یہی وہ نفوس ہیں جو آزمائشوں کے طوفان میں امید کا چراغ بجھنے نہیں دیتے، اور حق کے راستے پر صبر وثبات کے ساتھ جمے رہتے ہیں، تاریخ کے صفحات اور وقت کے دھارے خود اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

یہی قدرتِ الٰہیہ ہمارے محترم بھائی، مولانا سید جعفر حسنی کی زندگی میں بھی جلی ہو کر نمایاں ہوئی، ان کا آغاز سادہ، معصوم اور بظاہر عام سا تھا، کسی کی نگاہ میں وہ کوئی غیر معمولی ذہانت یا عبقریت کا مظہر نہ تھے، نہ ہی ان کے خدوخال میں کوئی ایسی جھلک تھی جو انہیں نمایاں کرتی، مگر ان کی داستان کا اختتام ایسی عظمت پر ہوا جسے دیکھ کر بڑے بڑے نابغۂ روزگار حیرت میں پڑ گئے، وہ نابغے جن کے بارے میں ہر نشانی کہہ رہی تھی کہ کامیابی انہی کے قدم چومے گی۔۔

یہ حیرت انگیز حقیقت ہے کہ وہ شخص، جس نے خود بھی کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ اس مقام بلند تک پہنچے گا، اور جس کے بارے میں دوسروں نے بھی کبھی تصور نہ کیا تھا، وہی ایک روز ایسی رفعتوں پر فائز ہوا، جہاں پہنچنے کی تمنا ہزاروں دلوں میں مچلتی رہی؛ لیکن وہ فطری ذہانت، اعلیٰ قابلیت، انتھک محنت، اور مسلسل جدوجہد کے باوجود اس منصب بلند کو نہ پا سکے۔ ایسا رفیع وعظیم مقام، جہاں پہنچ کر انسان خود بخود عظمت کا استعارہ بن جاتا ہے، جہاں اس کے الفاظ کو عزت سے سنا جاتا ہے، جہاں اس کا وقار دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے، اور اس کا وجود احترام وتکریم کا مرکز بن جاتا ہے، دنیا نے انہیں نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا، ان کی شخصیت کو ایک نئے رنگ میں پہچانا، اور جو نگاہیں کبھی ان پر ٹھہرتی بھی نہ تھیں، وہ آج انہی کو عزت ووقار کے ساتھ تکنے لگیں۔

جب ایک ایسا شخص اس مقامِ رفیع پر فائز ہوا، تو دنیا ششدر رہ گئی، نظریں خیرہ ہو گئیں، اور عقلیں حیرت میں ڈوب گئیں، زبانیں بے اختیار پکار اٹھیں: یہ کیسے ممکن ہوا؟ مگر جو لوگ تقدیر کے رازوں سے آگاہ تھے، وہ سمجھ گئے کہ یہ محض انسانی کاوش یا کسی دنیاوی تدبیر کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ ربّ کائنات کی قدرت کا مظہر ہے، جو جسے چاہے، جتنا چاہے، جیسا چاہے نواز دے، یہ اس کا فیصلہ اور اس کا حکم ہے۔

"وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ". (یہ وہی خدائی قانون ہے، جو ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا)۔

لیکن سوال اب بھی اپنی جگہ قائم ہے: یہ سب کیسے ممکن ہوا؟ ایک عام شخص، جسے ابتدا میں کوئی نمایاں ذہانت یا غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل نہیں سمجھا جاتا تھا، اس بلند مرتبے تک کیسے پہنچ سکتا ہے جس پر لوگ رشک کرتے ہیں اور جس کے لیے دلوں میں حسد کے شعلے بھڑکتے ہیں؟

چاہے انسان قضا وقدر پر مکمل یقین رکھتا ہو، اللہ کی صمدیت، قدرت اور قوت سے بخوبی آگاہ ہو؛ لیکن اس کے باوجود عقل سوال اٹھاتی ہے، اسباب وعلل کی کڑیاں جوڑتی ہے، اور نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتی ہے جو منطقی اور مدلل ہوں، تاکہ وہ مطمئن ہو سکے، کیونکہ محض جذبات کی تسکین کافی نہیں، عقل اس سے مطمئن نہیں ہوتی، وہ ہر چیز کو علمی اور منطقی تجزیے کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادی ہوتی ہے، وہ صرف انہی امور کو قبول کرتی ہے جو معقول دلائل سے ہم آہنگ ہوں اور جن میں صحت کا پہلو واضح ہو۔

لہٰذا، ضروری ہے کہ ہم اس معاملے پر تجزیاتی نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ یہ سب کس طرح وقوع پذیر ہوا۔

آیئے ہم اس معاملے کا جائزہ دو پہلوؤں سے لیتے ہیں:

پہلا پہلو: استاذُ الأساتذہ، حضرت مولانا رابع رحمہ اللہ کی شخصیت سے متعلق۔

وہ خود کون تھے؟ ان کے فیصلوں اور انتخاب

کی کیا وقعت تھی؟ انہوں نے مولانا جعفر حسنی اور مولانا بلال حسنی کو اس اہم اور عظیم منصب کے لیے کیوں منتخب کیا جس کی عظمت اور اہمیت سے ہر قریب و بعید واقف ہے؟ کیا یہ انتخاب محض قرابت داری یا ذاتی تعلقات کی بنیاد پر تھا؟

یا پھر یہ انتخاب خالصتاً اُن کی قابلیت اور استحقاق کی بنیاد پر کیا گیا؟ جو گہرے غور و فکر، حالات کا عمیق مطالعہ، انتظامی امور میں بالغ نظری، تدریسی تجربات اور تعلیمی و تنظیمی معاملات میں طویل مدت تک ذمہ داری سنبھالنے اور اس میں پختہ مہارت رکھنے کے بعد سامنے آیا؟ کیا حالات نے خود ان دونوں حضرات کے لیے راستہ ہموار کیا؟ یا انھوں نے خود ایک جست لگا کر اس مرتبے کو حاصل کر لیا؟

اور دوسرا پہلو وہ ہے جو خود مولانا جعفر صاحب کی زندگی اور اس منصب کے لیے ان کی اہلیت و موزونیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس موقع پر ان صبر آزما اور جاں گسل حالات سے چشم پوشی ممکن نہیں، جن سے انتظامیہ اور ہمارے مؤقر و مکرم شیخ، حضرت مولانا رابع صاحب رحمہ اللہ گزرے۔ وہ حالات سخت آزمائش آتش فشاں یا ہمہ گیر زلزلے کی مانند تھے جس نے پورے ادارے کی چولیں ہلا کر رکھ دیں، یا ایسی بے قابو چٹان کی مانند تھے جو پوری شدت، اور بربریت کے ساتھ انتظامیہ اور اس کے ذمہ داران پر ٹوٹ پڑی گویا کوئی بڑا تباہ کن پتھریلا تودہ ہو جسے اُوپر سے طوفانی سیلاب بہا کر لا گرایا ہو۔

اور یہ وہ طوفانی حالات تھے، جن کے آگے، کسی کو گمان نہ تھا کہ کوئی بشر، خواہ کتنا ہی مضبوط اعصاب والا، ہمتی، دلیر کیوں نہ ہو ٹک پائے گا، اور ان مہیب لہروں کا سامنا کر سکے گا — چہ جائیکہ حضرت مولانا رابع صاحب رحمہ اللہ جیسا ایک نحیف و نزار بزرگ شخص، جو بظاہر جسمانی کمزوری کے پیکر تھے۔

لیکن جو شخص ایمان کی راسخ اور متزلزل قوت کا مالک ہو اس کا دل نہ کانپتا ہے نہ اس پر لرزہ طاری ہوتا ہے، وہ نہ دل میں وساوس کو جگہ دیتا ہے، نہ اضطراب اُس کے قلب پر دستک دیتا ہے، یہی حال ہمارے شیخ کا تھا، انہوں نے ان مہیب آفات کے سامنے ایسی ثابت قدمی دکھائی جیسے فولاد کی دیوار ہو جس پر نہ وقت کا طوفان اثر کر سکا، نہ حالات کی شدت۔ نہ زمانہ کی سختیاں اس کا کچھ بگاڑ سکیں، اور نہ ہی وہ تیز و تند آندھیاں اس کے قدموں کو متزلزل کر سکیں جو ہر سبز و خشک کو اکھاڑ لے جا رہی تھیں۔ ان کی باطنی قوت ان آفات سے کہیں بڑھ کر تھی، ان کا عزمِ مصمم اور غیر متزلزل یقین کہ اللہ کا حکم ہی غالب ہے، وہی تمام بندوں کے سیاہ و سفید کا مالک اور ان کے دلوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف ہے — یہی ان کا حقیقی زادِ راہ، اور ان کا اصل ہتھیار تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کا قدم جما دیا اور ادارے کے اصول و منہج پر ایسی استقامت عطا فرمائی جیسی قوت و استقامت ایک مضبوط اور مستحکم پہاڑ کو حاصل ہوتی ہے؛ اور یہ استقامت اور ثابت قدمی آپ کو ورثے میں ملی ہے، آپ کے اسلاف نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اس جواں مردی، استقامت اور حفاظت دین میں اپنی انمٹ قربانیوں کا ثبوت دیا ہے اور انھیں کا خون آپ کی رگوں میں گردش کر رہا ہے، اور جن کی صفات — اعتماد، دلیری، صبر، خاموشی، گہرائی سے سوچنے کا وصف، معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت، اور فیصلے صادر کرنے میں بردباری اور ٹھہراؤ — آپ کے مزاج میں سرایت کر چکی ہیں۔ یہ ساری خوبیاں آپ کے وجود میں یوں گندھ گئی ہیں گویا آپ کے خون میں تحلیل ہو چکی ہوں، اور آپ کی ذات کا جزوِ لاینفک بن چکی ہوں۔ وہ اپنے وقار، صبر اور حوصلے کی چٹان پر اس طرح قائم رہے کہ بڑے بڑے حوادث بھی آپ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے، اور وہ خود سلامت و سربلند رہے۔

اے صاحبانِ فکر! ان حقیقتوں سے چشم پوشی نہ تو شیخ جعفر اور شیخ بلال کے ان عہدوں پر فائز کیے جانے کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے، اور نہ ہی ان کے بعد پیش آنے والے حالات کا درست فہم عطا کرتی ہے۔

جو لوگ ان حالات کے چشم دید گواہ ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جن معاملات کو چھیڑا گیا، وہ کس قدر نازک اور مہلک تھے؛ گویا وہ ایک اندھے فتنے کی شکل اختیار کر گئے تھے — ایسا فتنہ جس میں ہر شخص نے قلم اٹھایا، اور اپنی رائے دینے لگا۔ مناظروں اور مباحثوں کا بازار گرم ہوا، ہر طرف سے الزامات اور بہتان تراشیوں کی بوچھار ہونے لگی... یہ سب دراصل دار العلوم کی اس مضبوط اور مستحکم عمارت کو متزلزل کرنے کی بڑی سازش اور سوچی سمجھی کوشش تھی۔

لہٰذا ان حقائق کو تحقیق سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی ان دو فاضل بھائیوں (مولانا جعفر اور مولانا بلال) کے انتخاب کی حقیقت کو درست طور پر سمجھا جا سکتا ہے، جب تک ہم حضرت مولانا رابع صاحب کی شخصیت، ان نازک حالات کے تاریخی پس منظر، مولانا جعفر صاحب کی شخصیت، اور ان کی اس ذمہ داری کے لیے اہلیت کو پوری گہرائی سے نہ پرکھیں، کیونکہ یہی وہ پہلو ہیں جو ان بحرانوں سے نکلنے کے لیے ایک درست راستہ فراہم کرتے ہیں۔

اکثر لوگ یہ گمان رکھتے ہیں کہ یہ تقرری محض قرابت داری کی بنیاد پر عمل میں آئی، مگر ان کی

نگاہوں پر ہنوز دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں، جو انہیں اصل صورتِ حال کی تہہ تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہیں۔ وہ ایسے شکوک وشبہات کو ہوا دیتے ہیں جو بالآخر ایک اندھے فتنے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں—ایسا فتنہ، جس کی زد میں ایک ایسا قدیم، باوقار اور علمی اعتبار سے راسخ ادارہ آجاتا ہے، جس سے وہ خود وابستہ ہیں، جس پر فخر کرتے ہیں، اور جس کے فیوض و برکات کو اپنی تمام تر کامیابیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ ان شکوک وشبہات کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ نہ تو اس ادارے کے حقیقی منہج سے آشنا ہیں، اور نہ ہی اُن مہلک سازشوں کا شعور رکھتے ہیں جو اسے اپنے ہی وابستگان کی جانب سے درپیش ہیں: حالانکہ خدا کا فرمان ہے: "وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّءُ إِلَّا بِأَهْلِهِ". (اور بُری چال اپنے اپنے ہی چلنے والوں پر الٹتی ہے)۔

اگر وہ ان تمام حقائق کو خلوصِ دل سے سمجھ لیتے، اور ان کی سعی اس جانب ہوتی کہ وہ باہمی اتفاقِ رائے سے ایک ایسی متوازن اور حکیمانہ رائے تک پہنچیں—جو ان کے علمی ادارے کی عقیدتی اساس، فکری منہج، اعلیٰ مقاصد اور عزت و وقار کی حفاظت کر سکے—تو وہ اس کے سوا کسی اور رائے کا انتخاب نہ کرتے جو مولانا رابعؒ صاحب نے اختیار کی، اور جسے حالات نے خود اپنی زبان سے درست ثابت کر دکھایا۔

تاریخ اپنے دھیمے مگر پُرعزم قدموں سے آگے بڑھتی جارہی ہے، اپنے ساتھ نوعِ انسانی کے لیے اس کی کامیابیاں اور کوتاہیاں سمیٹے ہوئے۔ مگر وہ آج بھی اُن اولوالعزم لوگوں کی متلاشی ہے، جو اس کے دبیز پردوں کو چاک کریں، اس کی گم شدہ صداؤں کو سنیں، اور اس کے سینے میں چھپے خزانے نکال کر انسانیت کی رہنمائی کا چراغ روشن کریں۔

کیا آپ نے کبھی تاریخ سے یہ سوال کیا کہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں مولانا رابعؒ صاحب کس قدر نازک، حساس اور فیصلہ کن مرحلے سے گزرے؟ وہ مرحلہ جہاں ہر لمحہ ایک زخم تھا، ہر دن ایک آزمائش، اور ہر رات ایک آہ! دل کرب سے چور، آنکھیں حسرت سے نمناک، اور روح پر الم وافسوس کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

سوچئے! اگر ایک شخص کی محنت سے کمائی گئی دنیاوی دولت یکا یک ضائع ہو جائے، تو وہ دیوانگی کی سرحد کو چھونے لگتا ہے—تو پھر آپ کا کیا خیال ہے اُس انسان کے بارے میں جو نہ صرف اپنی پوری زندگی کی جمع پونجی؛ بلکہ اپنے اسلاف کی جاں نثار کوششوں اور امت کی عظیم میراث کو بکھرتا دیکھ رہا ہو؟ وہ میراث جو اس امت کے جلیل القدر اکابر نے اپنے لہو، اپنی مشقت اور اپنی بے مثال قربانیوں سے سنواری، جو علمی اداروں اور دینی مراکز کی تاریخ میں بے نظیر ہیں۔ ایسی قربانیاں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں! جو علامہ عبدالحی حسنیؒ سے لے کر ڈاکٹر عبد العلیؒ اور شیخ ابو الحسن علی ندویؒ کے مبارک ہاتھوں سے ہوتے ہوئے، شیخ رابعؒ صاحب کے زمانے تک پہنچیں— اب وہ انہی قربانیوں کو بکھرتے، پامال ہوتے، اور اپنے اصل مقصد سے محروم ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں آپ خود بتائیں، اس شخص کی حالت کیا ہوسکتی ہے؟ کیا وہ خاموشی اختیار کر سکتا ہے؟ کیا وہ صرف گوشۂ عافیت کو ترجیح دے کر میدان سے کنارہ کشی اختیار کر سکتا ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا؟ ہرگز نہیں! اگر وہ خاموش ہو جاتے تو بظاہر انھیں چین نصیب ہوسکتا تھا، لیکن ضمیر کی خلش کبھی انھیں آرام نہ لینے دیتی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ خاموشی تاریخ کے ماتھے پر ایک سیاہ دھبہ بن جائے گی، اور ان کی ذات ہمیشہ اس کی چبھن محسوس کرتی رہے گی۔

اور کسے پتہ؟ شاید اللہ تعالیٰ نے مولانا رابعؒ صاحب کو کسی عظیم مقصد کے لیے چُن لیا تھا—ایک ایسے کام کے لیے جسے صرف وہی انجام دے سکتے تھے کوئی دوسرا نہ اسے سمجھ سکتا تھا نہ ہی سنبھال سکتا تھا۔ ربِ علیم نے علمِ غیب میں طے کر رکھا تھا کہ یہ بھاری ذمہ داری صرف وہی اٹھا سکتے ہیں، چنانچہ اُنہی کے ہاتھوں وہ امور انجام پائے جو کسی کے گمان میں بھی نہ تھے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے انہوں نے مخلصین سے مشورہ کیا... اور ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہونا چاہیے کہ مولانا رابعؒ صاحب اور ان کے مخلص مشیرین اس درجہ فہم وفراست تقوی اور اخلاقی بلندی پر فائز تھے کہ وہ ہرگز کسی ایسے شخص کو یہ منصب نہ سونپتے جسے وہ اس کا اہل نہ سمجھتے، چاہے وہ اُن کا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

اے صاحبانِ بصیرت! یہ ہرگز گمان نہ کیجیے کہ مولانا رابعؒ صاحب تن تنہا فیصلے کرتے تھے، یا یہ کہ وہ سارے معاملات بغیر کسی مشورے کے اپنی مرضی کے مطابق دیکھتے تھے......! نہ یہ ان کی عادت تھی، نہ ان کے شایانِ شان تھا، نہ یہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اور نہ ہی خلفائے راشدین کا طریقہ! بلکہ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ حکمِ ربانی کی مخالفت ہوتی، جس میں فرمایا گیا ہے: "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ". (اور مشورہ کیجیے اُن سے امورِ کار میں)۔

جی ہاں! اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن

لوگوں سے مولانا رابعؒ صاحب مشورہ کرتے تھے، جن پر وہ اعتماد کرتے تھے، وہ انہی کے مخلص رفقاء تھے— دل کے شفاف، ارادوں کے پاک، جن کی سوچ ذاتی مفادات سے پاک اور متعصّبانہ جذبات وخیالات سے بہت بلند تھی، اور جن کی آنکھ صرف ادارے کی فلاح، اس کے مشن اور اس کی عزت وبقا پر مرکوز تھی۔

لہٰذا، ہم پر بھی واجب ہے کہ ہم ان پر اعتماد کریں، اور ان کے فیصلوں کو امانت داری کا مظہر سمجھیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا". (بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں)۔

اور اگر ہم اس پورے معاملے کو اس کی اصل گہرائی میں سمجھنا چاہتے ہیں، تو لازم ہے کہ ہم مولانا رابعؒ صاحب کی زندگی اور ان کے امتیازی اوصاف پر سنجیدگی سے غور کریں۔ ایک صاحبِ شعور اور باریک بین نگاہ رکھنے والا شخص، جب ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر غور کرے گا، تو ضرور اُس حقیقت تک پہنچے گا جو عام آنکھوں سے اوجھل ہے۔

مولانا رابع صاحب ... کون ہیں وہ؟

ان کی شخصیت ان تمام تعارفات سے کہیں بلند تر وعمیق تر ہے جو ان کے متعلق لکھے گئے، یا جو ان کے شاگردوں، تلامذہ، اور عقیدت مندوں میں معروف ہوئے۔ وہ فقط ایک عالم دین نہ تھے، بلکہ اسرارِ شریعت کے رمز شناس بھی اور نفسِ انسانی کے نباض بھی۔ وہ عارفِ باطن، زاہد دنیا، اور صاحبِ تدبیر منتظم تھے۔ وہ مؤرخ تھے، مگر فقط کاتبِ تاریخ نہیں؛ بلکہ اس کے باریک بین ناقد۔ وہ ایک کہنہ مشق ادیب، عربی زبان وادب کی گہرائیوں میں غوطہ زن، اور اس کے ایسے ماہر تھے جنھوں نے اس کی زبان، آداب اور جغرافیہ تک میں مہارت حاصل کی۔

انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مطالعے میں بسر کیا۔ ان کے ہم عصر، مثنی میاں— جو ہمارے رفیق عمیر الحسینی کے نانا تھے — کہا کرتے تھے: ''وہ مستقل پڑھتے رہتے تھے، ہر حالت میں مطالعہ جاری رہتا تھا، کھڑے ہوکر، بیٹھ کر، لیٹ کر''۔ اور خود مولانا فرمایا کرتے تھے: ''اتنا پڑھو کہ لوگ تمھیں سنکی کہیں''۔

کثرتِ مطالعہ نے انھیں محض معلومات کے خزانے سے ہی نہیں نوازا، بلکہ وہ ژرف نگاہی بھی عطا کی جو ظواہر کے پردے چاک کر کے حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ ان کے اندر ایک ایسی بصیرت پروان چڑھی جو صرف کتابوں سے نہیں آتی، بلکہ مسلسل غور وفکر، مشاہدے، اخلاص اور اُصحاب علم وفکر اور اہل تقویٰ کی صحبت سے جنم لیتی ہے۔ ان کی تحریروں میں جو گہرائی ہے، ان کی تقریظوں، مقدمات اور مقالات میں جو نکتہ رسی ہے، وہ اسی بصیرت کا پرتو ہے، جس سے ہر قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

انھوں نے تدریس کو محض پیشہ نہیں، زندگی کا وقار اور مقصد بنایا۔ برسوں اپنے وقت کے مقبول و محترم مہتمم ''مولانا محبّ اللہ لاری'' کے دستِ راست رہے، اور جس استقامت سے علمی و انتظامی خدمات سرانجام دیں، وہ خود ایک تاریخ ہے۔ ان کا دائرۂ مشاہدہ صرف کتب تک محدود نہ تھا— بلکہ وہ عرب وعجم کے اسفار میں اپنے خال مکرم، حضرت مولانا علی میاںؒ کے ہمراہ دنیا کے سیاسی، فکری اور تہذیبی مناظر کا عمیق مشاہدہ کرتے رہے۔ ان اسفار نے ان کی فہم وفراست میں ایسی وسعت پیدا کی، جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

انھوں نے اپنی طویل، پُرمغز، بامعنی اور مقصد سے معمور زندگی میں، جسے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دینی اداروں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا، نہ صرف اپنے ادارے بلکہ برصغیر کے متعدد علمی و دینی مراکز کے نشیب وفراز کو قریب سے دیکھا، پرکھا اور سمجھا تھا؛ لیکن وہ ان مناظر سے یوں نہ گزرے جیسے راہ گیر خزاں رسیدہ پتوں پر قدم رکھتا ہوا گزر جائے— نہ بے توجہی سے دیکھا، نہ انھیں معمولی سمجھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ ہر لمحہ بیدار رہے، ہر واقعے کے معانی و اشارات میں غوطہ زن رہے، ہر تجربے کی تلخی و شیرینی کو محسوس کیا، اور ہر لمحے کو بصیرت وعبرت کے خزانے میں محفوظ کیا۔

ان کے نزدیک کوئی سانحہ فقط حادثہ نہیں تھا، کوئی اختلاف محض اتفاقی نہ تھا— بلکہ ہر واقعہ ایک باب تھا، جو اگر ٹھہر کر پڑھا جائے، تو اداروں کے عروج وزوال کی داستانیں آشکار کرتا ہے۔ وہ لمحے جو اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، ان کے لیے رہنمائی کا چراغ بن جاتے۔

وہ ہندوستان کی دینی درسگاہوں کی تاریخ کے صرف قاری نہ تھے، بلکہ اس کے صاحبِ حال تھے۔ انھیں یہ راز معلوم تھا کہ یہ مدارس صرف علم کے مراکز نہیں، بلکہ امت کی شناخت، اس کی روح اور اس کے تحفظ کے قلعے ہیں۔ انھوں نے جانا تھا کہ ان اداروں کو کون سے داخلی تعصّبات، باہمی کشاکشیں اور خارجی سازشیں اندر سے کھوکھلا کر سکتی ہیں؛ اور کس طرح نظریاتی بنیادوں کو کمزور کر کے، دیواروں کو باقی رکھتے ہوئے روح کو مسخ کیا جا سکتا ہے۔

ان پر یہ بھی واضح تھا کہ کچھ عظیم المرتبت

ادارے —— جنہوں نے نسلوں کو تیار کیا، اکابر کو پروان چڑھایا، فکر و نظر کی قندیلیں روشن کیں —— کس طرح محض اقتدار کی کشمکش، مناصب کی حرص، اور کرسیوں کی سیاست کی نذر ہوکر بکھرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کی روحانی تابندگی ماند پڑ گئی، اور وہ اپنے اصل مقصد سے ہٹتے چلے گئے۔

یہ سب تو اپنی جگہ، مگر جو وصف ان کا اور ان کے خانوادہ کا ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہا ہے وہ ہے دنیا کی رنگینیوں سے بے نیازی، اس کی چکا چوند سے بے رغبتی، اس کے فریب انگیز حسن سے اعراض، اور ان چیزوں کو بالکل ہیچ جاننا اور حقیر سمجھنا جنھیں لوگ شان وشوکت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اخلاص ایسا کہ کام میں فنا ہو جانا، تھکن اور اکتاہٹ سے ماورا ہو کر خود کو خدمت کے لیے وقف کر دینا؛ اور اس خدمت کو صرف ایک پیشہ یا فریضہ نہیں، بلکہ عبادت اور قربِ الٰہی کا وسیلہ سمجھنا؛ اس ادارے سے ایسی کامل وابستگی اور بے مثال یکسوئی کہ گویا وہی ان کی زندگی کا محور بن جائے۔

ان کے دل و دماغ پر ایک ہی فکر سوار تھی کہ: اس امانت کا وارث کون ہوگا؟ یہ کام کس کے سپرد کیا جائے؟

یہی وہ اضطراب تھا جو انھیں انبیائے کرام سے ورثے میں ملا تھا، ان کے سامنے حضرت یعقوب علیہ السلام کا وہ لمحہ تازہ رہتا، جب وہ بسترِ مرگ پر اولاد سے پوچھتے ہیں: "مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي" (تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟)۔

یہی فکر سیدنا یعقوب علیہ السلام کو دامن گیر ہوئی کہ: میرے بعد میرے اہلِ خانہ کس راستے پر ہوں گے؟ کس عقیدے پر قائم رہیں گے؟ کون میرے مشن کو سنبھالے گا، اور کس سمت وہ روانہ ہوں گے؟ یہی تو پیغمبروں کی سنت رہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے انجام سے پہلے یہ سوچے کہ اس کے بعد کون ہوگا جو اس کے عقیدے کی صداقت کا امین، اور اس کی زندگی کے راستے کا سچا وارث بنے گا

یہی سنت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بھی تھی، جب امت کی باگ ڈور کسی کے حوالے کرنے کا وقت آیا۔ تو انھوں نے نہایت بصیرت سے دیکھا، جانچا، پرکھا، اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا—اس یقین کے ساتھ کہ یہ مرد باخدا اس امانت کا اہل ہے، اور اس بوجھ کو نبھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تو پھر، جب ایک صاحبِ نظر شخص، ایک سچے خادمِ علم، ایک مصلح، ایک مربی، یہ دیکھے کہ ایک علمی و دینی ادارہ اس کے سپرد ہے—اور وہ ادارہ فتنوں کے نرغے میں ہے، بیرونی آندھیاں اس کی بنیادیں ہلانے پر تلی ہوئی ہیں—تو کیا وہ فکرمند نہ ہو؟ کیا وہ مستقبل کے بارے میں نہ سوچے؟ کیا اس کی نیندیں حرام نہ ہوں؟ یقیناً وہ سوچے گا، تڑپے گا، اور اس امانت کے لیے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگا کہ اے رب! میرے بعد اسے سنبھالنے والا کوئی ایسا ہو جو اس کے بوجھ کو اٹھا سکے، اس کے مشن کو زندہ رکھ سکے۔

وہ اپنے شاگردوں اور وابستگان پر بار بار نگاہ ڈالتے، جو تعداد میں سینکڑوں کیا، ہزاروں سے بھی متجاوز تھے۔ ان میں کیسے کیسے باکمال افراد شامل تھے: کوئی تخلیقی نثر نگار، کوئی فصیح و بلیغ قلمکار، کوئی فنکارانہ مزاج رکھنے والا ادیب، کوئی باریک بین محقق، کوئی گہرے علم کا حامل عالم، کوئی دیانتدار مؤرخ، کوئی حکمت سے لبریز فلسفی، کوئی خوش گفتار محدث، کوئی منظر نگار ناول نگار، کوئی نکتہ چیں مزاح نگار، کوئی دل بہلانے والا خوش طبع، کوئی دردمند مصلح، کوئی فطری شاعر، کوئی بلند نظر سیاست دان، کوئی ہوشیار صحافی، اور کوئی باریک بین مفسرِ قرآن۔

گویا اگر ان تمام عبقری شخصیات کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا، تو دنیا رشک کرتی کہ یہ خوش نصیب شخص کیسے کیسے فضلا اور نابغۂ روزگاروں کا معلم اور مربی رہا۔

تعجب کی کوئی بات نہیں کہ یہ عبقری استاذ (مولانا رابع صاحب) کسی ایک شاگرد پر توجہ مرکوز کریں، اسے اپنے تمام خوابوں کا مرکز بنا دیں، اس پر اپنی ساری توانائیاں صرف کریں، اور اپنی علمی و روحانی وراثت کے بیش قیمت اسرار اس کے حوالے کرنے کا قصد کریں۔

یہ بھی کچھ انہونا نہیں کہ وہ شاگرد یکا یک چمکتا ہوا چاند بن کر ابھرے، یا شہرت و علم کے آسمان پر روشن ستارے کی طرح جگمگانے لگے—لکھے، بولے، کتابیں تصنیف کرے، تدریس کے میدان میں اترے، اور ہر جانب سے مولانا کی طرف تعریفی کلمات اور روشن مستقبل کی نویدیں آئیں۔

لیکن یہ بھی کوئی غیر متوقع بات نہیں کہ وقت کا رنگ بدل جائے، پیمانے الٹ جائیں، اندازے خاک میں مل جائیں۔ عقلیں حیران، دل پریشان، اور دنیا مضمحل ہو جائے، جب وہی چاند سیاہ راتوں میں کھو جائے، اور وہی روشن ستارہ اپنے مدار سے گر کر گمنامی کی وادی میں جا پڑے۔ خیر و شر کی سرحدیں دھندلا جائیں، اور سب کچھ خلط ملط ہو کر رہ جائے، لوگ دیکھتے ہی رہ جائیں، لیکن سمجھ نہ پائیں کہ یہ سب یوں کیوں ہوا۔

اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ یہ سارا معاملہ خود مولانا کے لیے، بلکہ ہر اُس شخص کے لیے جو اپنے معاملے کو خالصتاً خدا کے سپرد کر دیتا ہے، ایک نشانی اور دلیل بن جائے کہ بندہ چاہتا کچھ ہے،

مگر ہوتا وہی ہے جو "فعال لما یرید" چاہتا ہے۔ بندے کا کام تو فقط رضا اور تسلیم ہے، اور یہ یقین رکھنا کہ جو کچھ بھی ہوا، وہی بہتر تھا:

"اللّٰہُ أَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہُ سَیُصِیبُ الَّذِینَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللّٰہِ وَ عَذَابٌ شَدِیدٌ بِمَا كَانُوا یَمْكُرُونَ" (اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کس کو سونپے۔ اور جو مجرم ہیں، ان کے لیے اللہ کے نزدیک رسوائی ہی مقدر ہے)۔

اور یہ بھی قابل تعجب نہیں اگر مولانا خود کو- ان پرفتن اور پر آشوب حالات میں - ایک اندرونی کشمکش کے اندر پائیں، اپنی آراء اور خیالات کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیں، اور سوچیں کہ کیا ہونا چاہیے، اور کیا ہو رہا ہے...

تاریخ سے کہہ دو کہ خاموش رہے، لب نہ کھولے! اپنے سینے میں چھپے راز فاش نہ کرے، کسی کا پردہ چاک نہ کرے، کسی کو رسوا نہ کرے۔ مگر یہ تمنا تمہاری دل میں ہی رہ جائے گی، وہ تمہاری نہیں سنے گی، وہ چپ نہیں رہے گی، کیونکہ اس کا کام ہی واقعات کو بے کم و کاست ضبط کرنا ہے، لمحوں کو ٹھیک ٹھیک رقم کرنا ہے۔

اس کی فطرت میں سچائی ہے، اس کی سرشت میں دیانت ہے— نہ کسی کی رو رعایت، نہ کسی سے تعصب؛ نہ کسی کی خوشنودی کی پروا، نہ کسی کے خفا ہونے کا خوف۔ وہ ہر رنگ و نسل، ہر قوم و ملت سے بے نیاز، سچ بولنے والی، بے لاگ لکھنے والی ہے۔ وہ رواداری اور مبالغے سے پاک، خالص صداقت کی علمبردار ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے، بے باکی سے بے کم و کاست رقم کر دیتی ہے۔

جب انسان کے اعمال مٹتے نہیں— چاہے خیر ہوں یا شر— اور جب وجود میں آنے والی کوئی بھی چیز ختم نہیں ہوتی، جیسے کہ فلسفہ کہتا ہے: "المادۃ لا تنعدم" (مادہ فنا نہیں ہوتا)۔

تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تاریخ سے یہ سچائیاں مٹا دی جائیں؟ تاریخ، جو ہر پل کی امین ہے، جو لمحے لمحے کا حساب رکھتی ہے، وہ ان واقعات کو کیسے فراموش کرسکتی ہے؟ جو مؤرخ حضرت مولانا رابع صاحب رح کی زندگی کے آخری دس سال اور اس ادارے کی تاریخ رقم کرے گا، وہ ان واقعات کا ذکر کئے بغیر اس تاریخ کو مکمل نہیں کر سکتا۔ اس کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اسے نظر انداز کر دے، یا کسی حقیقت کو چھپا دے، کیونکہ تاریخ خاموش ہوسکتی ہے، مگر اندھی نہیں:

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

چنانچہ مولانا کو مسلسل فکر لاحق رہی۔ بار بار استخارہ کرتے رہے، اور اللہ تعالیٰ سے رہنمائی اور توفیق کی دعا کرتے رہے کہ اللہ ان کے قدموں کو استقامت عطا فرمائے، اور انھیں صواب کی راہ دکھائے، خصوصاً اس وقت جب وہ بہت سے ایسے افراد سے مایوس ہو چکے تھے جن سے انھیں بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ لوگ جنھوں نے کتب بینی کی، لکھا، تصنیف کیا، علم کی حقیقتوں سے آگاہی حاصل کی، اقوامِ عالم کی تاریخ اور ان سے متعلق تہذیب و تمدن کا مطالعہ کیا، لیکن جب نازک وقت آیا کہ وہ ادارے کی قیادت سنبھالتے، تو ان کی صلاحیتیں ساتھ چھوڑ گئیں، اور توقعات زمیں بوس ہوگئیں۔ اس صورتِ حال نے ان کے دل میں اہل رجال کی قلت کا احساس اور بھی شدید کر دیا۔

وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اس علمی ادارے کی حفاظت، اس کے عقیدے، اس کے نظریے، اور اس کے منہج کی پاسبانی— اور اسے ہر فتنہ، ہر فساد، اور ہر بگاڑ سے محفوظ رکھنا— آج کے دور کی سب سے اہم ضرورت ہے، اور ان کے نزدیک یہ سب سے بڑی دینی و اخلاقی ذمہ داری تھی۔

اور وہ اپنے آپ کو اس ادارے کے لیے اللہ کے حضور جواب دہ سمجھتے تھے، کیونکہ انھوں نے اس ادارے میں اپنا وقت کسی ذاتی مفاد کے لیے صرف نہیں کیا تھا، نہ رشتہ داروں کے فائدے کے لیے، نہ اپنی حیثیت اور مقام کی تشہیر کے لیے۔

بلکہ انھوں نے اپنی زندگی اس ادارے کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کی بہتری، اس کی ترقی، اس کا وقار— ان کی زندگی کا محور و مرکز تھا۔ وہ اس پر اپنی قیمتی سے قیمتی چیز قربان کر دینے کو تیار رہتے۔ ہر وقت بیدار مغز، روشن نظر، اور فراست سے مالا مال، وہ ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے۔ انھیں وہی بات خوشی دیتی جو ادارے کے لیے مفید ہو، اور وہی شے ان کا سکون چھین لیتی جو اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ ایسی شخصیت سے یہ گمان کیسے کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس ادارے کو بے توجہی کے حوالے کر دیں؟ یا اس کی سمت دوسروں کی خواہشات کے مطابق موڑنے کی اجازت دیں؟ کہ ہر آنے والا اپنے ذوق، اپنی سوچ، اور اپنی اغراض کے مطابق اس کے بنیادی نظریات و اصولوں سے کھلواڑ کرے؟ اس لیے کہ "ندوہ" محض ایک علمی ادارہ نہیں، بلکہ اس کی بنیاد عقیدۂ سلف پر رکھی گئی تھی— جس کے پیشوا صحابۂ کرام، تابعین، فقہاء مجتہدین، اور جلیل القدر محدثین تھے۔ تو لازم تھا کہ اس کی قیادت بھی انہی صفات سے متصف رجال کے سپرد کی جائے— ایسے رجال جن کے بارے میں اندھے اور بینا سب یکساں گواہی دیں، جن کی زندگی کا ہر پہلو لوگوں کے سامنے واضح ہو، اور جن کے ظاہر و باطن میں

کوئی تفاوت نہ ہو۔

مولانا نے ماضی کے ایام میں پیش آنے والے ہر شیریں و تلخ تجربے سے سبق حاصل کیا، اور جو کچھ بھی ان کے پاس تھا— چاہے وہ مال ہو، علمی صلاحیت ہو یا خداداد بصیرت و قابلیت— سب کچھ اس ادارے کی خدمت میں بے دریغ صرف کر دیا، چنانچہ سوچ و فکر نے ان کے دل و دماغ پر پوری طرح قبضہ جما لیا۔ وہ اندر ہی اندر ایک اضطراب میں گھلنے لگے، اور گہرے سکوت میں اپنے گرد کے چہرے ٹٹولنے لگے— کون ہے جو اس مقدس امانت کا بار اٹھانے کا اہل ہو؟ اہلِ علم کی بھیڑ تھی، صلاحیتوں کی فراوانی بھی، لیکن وہ جانتے تھے کہ ہر ذہانت نفع بخش نہیں ہوتی، جب تک اسے تزکیۂ نفس کی تپش اور مجاہدے کا ذائقہ نہ چکھایا گیا ہو۔

کیونکہ دینی قیادت، وہ بھی ایک ایسی قیادت جو روح و دل کی اصلاح کی علمبردار ہو، کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کی جا سکتی جو صرف الفاظ کا فصیح ہو، لیکن دل کی سچائی سے خالی ہو؛ جس نے اپنے باطن کو انکساری، اخلاص، اور فنا فی اللہ کے سانچے میں نہ ڈھالا ہو۔ جو نفس کی ریاضت اور رضائے الٰہی کی جستجو سے ناواقف ہو، اور جس نے انبیائے کرام کی مشابہ تربیت سے اپنی شخصیت کو نہ سنوارا ہو، چنانچہ اب وہ کسی مقرر، ادیب یا مؤلف کی تلاش میں نہ تھے، بلکہ ان کی نگاہیں ایسے شخص کو ڈھونڈ رہی تھیں جو نہ صرف نظریے سے واقف ہو، بلکہ اس پر پوری طرح مطمئن بھی ہو؛ وہ نظریہ جو اس ادارے کی روح ہے، اور جس کے بغیر اس کا وجود ایک بے جان سانس کی مانند ہے۔

وہ دل و دماغ سے ایسے انسان کے متلاشی تھے، جس کی پہچان اس کے ظاہری بیانات سے نہ ہو، بلکہ اس کے اندر کی روشنی سے ہو؛ ایسا شخص جس نے اس نظریے کو محض الفاظ کی حد تک نہیں، بلکہ احساس اور عمل کی حد تک سمجھا ہو؛ جو اس راہ پر ایسا چلا ہو کہ ہر قدم اس کے یقین کا گواہ بن چکا ہو۔ جس کے اندر یہ پیغام خون کی طرح دوڑتا ہو، اور اس کے عمل و سکوت، دونوں میں جھلکتا ہو، اس لیے کہ ندوۃ العلماء محض ایک علمی ادارہ یا اینٹ پتھر سے تعمیر شدہ مکان کا نام نہیں، بلکہ ایک زندہ و بیدار روح کا نام ہے۔ یہ ایک عقیدہ کا نام ہے جس کی جڑیں مضبوط اور مستحکم ہیں، جہاں دل مطمئن ہوتا ہے، ایک عبادت کا نام ہے جو تواتر سے منقول اور ثابت شدہ ہے، جو سراپا خشوع و مناجات ہے، اور ایک ایسا طرزِ سلوک ہے جو دین کی روشنی سے مہذب ہوتا ہے۔ اس کا ایک خاص علمی منہج ہے، ایک سنجیدہ تحقیقی مزاج، اور ایک منفرد دعوتی و اصلاحی اسلوب۔

سو جو بھی اس عظیم امانت کا امین بنے، وہ محض ذہانت یا مہارت کا حامل نہ ہو، بلکہ اس کی شخصیت دین، روحانیت اور اخلاق کی تربیت یافتہ ہو۔ کیونکہ یہاں بات محض نظم و نسق کی نہیں، بلکہ ایمان، عمل اور کردار کی ہے۔ اور اگر ان بنیادی ستونوں میں سے ایک بھی شریعت کے متعین کردہ مقام سے ہٹ جائے، تو پھر وہی ہوتا ہے جو کسی مضبوط عمارت کے کمزور پڑ جانے سے ہوتا ہے— بنیادیں لرزتی ہیں، دیواریں ڈھتی ہیں، اور خواب بکھر جاتے ہیں۔

اور تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اسلام کو سب سے زیادہ زخم انہی ذہین دماغوں سے پہنچا، جو صلاحیت کے تاج تو پہنے ہوئے تھے، مگر جن کے دل میں ایمان کی حرارت اور میراث نبوت سے والہانہ لگاؤ نہ تھا۔

لہٰذا ہمارے شیخ چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہیں— قریب و بعید، بلند و پست، سب کو پرکھتے ہیں— اور آخر کار ان کی بصیرت جا ٹھہرتی ہے ان دو ہستیوں پر، جنہوں نے نہ صرف اس منہج کو پڑھا، بلکہ اس میں جیا، اس کی سانس لی، اس کا رنگ اختیار کیا؛ اور یہ سب کچھ ان کے سامنے، ان کی براہِ راست نگرانی میں ہوا۔ ایک ایک بات اُن کے علم میں رہی، اُن کا عقیدہ، عبادت، دینی بصیرت اور فہمِ شریعت کسی بھی پہلو سے پوشیدہ نہ تھی۔ اُنھیں نہ اُن کے اخلاص میں شک تھا، نہ اُن کی دیانت و فداکاری پر کوئی تذبذب۔

یہ دو شخصیات "شیخ بلال اور شیخ جعفر" کی تھیں۔ دو بدن، مگر ایک روح، ایک قالب، ایک مزاج، ایک نسبت۔ جیسے ہم نے اپنی آنکھوں سے برسوں دیکھا اور عمر بھر مشاہدہ کیا کہ مولانا رابع صاحب اور مولانا واضح صاحب، اگرچہ دو الگ افراد تھے، مگر ان کے دلوں کی دنیا، ان کے اصولوں کی دنیا، ان کے عقائد، عبادات اور طرزِ عمل میں ایسی یگانگت تھی کہ گویا ایک ہی قالب میں ڈھلے ہوں، تمیز کرنا دشوار، فرق کرنا محال۔

چنانچہ مولانا رابع صاحب بخوبی واقف تھے کہ بہت سے علمی ادارے ابتدا میں تقویٰ، اخلاص اور اصولِ حق پر قائم ہوئے تھے، جن کے بانیان دیانت، روحانیت اور سچی دینی بصیرت کے حامل تھے۔ مگر جب وہ رہنما اس دنیا سے رخصت ہوئے، تو ان کی جگہ ایسے افراد نے لی جو اگرچہ اہلِ علم و دانش کہلاتے تھے، مگر دینی گہرائی، روحانیت، اور شریعت کے متوازن مزاج سے خالی تھے، چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ ان اداروں کی اصل شناخت مٹنے لگی، ان کی راہیں بدل گئیں، اور وہ اپنے مقاصد سے دُور جا پڑے۔ یہ

ادارے پھر علم و دین کا مرکز بننے کے بجائے، ہر طرف سے تنازعات اور ٹکراؤ کا میدان بن گئے—ایسا میدان جہاں دین کی روح نہیں، بلکہ نفسانی اغراض، فکری انحراف اور شخصی مفادات غالب آ گئے۔

دوسرا پہلو

کیا مولانا جعفر صاحب کی زندگی اُن صفات سے متصف تھی جس نے اُنہیں اس عظیم منصب کا اہل بنایا؟

مولانا جعفر صاحب کی زندگی

جعفر صاحب نے آنکھ کھولی ایک ایسے گھرانے میں، جو علم، دین اور اخلاص کا گہوارہ تھا—یہ مولانا واضح رشید صاحب کا گھر تھا، جو شیخ ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے بھانجے تھے۔ اُن کی ابتدائی زندگی کے کچھ ایام دہلی میں گزرے، مگر جلد ہی اُن کا خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ یہ محض جغرافیائی تبدیلی یا ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر نہ تھا، بلکہ ایک تہذیبی، فکری اور روحانی ہجرت تھی—زندگی کے ایک طرز سے دوسرے طرز کی طرف، ایک سوچ سے دوسری سوچ کی طرف۔

یہاں ایک نوجوان نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا، جب اُس کے والد نے ایک پرکشش تنخواہ اور آسودہ زندگی کو خیر باد کہہ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایسی ملازمت قبول کی، جو مالی لحاظ سے کہیں کمتر تھی۔ یہ فیصلہ، جو ظاہری دنیا کے پیمانوں سے عقل سے بعید تھا، اُس کے دل و دماغ پر ایک انمٹ نقش چھوڑ گیا—اور وہ لمحہ اس کی شخصیت کی تشکیل کا سنگِ میل ثابت ہوا۔ پہلی زندگی خوشحالی کی راہوں سے جڑی ہوئی تھی—جدید اداروں میں معیاری تعلیم، پھر بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کی امیدیں، عالمی جامعات میں داخلے، اور واپسی پر وہ سماجی وقار اور عزت جو ایسے خوابوں کے تعاقب میں نصیب ہوتی ہے۔ ایک والدین کی اکلوتی اولاد، جس پر گھر کی ساری امیدیں مرکوز ہوں—اس کے لیے یہ سب کچھ حاصل کرنا بظاہر فطری تھا۔

لیکن جس زندگی کی طرف اس خاندان نے رُخ کیا، وہ ایک الگ ہی دنیا تھی—ایسی دنیا جہاں صبر کے چراغ جلتے تھے، اور خواہشاتِ نفس کی زنجیریں توڑی جاتی تھیں، جہاں دل کے اندر چھپے حرص و طمع کے سانپوں کو مارنا پڑتا تھا، اور دل میں قناعت، رضا، اور توکل نے بسیرا کر لیا تھا۔ وہاں زندگی سادگی میں لپٹی ہوئی تھی، اور آنکھیں دنیا کی چمک دمک سے بے نیاز۔ یہ وہ زندگی تھی جو تہجد کے سجدوں سے مہکتی تھی، جو رات کی تاریکیوں میں رب کے نور سے روشن ہوتی تھی۔ یہ دنیا کی لذتوں سے رخ موڑ کر اللہ کی قربت کی طرف بڑھنے کا سفر تھا۔

یہ وہ زندگی تھی جو دنیا کے پیچھے نہیں دوڑتی، بلکہ آخرت کے چراغ روشن کرتی ہے؛ جہاں زندگی کی کامیابی دولت میں نہیں، بلکہ خدا کی رضا میں دیکھی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ اُس عظیم ماموں، شیخ ابوالحسن علی ندویؒ کی تربیت کا اثر تھا جنہوں نے دنیا کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھا، اور اپنی بہن و بھائی کی اولاد کے دلوں میں اس حقیقت کو پیوست کیا کہ دنیا اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی، اصل زندگی وہ ہے جو اللہ کی رضا میں بسر ہو، اور اصل مقام اُنہی کا ہے جو اس رضا کے راستے پر چلتے ہیں، جنہیں ہم اولیاء اور صلحاء کہتے ہیں۔

وہ نئی زندگی جو اس کے حصے میں آئی، اس نے اس پر یہ بھاری ذمہ داری ڈال دی کہ وہ ہر حال میں خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں کے درمیان آئے، اس کے چہرے پر بشاشت ہو، چاہے دل دکھ سے لبریز ہو، گھر میں فاقے ہوں یا دسترخوان خالی ہو۔ اسے سکھایا گیا کہ دنیا کے سامنے کبھی اپنی تنگی و محتاجی کا پردہ نہ چاک کرے، نہ کبھی لبوں پر شکوہ ہو، نہ دل میں گلہ۔ گویا اُس خاندان نے دل سے یہ راز پالیا تھا کہ فقر و زہد دراصل ایک مقدس میراث ہے—نبوی میراث—جسے اہلِ صفا ہی سنبھال پاتے ہیں۔

اسی فقر میں دل کی بے نیازی چھپی تھی، اسی زہد میں ہمت کی بلندی، عزم کی صداقت اور روح کی آزادی پروان چڑھتی تھی۔ کیونکہ جب فقر، روحانی تربیت سے خالی ہو، تو وہ دل کو توڑ دیتا ہے، انسان کو مٹی میں ملا دیتا ہے، اور اس کے عزم کو چھین لیتا ہے۔ ایسا فقر کفر کے قریب لے جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا: "کاد الفقر أن یکون کفرا"، (قریب ہے کہ فقر انسان کو کفر تک لے جائے)۔

لیکن وہی فقر جب نورِ تربیت سے روشن ہو، کسی مردِ کامل کی صحبت میں سانچا جائے، تو وہی فقر، یقین کی انتہا، توکل کی بلند ترین منزل، توحید کا نچوڑ، اور بندگی کی کامل تصویر بن جاتا ہے۔ اگر ہم فقر کی حقیقت پر گفتگو کریں، اس فقر پر جو دلوں کو دنیا کی زنجیروں سے آزاد کر دیتا ہے، اور اس زہد کی بات کریں جو دنیا کی رنگینیوں سے منہ موڑ کر دل کو ربِّ کائنات کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، اور یہ سب کچھ اس حال میں ہو کہ انسان کے پاس دولت کمانے کی مکمل قدرت ہو، تو یقین جانیے، ہم حقیقی روحانی قیادت کی بات کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ وہ گھرانہ، جس نے شیخ عبدالحی، شیخ ابوالحسن، اور شیخ رابع جیسے مردانِ حق کو جنم دیا، وہ کبھی فقیر نہیں ہو سکتا، اگر فقر کو دنیا کی تنگی سے تعبیر کیا جائے۔

دنیا شاہد ہے کہ کتنے ہی لوگ ان کے ذریعے غنی ہوئے، کسی نے ان کی تصانیف کو ذریعہ معاش بنایا، کسی نے ان کا نام بیچ کر مقام و مرتبہ کمایا، اور کسی نے ان کی نسبت کو نفع کا ذریعہ بنایا۔ یہ خانوادہ اگر چاہتا تو اپنی تصانیف، اپنی نسبت اور اپنے مقام کے ذریعے دولت کے انبار لگا سکتا تھا؛ لیکن یہ نفوسِ قدسیہ تھے جن کے لیے مال اور فقر دونوں اپنی حقیقت کھو چکے تھے۔ نہ دولت ان کے لیے محبوب تھی، نہ فقر موجبِ ذلت۔ دولت ان کے نزدیک کوئی مطلوب شے نہ تھی کہ جس کے لیے ایمان بیچا جائے یا کفر کا سہارا لیا جائے، نہ کسی چاپلوسی، نہ کسی چالاکی، نہ کسی مباح یا غیر مباح وسیلے سے اس کا حصول ان کا شیوہ تھا۔

اور فقر... فقر ان کے لیے کوئی تنگی، کوئی ذلت، کوئی محرومی نہ تھا؛ بلکہ فقر ان کے لیے عزت تھا، رفعت تھی، آزادی تھی، وہ دروازہ تھا جس سے بندہ براہِ راست اپنے رب تک پہنچتا ہے۔ وہ لڑکا اپنے والد کے ہمراہ اس تربیت گاہ کی جانب روانہ ہوا تاکہ زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں ان صفات کو سیکھ لے جو ایک صالح انسان کے وجود کو نکھارتی ہیں۔ شیخ جعفر جب دارالعلوم پہنچے تو ایک نہایت سیدھے سادے، اور سنجیدہ طالب علم تھے۔ ان کے ہم جماعتوں کا بیان ہے کہ وہ اکثر کلاس کے ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھا کرتے۔ نہ وہ سوال کرتے، نہ بحث مباحثے میں شریک ہوتے، نہ ہی جلد بازی سے کسی سوال کا جواب دیتے۔

یہ وہ علامات ہیں جنہیں عام طور پر ذہانت، محنت اور فطانت کی دلیل سمجھا جاتا ہے، اور اگر ان کے پیچھے اخلاص، ادب، اور اساتذہ کا احترام نہ ہو تو بسا اوقات یہی چیزیں ظاہری شہرت اور ناموری کے شوق کا اظہار بھی ہوتی ہیں، مگر ان کے رفقائے درس ہمیشہ اس پیمانے سے ناپتے رہے جو ظاہر کی آنکھ دیکھتی ہے: کہ ذہین طالب علم وہی سمجھا جاتا ہے جو سوالات کی بارش کرے، بحث کا میدان گرم رکھے، ہر سوال پر پہل کرے، امتحانات میں اعلیٰ نمبرات حاصل کرے، تقریریں کرے، مضامین لکھے، اساتذہ سے خوب داد سمیٹے، اور اُن کی نگاہِ توجہ کا مرکز بن جائے، ان کی نگاہوں میں شیخ جعفر میں ان میں سے کچھ بھی نہ تھا؛ لیکن وہ نہ جان سکے کہ ان کے درمیان ایک ایسا خاموش چراغ جل رہا ہے جس کی روشنی ابھی پوشیدہ ہے، ایک ایسی شخصیت پروان چڑھ رہی ہے، جس کی اندرونی تعمیر، ان ظاہر پرست نگاہوں کی زد سے ماورا ہے، اس نوجوان میں وہ صفات جنم لے رہی تھیں، جو وقتی نمود سے بلند تر ہوتی ہیں، اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ اسے اس مقام تک لے جانے والی تھیں، جو صرف وہی پا سکتا ہے جسے اللہ اپنے برگزیدہ بندوں میں شامل کرلے۔

جب اس کی تعلیم مکمل ہوئی، اور اس کے رفیقوں کا دورِ تلمذ بھی اپنے اختتام کو پہنچا، تو سب اپنی اپنی راہوں پر روانہ ہو گئے، جس کے لیے جو کچھ مقدر تھا، اسی میں لگ گیا۔ اور شیخ جعفر نے بھی وہی راستہ اختیار کیا، جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا: "كل ميسّر لما خلق له" (کہ ہر شخص کو وہی کام آسان ہوتا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہو)۔

انہوں نے ''مدرسہ عرفانیہ'' میں تدریس سے اپنی زندگی کا آغاز کیا، یہ ان کی زندگی کا ایک نیا مرحلہ تھا— ایک ایسا مرحلہ جو نہایت نازک اور کٹھن تھا، یہ کوئی آسان بات نہیں کہ آدمی اس میدان سے اس حال میں گزرے کہ اس کے دامن پر کسی خلاف ورزی، بے نظمی، یا اخلاقی لغزش کا دھبہ نہ ہو۔ کتنے ہی لوگ استاد بن کر تعلیمی اداروں میں آتے ہیں، مگر جب رخصت ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ کئی طرح کے الزامات جُڑے ہوتے ہیں — کبھی ضوابط کی خلاف ورزی، کبھی تدریسی خیانت، اور کبھی شخصی مفاد کے لیے نظام کا استحصال۔

مگر شیخ جعفر کا دامن ان تمام باتوں سے پاک رہا، نہ تو کبھی یہ سنا گیا کہ انہوں نے کسی کتاب کی تدریس کے لیے کسی ساتھی سے جھگڑا کیا ہو، نہ یہ پایا گیا کہ طلبہ میں مقبول ہونے کی دوڑ میں انہوں نے کسی کی کردارکشی کی ہو، نہ کبھی یہ شکایت ہوئی کہ انہوں نے اپنی تدریسی نشست کو ایسے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہو جو مدرسے کی تعلیمات سے متصادم ہوں یا ان کی ذمہ داری کے خلاف ہوں۔

یہ سب وہ طرزِ عمل ہے جو عام طور پر خود پسندی، شہرت کی طلب، اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی بیماری سے پیدا ہوتا ہے۔

مگر اس انسان کا باطن ان تمام میلوں سے صاف، اور اس کی نیت نکھری ہوئی تھی، یقیناً یہ مرحلہ انسان کے لیے ایک آئینہ ہے، جس میں وہ اپنی سیرت و کردار کی جھلک دیکھتا ہے، اور جو شخص اس مرحلے سے باوقار گزر جائے، جسے خوش اخلاقی، تواضع، ادارے کے ضوابط کی پابندی اور اربابِ کار کا احترام نصیب ہو، تو وہ شخص گویا پہلا اور سب سے کٹھن امتحان کامیابی سے سر کر چکا، اور بڑی ذمہ داریوں کے لیے اپنی راہ ہموار کر چکا۔

یہی وہ پہلا زینہ ہے، مگر سب سے دشوار، جو بلند مقاموں کی طرف لے جاتا ہے، اور جہاں تک شیخ جعفر کا تعلق ہے، تو وہ اس مرحلے سے نہ صرف باعزت اور کامیاب گزرے، بلکہ یوں گزرے کہ ہر دل ان کی سادگی، انکساری اور خوش خُلقی کا اسیر ہو گیا، ایسا اجماعِ محبت کم ہی کسی کے نصیب میں

آتا ہے، مگر ان کے لیے ہر زبان پر تحسین، ہر دل میں عزت، اور ہر نگاہ میں وقار تھا۔

وہ دلوں میں گھر کر گئے، بغیر کسی دعوے یا کوشش کے — محض اپنے اخلاق اور تواضع سے، اور پھر وہ وقت آیا جب انھوں نے اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کا عزم کیا۔ جو کچھ تعلیم کے زمانے میں کسر رہ گئی تھی، اسے پُر کرنے کے لیے وہ علم کی وادی میں گم ہو گیے۔ چنانچہ انہوں نے مسلسل ترقی کی راہ اپنائی، اور علم کی پیاس بجھانے کے لیے کتابوں کا مطالعہ بڑھا دیا، اخبارات اور رسائل کی ورق گردانی ان کی عادت بن گئی— کیونکہ ان کے والد اور چچا دونوں اس میدان کے شہسوار تھے۔

رفتہ رفتہ وہ عربی زبان میں ایک کامیاب اور رواں قلمکار بن گیے، اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے والوں میں بے مثال مقام حاصل کرلیا، اس طرح ان میں اخلاقی اور علمی دونوں پہلوؤں سے خوبیاں بتدریج جمع ہونے لگیں۔ اور درحقیقت تمام اوصاف وخصائل کا طریقہ ہی یہی ہے کہ وہ انسان میں رفتہ رفتہ رچ بس جاتے ہیں، دل میں جگہ بناتے ہیں، اور وقت کے ساتھ مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں؛ لیکن یہ خوبیاں محض کتابوں یا خلوت نشینی سے حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ وہ تو زندگی کی بھٹی سے نکلتی ہیں، لوگوں کے درمیان جینے سے بنتی ہیں، معاشرے کی حقیقتوں سے سیکھتی ہیں، اور عملی زندگی کی صعوبتوں سے نکھرتی ہیں۔

پس کسی شخص میں عفت، پاکیزگی، دیانت، زہد، قناعت اور بلند ہمتی کی کیا قدر و قیمت ہو، اگر وہ گوشہ نشین ہو، لوگوں سے الگ ہو چکا ہو، کسی پہاڑ کے دامن میں جا بیٹھا ہو، تنہا اللہ کا ذکر کر رہا ہو، جہاں نہ انسان بستے ہوں، نہ بازار ہوں، نہ آزمائشیں ہوں— صرف پتھر، درخت یا جنگل کے جانور ہوں؟ ان خوبیوں کی اصل قدر تب ہے جب کوئی شخص لوگوں کے درمیان جیتا ہو، ان کے نیک و بد سے واسطہ رکھتا ہو، ان کی ایذا کو جھیلتا ہو، پھر بھی ان کے لیے بھلائی چاہتا ہو۔ تب ہی وہ اپنے اخلاق، ایثار، محبت، اور تواضع سے دوسروں کے دل جیتتا ہے— اور لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں کہ یہ وہ کچھ کر رہا ہے، جس پر وہ خود قادر نہیں۔

شیخ جعفر اپنی حیاتِ مستعار کے آخری ایام میں سخت ایذا رسانیوں اور پے در پے آزمائشوں کا نشانہ بنے۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے پیش آیا کہ وہ اپنے چچا، مولانا رابع صاحب رح، اور اُن کے موقف کے دفاع میں ایک آہنی دیوار بن کر ڈٹ گئے تھے۔ اُن کے سامنے ایسے ایسے فتنہ خیز حالات آئے، جو مصیبتوں کی نادر اور انوکھی صورتیں لیے ہوئے تھے۔ مگر وہی مصائب اُن کے لیے معلم بنے؛ اُن کے قدموں کو استقامت بخشی، اُن کے ارادوں کو فولادی بنایا، اُن کے نفس کو صیقل کیا، دشمنوں کو شرمندگی و ہزیمت سے دوچار کیا، اور اُن کی ہمت وحوصلے کو رفعت وسربلندی عطا کی۔

درحقیقت، جو دکھ اور مصیبت انسان پر وارد ہوتے ہیں، وہ محض اذیت نہیں ہوتے، بلکہ درپردہ وہ اُس کے باطن کو رذالت، پستی اور کمینگی کی آلودگیوں سے پاک کرتے ہیں؛ غرور، سرکشی، جذبات کی حدت اور ناپختگی کو توڑ کر اُس کے باطن کو جِلا عطا کرتے ہیں۔ تب انسان میں ایک نئے اخلاقی وجود کی جلوہ گری ہوتی ہے، وہ ایسا نورانی پیکر بن کر سامنے آتا ہے کہ جس کا باطن ملائکۂ قدسیین سے ہمسری کرتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے نفسِ امّارہ کو مغلوب کر چکا ہوتا ہے، اور اپنی پیشانی کو سراپا اخلاص کے ساتھ بارگاہِ ربّ العزت میں جھکا چکا ہوتا ہے؛ وہ احسان کے مقام پر فائز ہوتا ہے، اُس عروۂ وُثقیٰ کو مضبوطی سے تھامے ہوتا ہے جس کو کبھی انقطاع نہیں، اور اپنی بندگی وعبادت کو یکسر خالص اللہ کے لیے وقف کر چکا ہوتا ہے۔

پس وہ اس درجے پر فائز ہو جاتا ہے کہ فرشتے بھی اُس کی حالتِ بندگی پر رشک کرنے لگتے ہیں، یہی ہے تربیت کا وہ معجزہ، جس پر کم ہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ تربیت انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے، پھر اُسے ایسے دھوتی، پاک کرتی اور نکھارتی ہے جیسے ایک شفیق ماں اپنے شیر خوار بچے کو نہلاتی، صاف کرتی اور محبت سے سنوارتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کا باطن نورِ خداوندی سے جگمگا اُٹھتا ہے، اور اس کا ظاہر اصحابِ کرم وتقویٰ کے اوصاف سے آراستہ ہو جاتا ہے، چنانچہ شیخ جعفر کی شخصیت کی تشکیل اور تربیت میں بھی متعدد عوامل باہم اثر انداز ہوئے— وہ عناصر جو انسانی مزاج اور سیرت کی ساخت میں حصہ لیتے ہیں، اسے بناتے، سنوارتے، اور اس کی زندگی میں خوشگوار یا ناگوار نقوش چھوڑ جاتے ہیں؛ اور یہ عوامل اتنے کثیر اور متنوع ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک خطیب، یا مقرر، یا کوئی دانا اور تجربہ کار شخص ایک جملہ کہہ دیتا ہے، اور وہ ایک سادا سی بات تمہاری پوری زندگی کا رخ بدل دیتی ہے، یا تم کسی کتاب میں ایک جملہ پڑھ لیتے ہو، جس پر ابتدا میں توجہ نہیں جاتی، مگر وہ دل کی گہرائی میں جا ٹھہرتا ہے، اور تمہاری زندگی کی سمت پر سب سے زیادہ اثر ڈال دیتا ہے، یا کسی باکمال شخص کی چند روزہ صحبت تمھیں نصیب ہوتی ہے، اور پھر تمہاری صبح و شام میں اس کی جھلک

یوں ظاہر ہوتی ہے جیسے تم اسی کا ایک حصہ بن چکے ہو، اور کبھی نہ کوئی بات سنی جاتی ہے، نہ کچھ پڑھا جاتا ہے، بس نگاہ کسی ایسے اللہ والے پر پڑتی ہے جسے اللہ نے اپنی خاص عنایت سے نوازا ہو؛ اس کی سیرت وصورت دل کو ایسا بھا جاتی ہے کہ انسان اس میں ڈوب جاتا ہے، اُس کی شخصیت آنکھوں کو لبھاتی ہے، اور وہی شخص انسان کے لیے نمونہ عمل بن جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شخصیت کی تعمیر میں اثر انداز ہونے والے اسباب تو بیشمار ہیں، مگر انہیں تین بنیادی عوامل میں سمیٹا جاسکتا ہے:

پہلا عامل: موروثی اوصاف و خصائص

انسان کی رگوں میں دوڑنے والا خون، اپنے فطری اثرات سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔ وہ ہر لمحہ، ہر سانس میں اپنا نشان چھوڑتا ہے، اپنی اصل کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ شیخ جعفر، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی پاکیزہ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ دینِ حق بھی انہیں اسی وراثتی تسلسل کے ذریعے عطا ہوا، ایک مبارک اور غیر منقطع زنجیر، جو براہِ راست رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوکر نسل در نسل ہوتی ہوئی ان تک پہنچی۔ نہ اس نسبت میں کوئی انقطاع رہا، نہ سند میں کوئی خلل واقع ہوا۔

یوں وہ گویا دینِ فطرت اور خُلقِ کریم اپنے لہو میں لے کر پیدا ہوئے۔ ان صفات کے حصول کے لیے نہ انہیں کسی ریاضت کی حاجت تھی، نہ مجاہدے کی ضرورت۔ البتہ، ایک دانا و بینا تربیت نے ان اوصاف کو صیقل کیا، ان کی اندرونی خوبیوں کو نکھارا، اور ان کے باطن کی روشنی کو اور بھی تابندہ کر دیا، جیسا کہ مشہور ادیب و فلسفی، عباس محمود العقاد نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ اسلام سے قبل بھی صدیق تھے اور اسلام کے بعد بھی ویسے ہی رہے...'' گویا صدق، عفت، امانت، پاکیزگی، وفا اور ایثار جیسی صفات محض خارجی اثرات کا نتیجہ نہ تھیں، بلکہ ان کی فطرت کا آئینہ، اور ان کے باطن کی صداقت کا مظہر تھیں۔

یہی مفہوم اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جلوہ گر ہے: "الناسُ معادنُ كمعادنِ الذهبِ والفضةِ، خيارُهم في الجاهليةِ خيارُهم في الإسلامِ إذا فَقِهوا" (لوگ کان کی مانند ہوتے ہیں، جیسے سونا اور چاندی؛ جاہلیت میں جو بہتر ہوتے ہیں، اسلام میں بھی وہی بہتر ثابت ہوتے ہیں)۔

پس دین اور اس کے جوہر ان کے مزاج میں سرایت کیے ہوئے تھے، اور ان کے خانوادے میں اس پر عمل پیرا ہونا ایک جاری وساری روایت تھی، جو بغیر کسی تعطل وانقطاع کے نسل درنسل منتقل ہوتی رہی۔

دوسرا عامل: ماحول

نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان کی شخصیت کی تشکیل میں ماحول کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے جو انسان پر مسلسل اثر انداز ہوتا رہتا ہے— خواہ وہ ان اثرات کو شعوری طور پر محسوس کرے یا لاشعوری طور پر ان میں ڈھلتا چلا جائے۔

جس فضا میں شیخ جعفر نے آنکھیں کھولیں، جس ماحول میں وہ پرورش پاتے رہے— وہ دین کی روح سے لبریز فضا تھی: جہاں شعائرِ الٰہی کا احترام رگ و پے میں بسا ہوا تھا، عقیدہ درست، راسخ اور بے آمیز تھا، سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو مرکزِ زندگی بنایا جاتا تھا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت نسلوں میں رچی بسی تھی، دنیا اور اس کی رعنائیوں کو بے وقعت سمجھا جاتا تھا، اور ذکرِ الٰہی کی خوشبو خلوت وجلوت میں مہکتی تھی۔ یہ وہ فضا تھی جہاں گناہوں سے — خواہ وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ— نفرت کی جاتی، اور ان سے بچنے کا جذبہ فطری تربیت کا حصہ تھا۔

تیسرا عامل: تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت وہ بھٹی ہے جس میں انسانی شخصیت کو صیقل کیا جاتا ہے، ایک مخصوص سانچہ میں اس کی فطرت، رجحان اور استعداد کو ڈھالا جاتا ہے۔ یہی وہ عامل ہے جو سب پر سبقت لے جاتا ہے، سب سے زیادہ مؤثر، سب سے گہرا اثر چھوڑنے والا۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی جانور بھی مناسب تربیت پالے تو وہ نفع رساں، خدمت گزار اور کارآمد بن جاتا ہے۔ اور اگر نگاہ اٹھا کر دنیا کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالی جائے، تو جو کچھ ہمیں تہذیب، ترقی، حسنِ معاشرت اور رفعتِ انسانی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے— وہ سب اسی تعلیم وتربیت کی دین ہے۔

شیخ جعفر نے بھی اپنے علم کا بیشتر سرمایۂ عظیم اساتذہ کی صحبتوں سے حاصل کیا، اور سیرت و کردار کی آبیاری اپنے گھرانے کی پاکیزہ فضا سے پائی۔ ان کی تربیت صرف نصابی نہ تھی، بلکہ ایک زندہ، محسوس، روحانی تجربہ تھی، جو سینہ بہ سینہ، دل سے دل تک منتقل ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ''تربیت'' کوئی خشک اصطلاح نہیں، نہ ہی کوئی لغوی تعریف اس کے حسن کو سمیٹ سکتی ہے۔ یہ تو ایک نور ہے، ایک راز ہے— ایک الہامی عطیہ— جسے رب تعالیٰ اپنے چنیدہ بندوں کے لیے مخصوص کرتا ہے۔ یہی راز ہے جس کے لیے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا گیا، تاکہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت سکھائیں، اور

ان کے دلوں کو تزکیہ کی روشنی سے منور کریں۔ اور اس عظیم راز کی سب سے حسین تجلی خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، جنہوں نے اپنے بارے میں خود فرمایا:

"أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي" یعنی (میرے رب نے مجھے ادب سکھایا، اور کیا ہی خوب سکھایا)۔

یوں تربیت، صرف سیکھنے کا نام نہیں، بلکہ وہ جمالیاتی سفر ہے جو انسان کو اپنے خالق کے قریب لے جاتا ہے، اور اُسے محض ایک مخلوق سے پیکرِ کمال بنا دیتا ہے، بطور مثال، میں آپ کے سامنے حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ کا تذکرہ کرتا ہوں ـــ وہ عظیم المرتبت ہستی جن کی سیرت پر مولانا محمد ثانیؒ صاحب نے ایک جامع، اور وقیع کتاب تحریر فرمائی، اور جسے بعد ازاں شیخ جعفر رح نے نہایت سلیقے اور فصاحت کے ساتھ عربی قالب میں منتقل کیا۔

حضرت مولانا یوسفؒ کی شخصیت اپنے والدِ محترم کی حیاتِ مبارکہ میں اس شان سے ظاہر نہ ہوسکی، لیکن جب والد کا سایہ سر سے اٹھا اور تاریخ کے منظرنامے پر ان کی ذات جلوہ گر ہوئی، تو عقل ودانش کی دنیا ششدر رہ گئی!

ہمارے مربی ومحسن حضرت مولانا رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: "ہم نے اُن جیسا شخص نہ عرب میں دیکھا، نہ عجم میں"۔

حضرت مولانا یوسفؒ رحمہ اللہ، اللہ پر غیر متزلزل ایمان، اس کے وعدوں پر کامل یقین، اسی پر توکل، مصائب میں صبر، اصولوں پر ثبات، اور حالاتِ زمانہ خواہ موافق ہوں یا مخالف سے مکمل بے نیازی کی ایک زندہ وتابندہ مثال تھے۔ وہ خلائق کی مدح وذم سے بالاتر، اور محض رضائے الٰہی کے طالب تھے۔ جو ان کے پاس بیٹھتا، دنیا اور اس کی چمک کو بھول جاتا؛ یوں محسوس ہوتا جیسے رب کے مقرب بندے فرشتوں کی سی پاکیزگی کے ساتھ انسانی قالب میں چلتے پھرتے ہوں، ان کی زبان سے صرف صداقت ٹپکتی، اور ان کے وجود سے انوارِ الٰہی کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔

شیخ ابو الحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں: "مجھے اسلامی دنیا کے کئی جلیل القدر علما، صاحبانِ فضل و کمال، بالخصوص عرب دنیا کی عظیم علمی وفکری شخصیات سے ملاقات، ہم کلامی، اور گہرے تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ میں نے ان کی تحریکات کا مطالعہ کیا، ان کے افکار کو قریب سے جانچا اور پرکھا، اور ان کی زندگیوں کو بغور دیکھا۔ اس بھرپور تجربے کی بنیاد پر میں پورے اعتماد ووثوق سے کہتا ہوں: میں نے کسی کو ایسا نہ پایا جسے اللہ تعالیٰ نے غیب پر ایسا غیر متزلزل ایمان، دعوتِ دین سے ایسی والہانہ وابستگی، اس میں ایسا انہماک، اور دلوں پر ایسی گہری، مؤثر اور روح میں اتر جانے والی تاثیر عطا کی ہو، جیسا کہ شیخ محمد یوسفؒ کو عطا فرمایا گیا تھا"۔

آخر یہ دلوں کو مسخر کرنے والی شخصیت، یہ روح کو چھو لینے والی تاثیر، یہ اخلاص سے معمور وجود ـــ ان سب کا راز کیا تھا؟

یہ اوصافِ حمیدہ کہاں سے آئے؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے: "صالح تربیت"۔ شیخ جعفر خود اسی تربیتِ صالحہ کا ایک پختہ، مہکتا اور نایاب پھل تھے، ایک نیک سیرت والد، پاکیزہ فطرت جد امجد، اور ایک صالح نسل کا تسلسل: "وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ"۔

اور میں نے آپ کے سامنے حضرت مولانا یوسفؒ کی مثال اسی لیے پیش کی؛ تاکہ یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ جو بلند مقام ورفعت اور علمی و روحانی عظمت اُنہوں نے اپنے عہد کے جلیل القدر اکابر علماء کے درمیان حاصل کیا، اور جس قدر اُنہوں نے دعوت وارشاد کے میدان میں عظیم الشان خدمات انجام دیں، اور ان کی جماعت نے تبلیغ و اشاعت دین، وسعت و استحکام، ترقی وسربلندی کی جن عظمتوں اور دور دراز اسفار کی جن مسافتوں کو طے کیا کسی کو اُن کے والد ماجد کی حیات میں اس کا گمان تک نہ تھا نہ کوئی اس کی پیشین گوئی کرسکتا تھا۔

والد کی حیات میں ان کی شخصیت پسِ پردہ تھی، ان کی صفات وکمالات پردۂ خفا میں مستور تھے، وہ گویا ایک خاموش، چھپی ہوئی استعداد تھے جو ابھی ظہور کے مرحلے میں نہ آئی تھی؛ لیکن جوں ہی والد کا انتقال ہوا، تو وہ تاریخ کے افق پر یوں جلوہ گر ہوئے جیسے اچانک ایک درخشاں ستارہ طلوع ہو، اور بقول شاعر:

كأنك شمس والملوك كواكب
إذا طلعت لم يبد منهن كوكب

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

اور پھر چند ہی برسوں میں، اور نہایت مختصر مدت میں، اُنہوں نے علم، دعوت اور تبلیغ کے میدان میں جو اثرات قائم کیے، جو نقوش چھوڑے، اور خصوصاً برِصغیر میں جس قوت اور تاثیر کے ساتھ کام کیا، وہ خود اپنی مثال تھا ـــ ایسی اثر انگریزی، ایسی جد وجہد، اور ایسی خداداد مقبولیت، جو صرف اللہ کے خالص بندوں کا حصہ ہوا کرتی ہے، خاص طور پر برصغیر میں، جہاں ان کے دعوتی واصلاحی کارناموں نے رفتہ رفتہ ایک انقلاب کی صورت اختیار کر لی، ایک سیلِ رواں کی طرح

چلی، اور دلوں کو مسخر کرتی چلی گئی۔ یہ سب کچھ سب سے پہلے تو اس صالح تربیت کا فیض تھا جس نے ان کے دل و دماغ کو ایمان، توکل، ایثار اور استقامت کے سانچے میں ڈھالا تھا، اور پھر اس عمل کی وراثت کا اثر تھا جس کے لیے اُن کے والد مرحوم نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔

یہ نسبت دوہری تھی: ایک پدرانہ، نسلی اور طبعی، اور دوسری روحانی، دینی اور تربیتی۔ پہلی نسبت نے ان کو اس کام سے اس طور پر جوڑ دیا کہ گویا وہ اسی کے لیے پیدا کیے گئے تھے، اور دوسری نسبت نے ان کے قدموں کو ثابت رکھا، اور ہر قسم کی فکری کمزوری، اخلاقی زوال اور عملی انحراف سے محفوظ رکھا۔

درحقیقت، وہی تربیت جو بالغ نظر، دوراندیش اور حکمت سے معمور ہو، انسان کی شخصیت کو سنوارتی، اس کے باطن کو جلا دیتی، اور اُسے امامت و قیادت کے منصب جلیل کے لیے تیار کرتی ہے۔ اس لیے کہ انسانی نفس جب تک تہذیب و تزکیہ کے سانچے میں نہ ڈھلے، اُس وقت تک وہ شر و فساد کا منبع، اور اخلاقی زوال کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایسے انسان میں کم ظرفی اور اخلاقی پستی انگڑائیاں لیتی ہے، لالچ اور طمع دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں، معمولی اور بے قیمت چیزوں میں انہماک انسان کی بصیرت کو ماند کر دیتا ہے، مروّت اور حیا کے تقاضے پامال ہوتے ہیں، رشتہ داریاں ٹوٹتی ہیں، دلوں میں دراڑیں پڑتی ہیں، اور افترا و بہتان، جھوٹ و فریب جیسے مہلک گناہ بے خوفی کے ساتھ سر اٹھاتے ہیں—وہ تمام اخلاقی بیماریاں، جو محبت، اخوت، اور انسانی ہمدردی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں، نشو و نما پاتی ہیں، اور وہ تمام رجحانات، جو انسان کو انسانیت کے مقامِ بلند سے گرا کر حیوانیت کی پستیوں میں دھکیل دیتے ہیں، سر اٹھاتے ہیں۔ دل سخت ہو جاتے ہیں، نگاہوں سے شرم و حیا کا نور رخصت ہو جاتا ہے، اور وہ لطیف جذبات جو ایک پاکیزہ سماج کی پہچان ہیں، دم توڑنے لگتے ہیں۔

لیکن اگر یہی نفس اصلاح و تہذیب سے آراستہ ہو جائے، تو وہ محبت و ایثار، صبر و تحمل، عفو و درگزر، احترامِ آدمیت اور خیرِ خلق کی طلب سے سرشار ہو جاتا ہے، یہی وہ پر اثر، خاموش لیکن نتیجہ خیز تربیت تھی جو شیخ جعفر کو اُن کے دادا، چچا اور والد بزرگوار سے وراثت میں ملی، اور جس نے اُنہیں اُس بلند پایہ مقام تک پہنچایا، جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے مسک الختام بنایا، اور جس کے ذریعے اُن کا ذکر ہمیشہ کے لیے زندہ و تابندہ ہو گیا۔

تقدیر نے کروٹ لی، اور انہیں اس مسندِ جلیل پر متمکن کر دیا جس پر یکے بعد دیگرے ان کے اجدادِ عظام اور اکابرِ ملّت رونق افروز ہوتے رہے تھے، تاکہ رخصت کے وقت یہ منصب اُن کے لیے نشانِ افتخار ہو، اور وہ اپنے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے ہوئے انہی کے اوصاف و شمائل کا امین بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بھی وہی عزت و سرفرازی مقدر کر رکھی تھی، جو ان کے والدِ ماجد، چچا محترم اور جدِّ بزرگوار کو مرحمت ہوئی تھی۔ اُس ربِ کائنات نے انھیں اس عظیم ادارے (ندوۃ العلماء) کی خدمت سے سرفراز فرمایا، جس کی بنیادوں میں ان کے عظیم اکابر: علامہ عبدالحی حسنی، ڈاکٹر عبدالعلی حسنی، شیخ ابوالحسن علی ندوی، شیخ رابع حسنی اور شیخ واضح رشید رحمہم اللہ کی عمریں گھل گئیں، جنہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں اس عظیم ادارے کے لیے صرف کر دیں، اور اپنے خونِ جگر سے جس کی آبیاری کی، اس طرح وہ اس زرّیں سلسلۂ فضیلت کی ایک سنہری کڑی بن گیے، اور اس درخشندہ تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش ورق۔

خُدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اے میرے محبّت بھرے رفیق! میں نے یہ چند سطریں آپ کیلیے اس لیے رقم کیں کہ آپ کے والدِ محترم کا مجھ پر ایک اخلاقی اور قلبی حق تھا۔ جن کی محبت اور شفقت کا سایہ برسوں میرے ہمراہ رہا، میں اُن کے محبوب ترین شاگردوں میں تھا، اور جب قاہرہ میں اُنہوں نے اپنی کتاب مجھے ہدیہ کی، تو اس پر جو محبت آمیز کلمات رقم کیے، وہ آج بھی میرے لیے فخر و سعادت کا باعث ہیں—اگرچہ اس کے ذکر سے حیا مانع ہے، مگر دل اُس نسبت پر ہمیشہ نازاں رہے گا۔

میں اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کے مراتب کو علیّین میں بلند فرمائے، آپ کی خدمات کو قبول فرمائے، اور اُن پاکیزہ روحوں میں آپ کو جگہ دے جن کے قدموں کے نشان آپ کو ورثے میں ملے تھے۔

اے عزیز! قلم کو لکھنے دیں، زبان کو بولنے دیں دل کو غم اٹھانے دیں— آپ تو رخصت ہو ے اور راحت و سکون کی آغوش میں جا پہنچے:

أرى الموت يعتام الكرام ويصطفي
عقيلة مال الفاحش المتشدِّدِ

(موت اُنہی کو چنتی ہے جو کرامت و مروّت کے پیکر ہوں، جن کی زندگیاں سخاوت، محبت اور وقار کی خوشبو سے معطر ہوں؛ اور بخیلوں کے مال سے بھی وہی جو ہر چھین لیتی ہے جوان کے دل سے سب سے زیادہ وابستہ ہوتا ہے)۔ ☆☆☆

چراغِ راہ

مولانا محمد حسن ندوی☆

۱۵ر جنوری ۲۰۲۵ء کی شام عشاء کے قریب میرے ایک محسن کا فون آیا کہ خبر ملی ہے کہ مولانا جعفر صاحب کو سڑک کے کنارے ایک تیز رفتار کار نے ٹکر ماردی ہے جس سے ان کو سخت چوٹ لگی ہے، وہ ہسپتال پہنچا دیے گئے ہیں، یہ سن کر فوراً ہسپتال پہنچے، جہاں اہل تعلق کی ایک بڑی تعداد پہنچ چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ مولانا کا انتقال ہوگیا اور آپ نے تقدیر الٰہی کے فیصلے سے جام شہادت نوش فرمالیا۔ اس خبر نے ان کے جگر گوشوں، اہل خاندان اور اہل تعلق کو ناقابل بیان کیفیت میں مبتلا کردیا، دل تڑپ گئے، آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور سب لوگ دم بخود ہوکر دیر تک خدا سے مغفرت کی دعائیں کرتے رہے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی کی پیدائش ۱۹۶۰ء دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی کی بستی میں ہوئی جو بستی اس وقت آسمان علم وادب کی عظیم ہستیوں سے اور علمائے ربانیین سے جگمگا رہی تھی اور قدوسی صفات اللہ کے بندوں کے علم وعمل کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، لکھنؤ میں محبوب العلماء والاولیاء ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی کے گھر پر اساطین امت کی آمد ہوتی رہتی تھی، دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تمام بزرگوں اور اہل علم کے نور نظر بن چکے تھے جن کی تحریریں دنیا میں انقلاب آفریں نگاہوں سے دیکھی جا رہی تھیں، ان دو ہستیوں کے زیر سایہ کچھ لعل وجواہر بھی تھے جن کو تاریخ مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ، مولانا سید رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی، مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمہم اللہ کے نام سے جانتی ہے۔

آخر الذکر حضرت مولانا سید واضح رشید ندوی کے فرزند ارجمند مولانا سید جعفر مسعود حسنی ہیں، مولانا مرحوم انہی پاک طینت ہستیوں کے گود کے کھلائے ہوئے اور ان کی تربیت کے پروردہ تھے۔ ابتدائی تعلیم والدین کے زیر سایہ اور اس نیک گھرانے کے ماحول میں ہوئی۔ عالمیت کی تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی عالمی درس گاہ میں اپنے زمانہ کے ماہرین اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا جن سے مکمل طور پر مستفید ہونے کا موقع میسر ہوا۔ ۱۹۸۳ء میں ندوۃ العلماء سے فضیلت سے فراغت کے بعد بیرون ملک کی دانش گاہ جامعۃ الملک سعود کے زیر انتظام ٹیچرز ٹریننگ کورس مکمل کیا پھر اپنے وطن واپس آکر اپنے سلف کے طریقہ پر مدرسہ عالیہ عرفانیہ چوک لکھنؤ سے درس وتدرس کے ذریعہ اپنی علمی عملی زندگی کا آغاز کیا اور اس ذمہ داری کو پوری مستعدی اور امانت داری کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ درس تدریس کی خدمت کے ساتھ ساتھ والد صاحب مرحوم کی تربیت اور خاندان کے بزرگوں کی صحبت سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا اور ان کی رہنمائی لی، اپنی تحریر وتدریس کے کارواں کو آگے بڑھاتے رہے۔

والد صاحب جن کو مردم سازی کا بڑا ہنر تھا، ان کے سینے میں امت کے لیے ایسا بے چین ومضطرب دل تھا جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور صحابہ کی عشق ومحبت سے لب ریز تھا، جن میں ہمہ وقت دین کے غلبہ کا جذبہ موجزن رہتا تھا، بیٹے کی ذات پر والد صاحب کی شخصیت نے گہرا اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت کم وقت میں والد محترم کی فکر وتحریر کے سچے ترجمان بن گئے اور ان کی تحریروں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا جانے لگا اور ان کا شمار بھی عربی اردو ادب کے ماہرین میں ہونے لگا۔ دونوں زبانوں میں مولانا کے قلم سے شاہکار مضامین نکلتے رہے اور انہوں نے کئی اہم کتابوں کے ترجمے بھی عربی زبان میں کیے جو اہل علم کے نزدیک وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

مولانا جعفر صاحب درس تدریس اور زبان وقلم کی ذمہ داری میں ہمہ تن مصروف تھے کہ گردش ایام نے کروٹ لی اور ان کے چچا زاد بھائی، ندوۃ العلماء کے سابق ناظر عام جناب مولانا سید حمزہ حسنی نے معمولی علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور پورے ایک سال کے بعد عم محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سابق ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا سانحہ ارتحال پیش آیا جو حسنی روایات کے امین اور فکر ابوالحسن کے ترجمان تھے۔ غیر متوقع طور پر یکے بعد دیگرے ندوہ کی اتنی اہم شخصیات کے فوت ہونے سے ایک ادارہ

☆استاد مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی

اور ملک وملت کا ایسا خسارہ پیش آیا جس کو اللہ تعالیٰ ہی پر کرنے پر قادر ہے۔ چنانچہ ان پرخطر حالات میں شوریٰ نے ناظم کی حیثیت سے حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی اطال اللہ بقاءہ کا نام گرامی منتخب کیا اور ناظر عام کا عہدہ جناب مولانا سید جعفر مسعود حسنی کو سونپا گیا۔ مولانا نے وقت کا تقاضا سمجھ کر اس ذمہ داری کو قبول کیا حالانکہ انتظامی چیزوں سے اس سے پہلے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مولانا جعفر صاحب بڑے فعال اور باہمت تھے۔ اپنے تمام کام خود کرتے تھے اور کرنے میں تکان محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ میدان عمل میں آئے، اخلاص کی وجہ سے تمام ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ اس ذمہ داری کے قبول کرنے کے بعد مدارس اور مکاتب کے ذمہ داروں کی طرف سے دینی جلسوں کی صدارت اور خطابت کے تقاضے آنے شروع ہوئے تو ان دینی جلسوں کی شرکت کو باعث نجات سمجھ کر حاضر ہوئے اور بڑے پرمغز خطابات ارشاد فرماتے جس سے عوام وخواص سبھی مستفید ہوتے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اہم شاخ مدرسہ فلاح المسلمین کا ان کو ناظم بنایا گیا، یہ ادارہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے بھانجوں کے خون و پسینے کا آراستہ کیا ہوا چمن ہے اور دارالعلوم کی اولین شاخوں میں ہے۔ مولانا مرحوم اس کی اصلاح کی فکر دامن گیر تھی؛ لیکن وہ اس کے لیے کچھ زیادہ نہ کر پائے تھے کہ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

مولانا مرحوم کی خاص صفت ان کی تواضع اور عالی ظرفی ہے، وہ اپنے چھوٹوں سے بڑی مہربانی کا معاملہ فرماتے اور بہت اعتماد کا اظہار کرتے، جب کوئی گفتگو کرنا چاہتا تو ہمیشہ اچھی طریقہ سے پوری توجہ سے بات کو سنتے اور مناسب مشورہ دیتے، علاقہ میں اپنے چھوٹوں کی خیریت لیتے، بیماروں کی عیادت کرتے، کمزوروں غریبوں کی ضرورت کو پورا کرتے، سچائی یہ ہے کہ وہ ان صفات عالیہ کا عکس جمیل تھے جس پر اللہ نے اپنے بندوں کی نصرت واعانت کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے وہ اپنے تمام دینی کاموں میں پورے عزم واستقلال کے ساتھ بڑھتے رہے، رائے بریلی تکیہ کلاں میں ان کی آبائی جائیدادیں ہیں جس کی دیکھ بھال مولانا مرحوم کے ذمہ تھی جسے وہ پوری امانت داری کے ساتھ انجام دیتے رہے، ہم نے دیکھا کہ باغات اور کھیتوں کی بڑی اصلاح کی اور ان کو اچھا اور بہتر کرنے کی کوشش کرتے رہے اور تجارت کے مختلف راستے اختیار کیے تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں کسی کی محتاج نہ ہوں، اللہ کو بندے کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو استغناء اختیار کرتا ہے اللہ اسے غنی بنا دیتا ہے اور جو پاک دامنی اختیار کرتا ہے اسے پاک دامن بنا دیتا ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی وسعت بھر روزی کے حلال راستوں کو اپنانے کی کوشش کی اور بعض وقت آزمائش ہوئی تو بڑے اچھے سے اپنے دامن کو تر ہونے سے بچالیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ناظر عام کے عہدہ کو بجائے منصب کے ایک ذمہ داری اور امانت کی نگاہ سے دیکھا اور زندگی میں کبھی بھی اس منصب کی شان وشوکت کا اظہار نہ ہونے دیا۔ دراصل اس خاندان کے بزرگوں کا یہی شعار اور طرۂ امتیاز رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم کو تین فرزند اور ایک بیٹی عطا فرمائی۔ سید خلیل احمد حسنی ندوی، سید امین حسنی ندوی، سید عبدالحی حسنی ندوی اور طیبہ سلمہا جن کے شوہر مولوی منصور حسن حسنی ہیں۔ یہ سب کے سب اسم بامسمی ہیں، اپنے دادا نانا کے نور نظر، لخت جگر اور ان کی آہ سحر گاہی کی دعاؤں کی بہترین مثال ہیں۔ بڑے ہی سعادت مند، ہونہار، سمجھ دار ہیں جن سے امت کو بڑی توقعات ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنے ہمعصروں اور تعلق رکھنے والوں اور چھوٹوں کے لیے ایک نمونہ کی زندگی چھوڑی ہے جو آج کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں چراغ راہ بن سکتی ہے اور رہبری ورہنمائی کا کام دے سکتی ہے۔ اب ہم اپنی بات کو مولانا مرحوم کی ایک مختصر تحریر پر ختم کرتے ہیں جس کے مصداق خود مولانا مرحوم بھی ہیں اور اس میں ان کے اہل تعلق کے لیے ایک بڑا پیغام ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''دینی اور غیر دینی اداروں میں ایک فرق ہے، وہ یہ کہ غیر دینی ادارے کو صرف باصلاحیت افراد کی ضرورت پڑتی ہے لیکن دینی اداروں کو صلاحیت کے ساتھ ساتھ اخلاص اور للّٰہیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، ندوہ کا یہ امتیاز رہا ہے کہ اس کو ہمیشہ ایسے مخلص باصلاحیت افراد ملتے رہے اور انشاء اللہ ملتے رہیں گے اور ندوۃ العلماء ان کی کوششوں اور برکتوں سے ترقی کرتا رہے گا، نور کی بارش ہوتی رہے گی اور علم کا دھارہ بہتا رہے گا''۔

☆☆☆☆☆

کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں

مولانا ناصر الدین مظاہری☆

ربا! تیرے انداز نرالے ہیں، تیری ذات نرالی ہے، تیری ہر چیز نرالی ہے، جو لوگ بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑتے ہیں، موت کو اپنے قریب پاتے ہیں، ہر وقت انھیں اپنی موت کا انتظار واستحضار رہتا ہے، وہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ بچپن جوانی اور بڑھاپے تینوں منزلیں طے کرنے کے بعد اب تو بس لقائے رب ہی اگلا مرحلہ ہے، ہر شخص سوچتا' چاہتا اور خواہش کرتا ہے کہ اس کی اولاد اس کے جنازہ کو کاندھا دے لیکن یہ سوچنا الٰہی نظام کا حصہ نہیں ہے، وہ تو جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیوں کہ کائنات کو سجانے اور سجا کر بگاڑنے کا نظام اسی کے اقتدار واختیار کا حصہ ہے۔

میرے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے درد اور کرب کے ساتھ اپنے تین تین صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کو قبر میں اتارا' وہ منظر سوچ کر دل بیٹھتا ہے، اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات پر کیسے تاریخی جملے آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلے کہ رہتی دنیا تک تمام آباء واجداد اور بڑوں کے لیے سرمہ چشم بصیرت بن گئے۔

آپ ﷺ کے نور نظر حضرت ابراہیم کو ان کے فوت ہونے کے بعد آپ ﷺ کی گود میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے نہایت نم ناک آنکھوں اور غم ناک دل کے ساتھ فرمایا: "العين تدمع والقلب يحزن وإنا بفراقك يا إبراهيم! لمحزونون ولا نقول إلا مايرضى به ربنا سبحانهٗ وتعالىٰ."

(آنکھیں نم ناک ہیں، دل غم ناک ہے اور اے ابراہیم! تمہاری جدائی پر ہم غمگین ہیں لیکن پھر بھی ہم اپنی زبان سے وہی بات کریں گے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو اور اپنی زبان سے ایسی باتیں نہیں کریں گے جس میں شکوہ شکایت ہو۔)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ اور حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ یہ وہ لوگ تھے جو ندوۃ العلماء کے بڑے بزرگ تھے اور حضرت مولانا سید عبداللہ حسنیؒ اور مولانا سید محمود حسنی ندویؒ بہت چھوٹے تھے، یہ بڑے بزرگ ندوے کا مستقبل اپنے ان چھوٹوں میں دیکھ رہے تھے لیکن اللہ کے فیصلوں کو کس نے سمجھا ہے؟ تینوں بزرگوں نے دونوں چھوٹوں کے جسد خاکی کو کس کرب اور درد کے ساتھ کاندھا دیا، یہ انہی کا دل وجگر تھا، پھر دونوں بھائی بھی مولائے حقیقی کے پاس چلے گئے اور حضرت مولانا سعید الاعظمی مدظلہ بستر علالت سے جا لگے، دنیا سمجھتی رہی کہ حضرت چراغ سحری ہیں اور یہ ٹمٹماتا چراغ کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے لیکن یہاں بھی اللہ کی قوت اور اس کی تدبیر نے انسانی سوچوں پر پانی پھیر دیا اور حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ کو بستر علالت پر ہی یہ خبر کلفت اثر سننے کو ملی کہ ان کا چہیتا اور لاڈلا شاگرد، ندوۃ العلماء کا روح رواں، دار العلوم ندوۃ العلماء کا ناظر عام اور نہایت متحرک عالم حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی بھی چلتے پھرتے ہمارے درمیان سے چلے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

"كبرني موت الكبراء" پتہ نہیں کس کا قول ہے لیکن اس قول کی صداقت اور سچائی کا عجیب وغریب مشاہدہ میں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کیا۔ محترم مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی سب سے چھوٹے تھے، ان کے خاندان کے تمام بڑے حیات تھے، خود مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی حیات تھے پھر قدرت کے فیصلے ہوتے گئے، بلاوا آتا گیا، راہ رو چلتے گئے، کارواں چھوٹا ہوتا گیا، حضرت مولانا علی میاں گئے، حضرت مولانا عبداللہ حسنی گئے، حضرت مولانا رابع حسنی گئے، حضرت مولانا واضح رشید ندوی گئے، حضرت مولانا محمود حسنی گئے، حضرت مولانا حمزہ حسنی گئے یعنی ہر چمکتا دمکتا تارہ ڈوبتا گیا اور حضرت مولانا بلال حسنی ندوی کے سر سے گھنا سایہ کم ہوتا رہا تا آں کہ تمام خاندانی بڑے بزرگ چلے گئے۔ صرف ان کے استاذ حضرت مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی باقی رہ گئے اور وہ بھی بستر علالت پر عرصہ سے دراز ہیں، کس دل وجگر سے انھوں نے اس خبر کو برداشت کیا ہوگا کہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے گھر کے دو چراغوں میں سے ایک چراغ اچانک ایک سڑک حادثہ میں داغ مفارقت دے گیا۔

اف یا اللہ! میں نے وہ منظر دیکھا ہے کہ مولانا سید بلال حسنی ندوی اپنے بڑوں کے ساتھ بحیثیت خادم ورفیق سفر ساتھ رہتے تھے مگر دیکھتے ہی دیکھتے "كبرني موت الكبراء" کا مصداق بن گئے۔ آج وہ اپنے دائیں بائیں آگے پیچھے جدھر دیکھتے ہیں کوئی بڑا نظر نہیں آتا۔ مولانا جعفر مسعود بے شک ان کے استاذ نہیں تھے لیکن کم از کم دار العلوم اور ندوہ کے لیے مشیر خاص تو تھے۔

آہ! قدرت کے فیصلوں کے آگے کس کی چلی ہے، یہاں کون اپنی مرضی سے جیا ہے، مولانا جعفر مسعود ندوی کے جانے سے گویا مولانا سید بلال حسنی کا ایک بازو جدا ہو گیا ہے۔ ہم رب تعال ومتعال سے دعا گو ہیں کہ اللہ مولانا سید بلال حسنی ندوی کو صحت وسلامتی کے ساتھ لمبی عمر دے، مضبوط دست وبازو عطا فرمائے، ندوۃ العلماء کی حفاظت فرمائے، اکابر ندوہ کو کروٹ کروٹ چین وسکون عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

☆استاد جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

مولانا مرحوم کی زندگی کے کچھ اہم پہلو

مولانا محمد عثمان ندوی ☆

ماضی قریب میں حسنی خانوادے سے یکے بعد دیگرے کئی عظیم ہستیاں ہمارے درمیان سے رخصت ہوئیں۔ جیسے کہ ۳۰/جنوری ۲۰۱۳ء جناب مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ ۱۶/جنوری ۲۰۱۹ء میرے مربی و مشفق استاذ حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب۔ ۷/مئی ۲۰۲۱ء حضرت مولانا سید حمزہ حسنی ندوی صاحب ناظر عام ونائب ناظم ندوۃ العلماء۔ ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء برادر عزیز مولانا محمود حسن حسنی ندوی معاون مدیر تعمیر حیات۔ اور پھر ۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء ہم سب کے مربی وسرپرست اعلیٰ وناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب (علیہم الرحمۃ)۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی شہید (علیہ الرحمۃ) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ ۱۳/ستمبر ۱۹۶۵ء کو تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے ان کے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی علیہ الرحمۃ حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ تعالی کے حقیقی بھانجے تھے۔ مولانا سید جعفر حسنی ندوی صاحب نے حفظ قرآن کریم کے ابتدائی کچھ پارے حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ صاحب کے دلی میں قیام کے دوراں جہاں وہ آل انڈیا ریڈیو دلی کے عربی یونٹ میں انگریزی وعربی مترجم اوراناؤنسر کی حیثیت سے وابستہ تھے (یادرہے حضرت مولانا نے ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں بی اے بھی کیا تھا۔ مولانا کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔ ٹائمس آف انڈیا وغیرہ کو وہ پابندی کیساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اسکے علاوہ کس زبان کو کس طرح سے پڑھا جائے اس پران کو ملکہ حاصل تھا) وہاں مولانا علیہ الرحمۃ نے لگ بھگ ۲۰/سال گزارے۔ مولانا سید جعفر حسنی ندوی صاحب کا بھی کم وبیش اتنی ہی مدت اپنے والدین کیساتھ دلی میں قیام رہا۔ بعدازاں تکمیل حفظ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ حفظ کے استاذ جناب حافظ حشمت اللہ صاحب مرحوم کے زیر نگرانی کی تھی۔ اس کے بعد عربی درجات میں داخلہ لیا۔ ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ اسکے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان وادب میں ایم اے کیا۔ اور پھر کچھ دنوں بعد ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب کی مشہور دانش گاہ جامعۃ الامام محمد بن سعود الریاض سعودی عرب کے زیراہتمام ٹیچر ٹریننگ کا کورس کیا۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی علیہ الرحمۃ ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے معلم بھی تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ایک مشہور ومعروف شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ مسجد حیدر بخش چوک لکھنؤ ۱۹۸۵ء سے وابستہ ہوگئے تھے۔ بعد میں جناب قاری محمد مشتاق صاحب فرزند ارجمند حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ (ان کی بزرگی اور انکی شہرت سن کر یہ ناچیز جب وہ لکھنؤ تشریف لاتے لکھنؤ مولوی گنج مسجد خاص میں ان کی مجلس میں جایا کرتا تھا، ہمارے بڑے بزرگوں کو بھی ان سے والہانہ لگاؤ تھا) کا قائم کردہ یہ ادارہ ان کی نگرانی اور سرپرستی میں مزید ترقی کر کے عبدالعزیز روڈ پر ایک پرشکوہ اورشاندار عمارت میں منتقل ہوگیا (تاحال وہیں قائم ہے) اس طرح مولانا سید جعفر صاحب حسنی ندوی علیہ الرحمۃ لگ بھگ تین دہائیوں سے زائد اس سے وابستہ رہ کر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، اور چند برس پہلے وہاں سے سبکدوش ہوئے۔ بقول ان کے ایک خاص شاگرد رشید: وہ اپنے انفرادی اور اچھوتے طرز تعلیم وتدریس سے طلباء کو مطمئن کرتے، مشکل سے مشکل عبارت کو آسان وعام فہم زبان میں طلباء کے معیار کوملحوظ رکھتے ہوئے سمجھاتے۔ دوران درس درجہ کے سبھی طلباء سے اس طرح مخاطب رہتے کہ ہر طالب علم یہی سمجھتا کہ میں ہی انکا اصل مخاطب ہوں۔ اسی لئے درجہ کا ہر طالب علم ہمہ وقت ان کی طرف متوجہ رہتا تھا۔ طلباء کے سوالوں کے جوابات انتہائی خوش اخلاقی، خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے دیا کرتے، طلباء میں (جو عام طور پر بعض شریر یاذہین طلباء کی روش ہوتی ہے) بار بار سوالات کئے جانے پر ذرا بھی خفگی یا ناراضگی کا اظہار نہ کرتے بلکہ صرف مسکرادیتے، اورانکے مسکرانے کا بھی ایک خاص انداز تھا۔ جس نے ان کو قریب سے دیکھا ان کے ساتھ اٹھا بیٹھا وہی ان کی مسکراہٹ کو حقیقی معنوں میں سمجھ سکتا ہے۔ ایک ذمہ دار شفیق معلم ومربی کا سب سے بڑا اور اہم وصف اور شفیقانہ رویہ ہوا کرتا ہے، اوراللہ نے یہ صفت انکو بھرپور عطا کی تھی۔

مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے سبکدوش ہونے کے بعد ہندوستان کی مشہور اور معروف ادارہ ندوۃ العلماء کے ناظر عام مقرر کئے گئے اورانہوں نے قلیل مدت میں ندوۃ العلماء کی بے لوث خدمت

☆ انچارج مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ

کی۔دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے بحیثیت ناظر عام انکی خدمات اور انکی انتظامی کارکردگی خاص کر انتظامی امور سے متعلق ایک مثالی رہی۔ یہاں کا ہر خاص و عام ان سے مانوس تھا، ادنی سے ادنی ملازم بھی ان سے براہ راست ملاقات کر لیتا تھا۔ ان کی ساری دلچسپی منصبی امور کے انجام دہی پر ہی رہتی تھی۔کسی بھی کام کو وہ کل پر نہیں ٹالتے تھے۔ اس ناچیز کو برابر اس کا مشاہدہ رہا۔انکی ساری عمر درس تدریس کے علاوہ اشاعت وتبلیغ دین اسلام کے لیے وقف رہی۔انہوں نے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر دلجمعی کے ساتھ چل کر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مشن اور اسکے کاموں میں استحکام بخشا اور اس میں وسعت پیدا کی۔وہ ندوۃ العلماء کی تعمیر وترقی کے لئے ہماوقت فکرمند رہنے کے ساتھ ساتھ ایک بے لوث ، وفادار اور ایک ایماندار خادم کی طرح آخرتک اس کی آبیاری کرتے رہے۔

والدمحترم کی طرح سنجیدہ اور معاملہ فہم انسان:

انہوں نے کم مدت میں اہل مدارس اور دینی تعلیم و تربیت سے وابستہ افراد کو اپنا گردیدہ بنالیا تھا۔ناظر عام کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سے ہی مدارس اسلامیہ کی ترقی اور سربلندی کے لئے فکرمندی سے کام انجام دینا شروع کر دیا تھا۔ان سے ہر ایک کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔سبھی چھوٹے بڑوں کیساتھ خوش اخلاقی اور گرمجوشی سے ملتے۔وہ سادگی پسند تھے اور سادگی اور رواداری کی تلقین بھی کرتے رہتے تھے۔ساری عمر سادگی سے گزاری، انکا رہن سہن، انکا لباس، رکھ رکھاؤ حتی کہ ان کا کھانا پینا سب ہی کچھ سادہ تھا۔وہ اپنے والدمحترم کے سچے امین تھے۔صحیح معنوں میں اپنے والد ماجد ہی طرح متقی و پرہیزگار اور خوف خدا اور آخرت کی فکر کرنے کی صفات سے متصف تھے۔متانت ، سنجیدگی، خاموشی ،تقوی واحتیاط وانکساری واعلی ظرفی جو اس خاندان کا ایک امتیاز رہا ہے وہ اس سے پوری طرح آراستہ تھے۔تواضع ، سادگی ونرم دلی، نام ونمود سے دوری، محبت شفقت ،اخلاص وخوش اخلاقی وخوش گفتاری، وضع داری وبردباری کا حسیں پیکر تھے۔وہ ایک سنجیدہ اور ایک معاملہ فہم انسان تھے، دوسروں کی بات سننا اور اسکو اہمیت بھی دینا ہم سب کو متاثر کرتی تھی۔ اپنے والد ماجد اور اپنے بڑے بزرگوں کی طرح اپنے آپ کو مسلکی عصبیت ، گروہ بندی سے اپنے دل ودماغ کو ہمیشہ پاک وصاف رکھا۔

ان کا اصل موضوع تفسیر وحدیث تھا اور کئی برسوں سے اپنے محلّہ کی مسجد قبر ماموں بھانجہ میں سنیچر اوراتوار بلا ناغہ درس قرآن کے عنوان سے پابندی سے درس دینے کا معمول تھا، اور ہر سنیچر اوراتور بعد نمازمغرب اپنے آپکو اس کے لئے فارغ کر لیا تھا۔

وہ ایک اچھے منجھے ہوئے صحافی تھے،صحافت کے میدان میں ان کی خدمات کم عرصہ میں بھی نمایاں رہیں، عربی زبان وادب میں نمایاں مقام حاصل تھا، عربی زبان وادب پر گرفت ہونے کی وجہ سے وہ اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد ۲۳ ر جنوری ۲۰۱۹ء میں ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے مشہور عربی پندرہ روزہ الرائد کے رئیس التحریر بنائے گئے ۔وہ اردو کے بھی ایک اچھے مصنف اور مترجم تھے، انہوں نے اردو اور عربی میں کئی کتابیں تصنیف کیں اور اسیطرح بعض کتابوں کے سلیس ترجمے بھی کئے ہیں۔

حقوق العباد کی تلقین: اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ اپنے والدمحترم کی طرح تقریریں نہیں کرتے تھے۔لیکن ۲۰۲۳ء میں جب انہیں ناظر عام کی اہم ذمہ داری ملی اور جب عوام الناس اور اہل مدارس ومکاتب سے انکا براہ راست ربط ہوا، تو گویا انہوں نے اپنے آپکو اس اس نئے میدان کیلئے ذہنی طور پر تیار کیا۔تو پھر انہوں نے تقریریں بھی کرنی شروع کردیں۔اور پھر وقت وقت پر ملک کے مختلف حصوں میں مصروف دورے بھی ہونے لگے ، اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کر دیا تھا، اور مختصر سے عرصہ میں اس میدان میں انہوں نے اپنی ایک پہچان بنائی اور عوام الناس پر اپنی چھاپ چھوڑی۔بلاشبہ کم عرصہ میں ہی وہ ایک اچھے مقرر بن گئے تھے۔جیسا کہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطابات مختصر ہوا کرتے تھے۔حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم طویل خطبہ نہیں دیتے تھے۔ بالکل اسی طرح مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی صاحب کی تقریریں اور خطابات بھی طویل نہیں ہوتے ،مگر ان کی تقریریں دل کو چھوتیں اور اپنا اثر ڈالتیں۔ ان کے خطابات اور تقریروں کی سب سے نمایاں اور اہم بات گھوم پھر کر حقوق العباد پر ہی آکر ٹکتی تھی۔بقول ان کے اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو انسان کی ہر پہلو اور ہر موڑ پر رہنمائی و رہبری کرتا ہے۔ جہاں اللہ نے حقوق اللہ کا ادا کرنا ضروری قرار دیا ہے، وہیں حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق کی اہمیت پر زور ہی نہیں دیا بلکہ ادائیگی کی تاکید کی ہے۔قرآن کریم اور حدیث شریف میں بہت واضح طور پر حقوق العباد کی

اہمیت بیان کی گئی ہے، اور ان کو پامال کرنے پر سنگین نتائج کی وعید فرمائی ہے (سورہ نساء) ترجمہ: اور اللہ کی عبادت کرو اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھراؤ، اور والدین کیساتھ نیکی کرو، اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریبی اور دور کے ہمسایوں، ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ بھی احسان کرو، بے اللہ تکبر اور گھمنڈ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) وہ کہا کرتے تھے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کو دین کا بنیادی جزء قرار دیا ہے۔ بقول ان کے اس کی خلاف ورزی اور کوتاہی آخرت میں نجات کی امکانات کو خطرے میں ڈال دے گی۔ اور یہ حدیث شریف بھی ان کے نظریہ اور بلند خیالات اور ان کے اعلی فکر کی عکاسی کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (ترجمہ: کیاتم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ کوئی سامان۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں مفلس وہ ہوگا جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوۃ لے کر آئے گا، لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا، پھر ان سب کو ان کی نیکیاں دیدی جائیں گی، اور جب اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں تو ان کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اسی طرح کی دل کو چھو لینے باتیں ان کی تقریروں کا نمایاں حصہ ہوا کرتی تھیں۔ اور لوگ خوب مستفید ہوتے تھے (یہ میں باتیں محض اپنی بات کو طول دینے کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں، بلکہ پچھلے سال ماہ نومبر ۲۰۲۴ء میں ایک مختصر سفر میں مدرسہ مفتاح العلوم کے ایک جلسہ میں جو بانی مدرسہ حضرت مولانا عبدالقدیر قاسمیؒ کے نام سے بمقام ٹکرالہ ضلع بدایوں منعقد ہوا تھا۔ ہمراہ جناب مولانا فخر الحسن صاحب ندوی ناظر شعبہ تعمیر وترقی اور جناب مولانا محمد وثیق ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء ان کی دو تقریریں قریب سے سننے کا موقع ملا تھا، اور اس دوراں ہمارا قیام وطعام بھی ساتھ رہا اور اسی سفر میں اگلے دن بروز جمعہ بمقام گنج ڈنڈوارہ، جناب مولانا فخر الحسن صاحب ندوی کی مسجد میں بھی بعد نماز جمعہ ان کا خطاب ہوا تھا۔ اس میں بھی گنجائش سے زیادہ لوگ موجود تھے)۔

حادثۂ وفات: اخباری رپورٹ کے مطابق مولانا محمد جعفر حسنی ندوی تکیہ کلاں سے شہر رائے بریلی کسی کام سے بذریعہ موٹر سائیکل ہمراہ مولانا محمد ثانی حسنی میموریل سوسائٹی میں کام کرنے والے مولوی عبد القادر صاحب آئے تھے جو موٹر سائیکل چلا رہے تھے، لکھنو پریاگ راج شاہراہ پر واقع رتا پور چوراہے کے قریب موٹر سائیکل روک کر سڑک کے کنارے ٹھنڈک کے سبب مفلر درست کرنے لگے اسی درمیان پیچھے سے ایک غیر ذمہ دار کار والے نے شدید ٹکر ماردی، جس میں وہ اور انکے ساتھی دونوں ہی شدید زخمی ہوگئے، قریب موجود پولیس اہلکاروں نے رائے بریلی ضلع اسپتال ان دونوں کو پہونچایا، جہاں ڈاکٹروں نے مولانا سید جعفر حسنی ندوی صاحب کی جانچ پڑتال کے بعد انکے انتقال کی خبر دی (إنا لله وإنا إليه راجعون) جبکہ انکے ساتھی عبد القادر جو موٹر سائیکل چلا رہے تھے ابتدائی علاج کے بعد لکھنؤ ایرا میڈیکل کالج ریفر کر دیا گیا اور ایک ہفتہ زیر علاج رہنے کے بعد انکا بھی بروز جمعہ صبح ۲۴ر جنوری ۲۰۲۴ء انتقال ہوگیا: إنا لله وإنا إليه راجعون.

مولانا سید محمد جعفر حسنی ندوی علیہ الرحمۃ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے مگر علم وعمل وفضل میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ صحیح معنوں میں ان سے میری جان پہچان مربی ومشفق استاذ حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کی وجہ سے ہوئی، ان کو ندوہ آتے جاتے دیکھتا تھا کبھی کبھار مولانا کی وجہ سے دفتر ''الرائد'' میں بھی آجاتے تھے۔ اس وجہ سے ہلکی پھلکی ملاقات ہوجایا کرتی تھی، ایک زمانہ میں وہ کرکٹ کے شوقین تھے، ندوہ گراؤنڈ میں کبھی کبھار کرکٹ کھیلتے دیکھتا تھا، یا پھر جب مجلس تحقیقات ونشریات کی قدیم عمارت میں دفتر الرائد واقع تھا، اسی عمارت کے پچھلے حصہ میں میری رہائش تھی ان دنوں کتب خانہ شبلی نعمانی کے پیچھے خالی پڑی زمین پر کچھ پرانے ندوی حضرات جیسے مولوی سید معید اشرف ندوی وغیرہ کے ہمراہ وہ بیٹ منٹن کھیلا کرتے تھے۔ پھر ان کی اپنی علمی ودیگر مصروفیات بڑھیں تو یہ کھیل بھی بالکل ختم ہوگیا۔ میں فٹ بال کا کھلاڑی تھا وہ کرکٹ کے، اس لئے اس میدان میں کبھی ساتھ نہیں رہا۔ ہاں گرمیوں میں جب رمضان المبارک پڑے (میرا اسی کی دہائی سے ہر سال تکیہ جانے کا معمول رہا ہے) تو سئی ندی میں بعد نماز ظہر، میں اور میرے ہم عصر مولوی سید عرفان حسنی ندوی اور مولانا سید جعفر حسنی ندوی مرحوم تینوں گھنٹوں نہایا کرتے تھے، ہم تینوں ہی ایک اچھے تیراک تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سئی ندی میں نہانے پر کوئی بندش نہیں تھی۔ مگر بعد میں دو ایک حادثات کی وجہ سے ممانعت کر دی گئی تھی۔..................

..................بقیہ صفحہ ۱۱۸ر پر

کاروانِ عزیمت کی ایک کڑی

ڈاکٹر محمد ہارون رشید ندوی☆

خاندانی منظر نامہ

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ اپنے رب کریم کے جوار جاچکے ہیں، اب صرف ان کی یادیں، ان کی تقریریں اور تحریریں ان کے اعمال صالحہ باقی وصدقہ جاریہ ہیں اللہ تعالیٰ کا نظام ہے، جس کا جو وقت متعین ہے ایک سکنڈ آگے پیچھے نہیں ہوسکتا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نوح آیت نمبر۴ میں بیان فرمایا: "إن أجل الله لا يؤخر لو كنتم تعلمون" اللہ تعالیٰ نے جعفر بھائی کو بس اتنی ہی سانسیں ان کے حصہ میں تھیں اور انہوں نے اپنی اس عمر کو ضائع نہیں کیا؛ بلکہ انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی زندگی کے اوقات کو قیمتی بنایا، اللہ کی نظر میں اور عوام کی نظر میں اس کا زندہ جاوید ثبوت ان کی عمر کے آخری ایام، قبولیت کی دلیل ہیں۔ اسی لیے کہنے والوں نے کیا خوب کہا ہے کہ علماء کی ابتدائی زندگی دیکھو کس طرح شفقت سے پُر ہوتی ہے بعد میں فتوحات کے دروازے کھلتے ہیں جو آخری عمر کو دیکھ کر نتیجہ نکالتے ہیں وہ راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔

میں یہاں مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندانی بیگ گراؤنڈ سے متعارف کرنا چاہوں گا، تکیہ کلاں رائے بریلی کی بستی کا تعلق صرف رائے بریلی سے نہیں ہے، اس بستی کا تعلق ان نفوسِ قدسیہ سے ہے جنہوں نے ہمیشہ عظمت پر عمل کر کے دکھایا خواہ اس کا تعلق حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی معاویہ کے حق میں حکومت سے دستبرداری کا ہو یا آگے چل سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ سے ہو، یا سرفروشی کی تمنا لے کر بغداد سے اٹھنے والی ساتویں صدی ہجری کے نصف میں شخصیت سید امیر کبیر قطب الدینؒ کے نام سے موسوم ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر اپنے محبوب وطن کو چھوڑ کر افغانستان غزنی آئے اور پھر دعوۃ الی اللہ کی طرف بڑھتے گئے حتی کہ بدایوں پہونچے، وہاں پر قیام نہیں کیا؛ بلکہ آگے بڑھتے گئے قنوج پہونچے، دعوت کا کام کرتے ہوئے مانک پور آئے اور وہاں کے حکمراں سے مقابلہ کرنے کے بعد وہیں فروکش ہوگئے، اور اپنی بستی بنائی جس کا نام کٹرہ رکھا، آج بھی کٹرہ مانک پور میں موجود ہے، اس خاندان کی مسجد وقبرستان موجود ہے۔

امیر کبیر سید قطب الدین حسنی کے خانوادے سے اللہ تعالیٰ نے ایک شخصیت کو چنا اور خاص طور پر آٹھویں صدی کے نصف میں حضرت سید قطب الدین محمد ثانیؒ کی شخصیت ہے جو جونپور جو اس وقت کا شیراز ہند تھا، وہاں تعلیم حاصل کی اور جونپور کے شرقی حکمرانوں نے جائس (موجودہ ضلع امیٹھی کا ایک مشہور قصبہ ہے پہلے ضلع رائے بریلی کا قصبہ ہوا کرتا تھا) بحیثیت قاضی، جس شخصیت کو بٹھایا اس کا نام نامی سید قطب الدین محمد ثانی تھا، قاضی کے فرائض انجام دیتے ہوئے اللہ کے جوار حاضر ہوگئے، ان کے بیٹے سید عبدالعلاء علاالدین جائس کے قاضی ہوئے، یہ دونوں باپ بیٹے محلہ غوریانہ کی ایک مسجد میں پیوند خاک ہیں۔

سید عبدالعلاء یا علاء الدین کے بیٹے قاضی سید محمود حسنی جونپور سے فارغ ہوتے ہی سکندر شاہ شرقی کی نظر انتخاب برائے قضاء ان پر پڑی (انہوں نے اپنے وزیر نصیر الدین کے نام جائس اور سلون کے درمیان بسایا پہلے قلعہ بنایا اس میں دار القضاء بنایا قلعہ سے باہر جامعہ مسجد بنائی شہر سے باہر عیدگاہ بنایا حتی کہ زندگی میں رہنے کے لیے قلعہ بنایا اور آخری آرام گاہ کی بھی جگہ متعین کی جو قبرستان خطباء سے تھا جو تکیہ قاضی کے باغ کے نام سے مشہور ومعروف ہے، غرض کہ قاضی کے رہتے ہوئے جن چیزوں کی عوام کو ضرورت تھی بنایا) اور عہدہ قضا پر مامور کیا۔ چنانچہ حضرت قاضی سید محمود حسنیؒ عہدہ قضا پر پوری زندگی مامور رہے۔ ان کے دو فرزند ہوئے ایک سید محمد دوسرے سید احمد جو آگے چل کر قاضی سید محمد حسنی، سید احمد حسنی اور قاضی کے نام نامی سے مشہور ہوئے۔

حضرت قاضی سید محمود حسنیؒ کی نسل میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت کی ان کی اولاد واحفاد کی شاخوں میں علماء وصلحاء کی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئی جنہوں نے حکومتوں کے رخ کو موڑ دیا اور فکر اسلامی کی لوگوں میں جوت جگادی۔

حضرت قاضی سید محمد اور قاضی سید احمد سید کی اولاد واحفاد تقریباً کم وبیش پانچ سو سال تک عہدہ قضا پر نصیر آباد میں مامور رہے، اسی سے اثناء ان کے اولاد احفاد نے مختلف مقامات پر ہجرت کی مہاجرین میں حضرت شاہ علم اللہ رحمہ اللہ علیہ ہیں قصبہ نصیر آباد سے اپنی اہلیہ کے ساتھ اخت سفر ہجرت باندھا، اپنے مال وزر وزیور غلہ صدقہ کر کے اللہ کے لیے نکل پڑے رجل عزیمت نے سوائے چند جوڑے کپڑوں کے کچھ نہ لیا توکل علی اللہ کر کے نکل پڑے (تفصیل کے لیے تذکرہ علم اللہی یا خانوادۂ علم اللہی کا مطالعہ فرمائیں)۔

نصیر آباد میں آصف الدولہ کے دور حکومت میں یہ خاندان آزمائش کا شکار ہوا، آصف الدولہ نے اعلان کردیا کہ علماء کی اور فوجیوں وغیرہ کی جاگیریں جن کو

☆ معاون مسجل دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مغلوں نے دیا ہے حکومت اودھ واپس لے لیگی، اس شرط پر جائداد باقی رہے گی کہ وہ شیعیت اختیار کرلیں چنانچہ نصیر آباد وجائس کے اکثر نجمی سادات نے شیعیت اختیار کرنے کو ترجیح دی اور حسنی خانوادۂ نے جائداد چھوڑنے کو ترجیح دی۔ معاشی تنگی شروع ہوئی تو حسنی سادات نے مختلف مقامات کا رخ کیا مثلاً ریاست بھوپال چلے گئے اور یاست ٹونک اور بھی مختلف مقامات کا رخ کیا، یہ سادات کی عزیمت تھی۔ اس خانوادہ کی آخری کڑی قاضی فضل الرحمٰنؒ تھے، اس کے بعد نصیر آباد حسنی سادات سے خالی ہوگیا، شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ سفر ہجرت مدینہ کے لیے نکلے لیکن ہجرت مدینہ کے بجائے ہجرت تکیہ کلاں میں تھے کہ اللہ کے ولی نے موجود تکیہ کلاں جو اس وقت جنگل تھا آباد کیا اور ان کی اولاد واحفاد میں ایسے ایسے اولیا ومجاہدین پیدا ہوئے جن کا تذکرہ تاریخ کی اکثر کتابوں میں ملے گا، ''تاریخ فیروز شاہی''، ''سیر السادات'' اور ''تاریخ ہند'' کے مایہ ناز علماء کی خدمات کے تذکروں میں تذکرہ ملے گا۔

قاضی سید محمود کی اولاد واحفاد کی شاخوں میں قریب العہد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں، ان سے پہلے حضرت سید احمد شہید و شاہ ضیاء النبیؒ اور علامہ عبدالحی حسنی وڈاکٹر مولانا عبدالعلی حسنی ہیں۔

ہمارے سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اسی کاروان عزیمت کے قافلہ کی ایک کڑی ہیں جو کہ اپنے وقت کے ادیب ومؤرخ ڈاکٹر عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی کے نواسے اور مجلّہ ''الرائد'' کے ایڈیٹر اور سرکاری ملازمت کی قربانی دیکر دارالعلوم میں تدریس اختیار کرنے والے عزیمت پر عمل کرنے والے استاد محترم حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی کے فرزند ارجمند تھے۔

تعلیم وتربیت

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ کی ولادت ۱۳؍ستمبر ۱۹۶۰ء میں ہوئی دینی آنکھیں کھولیں تو دینداری کا ماحول دیکھا ایسا ویسا نہیں؛ بلکہ ایثار وقربانی کا کیوں نہ دیکھتے، ان کے نانا جان بقول مولانا عبدالباری ندویؒ ایک فرشتہ صفت انسان تھے، ان کے گھر علماء واتقیاء کی آمد اور ان کا استقبال اور لکھنؤ کنگ جارج میڈیکل کالج کے گولڈ میڈلسٹ ہونے کے باوجود پوری زندگی کرایہ کے مکان میں گزار دی اور ''کن فن الدنیا کأنك غریب أو عابر سبیل'' کی مثال پیش کی صبح کی چہل قدمی (Morning walk) میں ان کے ساتھیوں سے ملاقات ہوتی تو کہتے پیدل ہی چلتے رہو گے مولوی صاحب، سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے کہ گولڈ میڈلسٹ میڈیکل کالج لکھنؤ کا MBBS اور تکمیل الطب لکھنؤ کا حکیم کیا کہتا ہے میں تو اپنی ذات کے لیے غریب بیماروں کی جیب پر بوجھ نہ ڈالوں گا۔ عزیمت کے اس پہاڑ نے کرایہ کے مکان میں زندگی گذار دی، زمانہ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، ہمارے جعفر بھائی اس فرشتہ صفت انسان کے نواسے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے لیے باقاعدہ مدرسہ تکیہ واطراف میں نہیں تھا، گھر پر ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور جب آپ کے والد ماجد استادی ومحبی مولانا سید محمد واضح ندوی رحمۃ اللہ علیہ دہلی آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن پر ملازم ہوئے تو اپنی (فیملی) اہل خانہ کو دہلی لے گئے، جعفر بھائی اکلوتے تھے، ان کو بھی ساتھ لے گئے، وہیں دہلی کے مدرسہ امینیہ مسجد فتحپوری میں حفظ شروع کیا۔

حفظ مکمل کرنے کے بعد گھر پر عربی کی تیاری اور سوم عربی میں ۱۹۷۵ء میں باقاعدہ دارالعلوم میں داخل ہوئے۔

عالمیت وفضیلت کا کورس کرنے کے بعد حضرت سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے المعهد العالي للدعوة والفكر الاسلامي کا ایک نصاب تیار کیا اور فضیلت سے فارغ ہونے والے طلبہ جو خواہش مند ہوتے داخلہ لے سکتے تھے، ہمارے جعفر مسعود بھائی نے دعوہ کا بھی کورس مکمل کیا، دارالعلوم کا تعلیمی زمانہ عالمیت تک کا مرحلہ جو کہ ۱۹۸۱ء میں مکمل ہوا فضیلت کا ۱۹۸۳ء میں مکمل ہوا ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے عربک کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء میں جامعۃ الملک سعود سے تربیۃ المعلمین کا ایک سالہ کورس کیا۔

تعلیمی وتحریری وتقریری سرگرمیاں کب سے شروع کیں یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ صلحاء اتقیاء ادباء ومؤرخین کا خاندانی بیگ گراؤنڈ تھا چنانچہ امین آباد جھنڈے والے پارک میں پہلے سیاسی سماجی ومذہبی سرگرمیاں ہوا کرتی تھی خاص طور پر ماہ ربیع الاول میں جھنڈے والے پارک کو مسلمان سجاتے تھے، اس میں نعت خوانی سیرت کے عنوان پر تقریری مقابلہ ہوتا تھا مولانا سید جعفر مسعود ندوی بھی حصہ لیتے تھے، اس کا تذکرہ جناب مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی نے مسجد دارالعلوم میں تعزیتی پروگرام میں تذکرہ فرمایا کہ میں سینئر تھا لیکن تقریر میں اول انعام سید جعفر مسعود حسنی نے حاصل کیا۔

فضیلت میں زیر تعلیم تھے، اسی وقت سے ''الـرائـد'' میں لکھتے تھے جب مدرس ہوگئے تو حضرت مولانا سید واضح رشید ندویؒ نے مزید توجہ دی اور تاریخ ادب عربی، تفسیر قرآن اور فکر اسلامی پر گہرائی سے مطالعہ اپنی نگرانی میں کرایا۔

دینی ودعوتی خدمات

قال رسول الله صلى الله عليه وس: الناس معـادن كمعادن الذهب والفضة ،خيارهم في

الجاهلية خيارهم في الاسلام اذ فقهوا.

انسان تمام علوم حاصل کرنے ان میں مہارت وپختگی کے بعد اسی میدان کو اختیار کرتا ہے جو اس کے گرد وپیش یعنی خاندان کا کام ہوتا آنکھ کھولتے ہی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو دیکھا، ان کی انسانیت کے لیے کیا تڑپ تھی۔

اسی کو عربی میں کہا گیا: "الولد سرٌّ لأبيه" لڑکا اپنے والد وخاندان کا رازدار ونمائندہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ کے سایۂ عاطفت ورہنمائی نے آپ کو علمی افق کے بام عروج پر پہونچا دیا چنانچہ جب آپ نے اکیڈمک کام کے لیے اردو میں قلم اٹھایا تو لوگوں نے ان کو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے تشبیہ دی، اور جب عربی میں پندرہ روزہ "الرائد" کے مدیر کی حیثیت سے اداریہ لکھا تو اپنے والد کی طرح فکروادبی دعوتی تحریریں لکھیں، عربوں میں مولانا سید جعفر مسعود حسنی کا مضمون بھی ان کے والد ماجد کی طرح وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

اور گوشہ ادب الاطفال" براعم الایمان" کے نام سے بچوں کی زبان میں بچوں سے عربی زبان کے ایک خاص اسلوب تعبیر میں ان سے ہم کلام ہوتے اور کتنوں نے ان کی اس تحریر سے فیض اٹھایا اور عربی بولنا اور لکھنا سیکھا، ان کو تحریروں میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں درس عبرت وفکر آخرت پیش کرنے کی بڑی صلاحیت تھی، ان کی تحریر" دعوت فکر ونظر" سے بطور نمونہ کے پیش خدمت ہے جب صحابہ کرام کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں تو صحابہ کا سراپا بالکل سامنے آجاتا ہے، فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین شریعت کے پیچھے چلتے تھے، ہم نعروں کے پیچھے چلتے ہیں، انہوں نے سر جھکایا پھر کٹایا، ہم شریعت کی بات پر سر کٹانے کی بات تو کرتے ہیں؛ لیکن شریعت کی خاطر سر جھکانے کو تیار نہیں ہوتے، ہم ہنگامہ پسند، جلوس پسند، جلسے پسند، مظاہرے پسند، نعرے بازی پسند؛ لیکن پرسکون انداز میں دستور اور قانون کے دائرے میں افہام وتفہیم کے راستہ میں ان مسائل کو حل کرنا شاید ہم اپنے لئے باعث عار وکسر شان سمجھتے ہیں۔

جہاں تک راقم کا تعلق ہے، سمجھتا تھا کہ مجھ سے ہی بڑا گہرا تعلق ہے؛ لیکن جب میں نے دیکھا کہ ہر شخص یہی کہہ رہا ہے کہ مولانا مجھے زیادہ چاہتے ہیں تو انداز ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جعفر بھائی کو نبوی صفات کا حامل بنادیا تھا کہ آپ جس سے ملتے اسی کو اپنائیت کا احساس ہوتا، حسنی خانوادہ سے احقر کے خاندان کا پرانا تعلق ہے، کیونکہ جب سادات نصیر آباد میں تھے تو میرے دادا خدا بخش مرحوم کا اصلاحی تعلق مولانا محمد حسنؒ سے تھا اور پر دادا عبدالقادر مرحوم کا تعلق مولانا عبدالجلیل جو کہ بعد میں بھوپال چلے گئے، لوگ ان کو بھوپالی کہنے لگے۔

مولانا سید جعفر حسنیؒ اپنے بڑوں کے نقش قدم پر تھے، ۱۹/اگست ۲۰۲۲ء کو ڈالی گنج چوراہے پر میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا، مرشد الامۃ کو پتہ چلا کہ میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا، بار بار حضرت مرشد الامۃ محبت میں پوچھ رہے ہیں، اپنے ہارون حاجی صاحب کے بھتیجے، اب کیا ہوگا، کیسے ہوگا؟ جو لوگ حضرت کے پاس موجود تھے، انہوں نے بتایا کہ آپ کے ایکسیڈنٹ کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بہت بے چین تھے، کیسے اور کیا ہوگا؟ لوگوں نے اس وقت حدیث کی بالکل جیتی جاگتی تصویر دیکھی: "مثل المؤمن في توادّهم وتراحمهم كمثل الجسد الواحد اذا اشتكى منه عضو تداعا سائر الجسد بالسهر والحمى".

دوسرے دن آپریشن ہونا تھا، میرے دونوں بڑے بھائی، حاجی محمد اسماعیل اور عتیق احمد اور بھتیجے تھے؛ لیکن آپریشن سے قبل حضرت مرشد الامۃ نے ڈاکٹر سے بات کی اور ڈاکٹر نے اطمینان دلایا، اس کے بعد آپریشن شروع ہوا، آپریشن تھیٹر سے جب باہر نکلے تو دیکھا مولانا سید جعفر مسعود حسنی اور مولانا محمد وثیق ندوی نے آکر خیریت معلوم کی، معلوم ہوا کہ جب آپریشن شروع ہوا، اس وقت سے آپریشن روم سے نکلنے تک جعفر بھائی موجود رہے۔ یہ میرے لیے ایسے یادگاری لمحات ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا بدلہ جنت میں نواز کر اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوگا۔

۱۹۶۱ء کا دور آیا تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دعوت وتبلیغ کے لئے قصبہ جائس آئے، اس وقت سے دوبارہ جب میرے خاندان کا تعلق ہوا تو آج تک الحمدللہ قائم ہے، اللہ تعالیٰ ہماری نسلوں کو بھی سادات سے متعلق رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

احقر کے پرانے تعلق کی بنیاد پر خانوادۂ حسنی کے اکثر حضرات بڑی محبت فرماتے تھے اور فرماتے ہیں، چنانچہ جب بھی مولانا سید جعفر مسعود حسنی آتے، ملاقات ہوتی، فرماتے اور کہو ہارون بھائی! جب کہ وہ مجھ سے عمر میں ۸/سال بڑے تھے مجھے تکلف ہوتا؛ لیکن فرماتے، بیٹھو، تکلف کی باتیں چھوڑو۔ جب بھی مولانا جعفر صاحب سے ملاقات ہوتی اور گھر آنے کی خواہ نصیر آباد یا گاؤں، ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ دعوت قبول فرمائی اور غریب خانہ تشریف لائے، ابھی چار سال قبل کا واقعہ ہے کہ میں نے جعفر بھائی اور عمار بھائی (آخرالذکر جو کہ میرے ہم درس ہیں اور بے تکلف دوست بھی) سے کہا کہ بیٹوں کا ولیمہ ہے، مولانا نے ماہِ جون میں گرمی کی حالت میں ایک دن قبل پیر میں چوٹ آگئی تھی؛ لیکن تمام مشقتیں برداشت کر کے دوپہر میں جمعہ کے بعد تکیہ سے چل چلاتی دھوپ میں پیر کی تکلیف کے باوجود میرے گاؤں تشریف لائے، بڑی بشاشت

کے ساتھ تھوڑی دیر رہے، پھر اسی گرمی میں جعفر بھائی، عمار بھائی، مولوی وثیق و مولوی محمد شمیم ایک ہی گاڑی سے روانہ ہوگئے۔

۳۱/اکتوبر ۲۰۲۳ء میں مولانا سید جعفر مسعود حسنی کے ساتھ کشمیر کا سفر ہوا، صبح ندوہ سے خاتون منزل مولانا کو ایئرپورٹ کے لیے لینے نکلے خاتون منزل پہونچے، جب نکلنے لگے، آپ کا بریف کیس لینے کی کوشش کی کہ موٹر تک لیتے چلیں، مولانا نے فرمایا کہ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں، مجھ کو تھیلا بھی لینے نہیں دیا، آپ کے صاحبزادگان سامان لے کر موٹر تک آئے، سبھی دست بستہ کھڑے تھے، سلام و مصافحہ کیا اور ہم لوگ لکھنؤ ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوگئے، اب ایئرپورٹ پر بھی مولانا نے اپنا سامان اپنے پاس ہی رکھا، ہم لوگ کشمیر ایئرپورٹ پہونچے، باہر نکلے، دیکھا کہ مولانا صلاح الدین خان ندوی اپنے رفقاء کے ساتھ استقبال کے لیے موجود ہیں، لوگوں نے استقبال کیا۔

اس کے بعد جس جگہ گئے، لوگوں سے مسکراتے ہوئے ملے اور لوگوں کی خیریت اور حالات معلوم کرتے لوگوں کے سوالوں کے جوابات سادگی و بے باکی سے دیتے، بہت سی جگہوں پر ندوی برادران یا معزز علماء و بزرگ آپ کو جو بھی بطور ہدیہ پیش کرتے، جعفر بھائی فرماتے: آپ حضرات نے بلایا اور زبردست اکرام کیا، یہی میرے لیے بہت ہے، اگر کسی نے کوئی رقم پیش کی تو آپ نے بے نیازی کے ساتھ ویسے ہی لفافہ واپس کردیا، خودداری کے ساتھ عزیمت پر عمل کرنا، سفر و حضر اور بڑے چھوٹے سب کے ساتھ یکساں معاملات کرنا۔ آپ کی ملاقات سے ابنائے ندوہ بہت متاثر ہوئے کیونکہ ملاقات سے قبل کبھی ساتھ رہنے یا برتنے کا واقعہ پیش نہیں آیا، انسان معاملات سے ہی پہچانا جاتا ہے، اثنائے سفر بہت سے مدارس ملحقہ میں جانا ہوا، ہر جگہ مولانا کے بیانات اساتذہ وطلبہ میں ہوئے اور مولانا نے کشمیری ابنائے ندوہ کے دینی و دعوتی کاموں کو سراہا۔ واپسی سے ایک یوم قبل سری نگر میں حضرت بل یونیورسٹی بھی جانا ہوا ،وہاں شعبۂ عربک کے ہیڈ سے ملاقات وتعارف مولانا خورشید ندوی نے مولانا محمد صلاح الدین ندوی کے ساتھ کرائی، انہوں نے M.A کے کلاس میں جا کر طلبہ وطالبات کے سامنے بیان رکھا، مولانا نے دعوت کے کام میں ہماری بہنیں کیسے معاون ہوسکتی ہیں، اس کو موضوع بناتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی وحی اور آپ پر جو خشیت طاری ہوئی اور حضرت خدیجہ سے جو اپنی کیفیت بتائی، آپؐ نے بتائی اور حضرت خدیجہؓ نے آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی جن صفات کے تذکرہ کے ساتھ ڈھارس بندھائی، اس موضوع پر بڑا موثر خطاب فرمایا۔

عبدالرحمٰن ٹانک صاحب ہیڈ تھے، انہوں نے پیش کش کہ سال میں ایک بار آپ محاضرہ کے لیے ضرور تشریف لائیں، آپ کی فکر اسلامی سے ہم طلبہ نے مختصر وقت میں فائدہ اٹھایا، آپ کی ملاقات کے بعد آپ سے مزید فیض حاصل کرنے کی پیاس بڑھ گئی، مولانا نے فرمایا: اگر زندگی نے وفا کی تو ان شاء اللہ دیکھا جائے گا، مسلسل ہیڈ صاحب رابطہ میں رہے، پروگرام بھی بن رہا تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے حضور بلانا تھا، اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کے حضور حاضر ہوگئے۔

آپ سے درمیان میں عرض کیا: ”الناس معادن كمعادن الذهب والفضة“ آپ اچھے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے ایثار وقربانی کا جذ خاندانی طور پر وراثت میں ملا تھا، جب والدہ محترمہ کو فالج ہوا تو میں نے اسی وقت سنا تھا کہ خاندان میں جعفر بھائی کی تعریفیں ہوتی ہیں کہ انہوں نے اپنی والدہ کی ایسی خدمت کی کہ مثالی شخصیت خاندان میں ہوگئے، یہی نہیں اتنی سادگی سے زندگی گزارتے تھے کہ کہیں بھی سوگئے اور کبھی بھی گرمی کا شکوہ نہ کیا، راہ چلتے خیر کا کام کرتے رہتے تھے، ایسے خفیہ طریقہ پر کہ داہنے ہاتھ سے دینے کے بعد بائیں کو پتہ نہ ہو، مولانا سید جعفر مسعود حسنی کی خوبیاں ان کے ”سهل الحصول“ ہونے اور پرتپاک ملنے کی وجہ سے ان کی خوبیوں پر پردہ پڑا ہوا تھا؛ لیکن جانے کے بعد ان کی خوبیوں کا پردہ چاک ہوا: ”كن في الدنيا كأنك غريب“ کا ایک مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسی زندگی گزارو کی لوگ مسافر کی طرح اجنبی سمجھیں۔

دارالعلوم میں ذمہ داریوں کے آنے دو ہی سال پائے تھے؛ لیکن شہر لکھنؤ اور دیگر لوگوں سے دارالعلوم کا تعارف اور فیض پہونچانے کا کام اتنی تیز کیا کہ دارالعلوم کو برسوں آگے بڑھادیا۔ تعلیمی اعتبار سے ہو یا تنظیمی اعتبار سے اور طلبہ کو راحت وآرام پہونچانے سے متعلق ہو، مسائل کو بہت تیزی سے حل کرنے کے قائل تھے، مسائل میں الجھ کر حالات سے مایوس ہوکر بیٹھنے کے قائل نہیں تھے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی پر لوگوں نے بھرپور مضامین تحریر فرمائے ہیں، میں نے تو آپ کے سامنے چند یادوں کا تذکرہ کیا ہے، اس لیے کہ عربی شاعر کہتا ہے:

أحب الصالحين ولست منهم
لعل الله يرزقني صلاحاً

صالحین کی اور اہل بیت اطہار کی خوبیوں کے صدقہ میں اللہ احقر کو بھی صالح بنائے اور اصلاح بھی فرمادے کہاں وہ اور کہاں نکہت گل ذرہ کو پہاڑ سے کیا مناسبت:

بناء کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

☆☆☆☆☆

ملت کے لیے ایک عظیم خسارہ

مولانا سید کلیم اللہ ندوی ☆

مائل بہ فربہی جسم، متوسط قد، پروقار چہرے پر نورانی داڑھی، بال سفید، شگفتہ اور روشن آنکھیں، سادہ لباس، نرم مزاج، خوش نما سراپا، تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھلی پاکیزہ سیرت، شیریں انداز گفتگو، کم سخن، بات چیت میں وقار، نیک نفس، عبادت گزار، دین وملت کے خاموش خادم، اکثر و بیشتر کرتا پاجامہ اور صدری میں ملبوس ۔ یہ تھے عالم باعمل، خادم دین وملت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی سابق ناظر عام ندوۃ العلماء۔ ان کا تعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے مشہور علم اللہی خانوادے سے تھا۔ ولادت ۱۳/ دسمبر ۱۹۶۰ء کو تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہوئی۔ والد ماجد سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی ہیں جو مولانا علی میاںؒ کے حقیقی بھانجے، عربی زبان وادب کے نامور ادیب اور صحافی اور بڑے ملنسار اور خلیق انسان تھے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ ایسے خانوادے کے چشم وچراغ تھے جس نے دین اسلام کے لیے بڑی قربانیاں پیش کی ہیں اور ہمیشہ ابتلاء و آزمائش سے بھی اسے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس خاندان والا شان کو اللہ تعالیٰ نے بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ اس میں توحید وسنت کی دعوت کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ اور سرفروشی کی میدان میں سبقت لے جانے کی چاہت ہے۔ اس خاندان نے برصغیر ہندوپاک ہی نہیں پورے عالم اسلام کو اپنے تجدیدی کارناموں سے روشناس کرایا ہے۔ اس میں علم وعمل کی جامعیت وفراوانی، قرطاس وقلم کی رفاقت وہم نشینی، شعروسخن کی شادابی وبوقلمونی، رواداری، سلوک ومعرفت کی بادہ پیمائی ومسند نشینی ساتھ رہی۔ اسی خانوادے کے ایک در بے بہا مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ اخلاق وایثار، تواضع، انکساری اور تہذیب اخلاق میں اپنے آباء واجداد کے پیرو اور خاندانی روایات کے پاسدار وامین تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بے شمار افراد تیار کیے۔ ان میں امتیازی مقام ان کے دونوں بھانجے مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ رکھتے تھے۔ یہ دونوں ایسے اشخاص تھے جنھوں نے مولانا علی میاںؒ کی رحلت کے بعد ندوۃ العلماء کے مشن کو آگے بڑھایا۔ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ اسی خانوادے کے چشم وچراغ تھے، مولانا کا انتقال پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

آپ کی ولادت باسعادت اسی عظیم خانوادے کی جائے سکونت دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہوئی اور وہیں مولاناؒ نے حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور علوم شرعیہ کے ساتھ عربی زبان وادب میں مہارت پیدا کی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء سے ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان وادب میں ایم۔اے کیا۔ پھر ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب کی مشہور دانش گاہ جامعۃ الملک سعود سے ٹیچرز ٹریننگ کا کورس مکمل کیا۔

فراغت کے بعد مولانا درس وتدریس کے کام میں لگ گئے اور اس فریضہ کو بخوبی انجام دیا۔ مدرسہ عالیہ عرفانیہ عبدالعزیز روڈ لکھنؤ سے رٹائرڈ ہونے کے بعد ندوۃ العلماء میں ناظر عام کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے دو سال سے کم وقفے میں وہ مقام حاصل کرلیا تھا جو برسوں میں حاصل ہوتا ہے۔

مولاناؒ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کیونکہ وہ اس وراثت کے سچے امین تھے جس کے لیے ندوۃ العلماء معروف ہے۔ ان میں علمی قابلیت اور فکری سنجیدگی بدرجہ اتم موجود تھی جس کی ضرورت آج کے مشکل دور میں بہت زیادہ ہے۔

مولانا مرحوم ایک اچھے ادیب، قلم کار، مدرس اور خطیب تھے۔ وہ ندوۃ العلماء کے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ملک وبیرون ملک کے اسفار میں مشغول رہتے تھے: "الرائد" کے لیے مضامین بھی تحریر کرتے تھے اور دار العلوم میں درس بھی دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف پروگراموں میں شریک ہوکر خطاب بھی فرماتے تھے۔ ایک ہی وقت میں اتنے سارے امور انجام دینے والا اچانک رخصت ہوجائے تو جو خلا پیدا ہوتا ہے اس کی تلافی مشکل ہوتی ہے۔

مولانا کا درس نہایت ادیبانہ ہوا کرتا تھا، سلیس تعبیرات استعمال کرنے میں اللہ نے خاص ملکہ آپ کو عطا کیا تھا۔ بہترین انشاء پرداز اور عربی ادب کے شہ سوار تھے۔ وہ بہت خوش طبع، نرم مزاج، بردبار، مشفق اور بارعب استاد

☆ کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی لائبریری، ندوۃ العلماء لکھنؤ

تھے۔مولاناؒ نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں جو زندگی گزاری وہ علم دوستی اور دوسروں کے ساتھ تعاون والی تھی۔تمام طلبہ کا خیال رکھنا،ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور اس کی ہمت افزائی کرنا آپ کی خاص صفت تھی اور اسی کے ساتھ اساتذہ کے ساتھ باہمی تعاون ومحبت کا معاملہ کرنا اور اساتذہ کے تعاون کے ساتھ دار العلوم کے لیے فکرمند رہنا یہ وہ تمام چیزیں ہیں جنہوں نے ان کو جماعت اساتذ واسٹاف میں محبوب بنادیا تھا۔وہ ایک مثالی معلم،فکرمند اور صاحب بصیرت انسان تھے۔اور ایک چیز جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر بہت نمایاں رکھی تھی وہ ان کی فکری سلامتی اور دوسروں کے مفادات کا خیال رکھنا تھی۔

مولانا کا یہ معمول تھا کہ وہ شہر میں ایک عام آدمی کی طرح آمدورفت کرتے تھے،غریبوں اور مسکینوں کی خبرگیری کرتے تھے۔ان کا یہ وصف ان کی شان امتیازی تھی۔ان کی تواضع وانکساری ضرب المثل تھی۔ندوۃ العلماء کے ناظر عام بننے کے بعد انہوں نے جو سب سے نمایاں کام کیا وہ یہ تھا کہ طلبہ براہ راست اپنی ضروریات کے سلسلے میں ان سے بات کرتے تھے۔وہ ایک بہترین منتظم تھے۔مرحوم کی شخصیت سادگی،تواضع و للّٰہیت کا پیکر تھی۔وہ صلاحیت اور صالحیت کا مجسمہ تھے۔ان کی تصنیفات اور تحریریں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور اہل علم ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

دل کا ایک خانہ ایسا بھی ہے جو سوائے کی یاد اور اللہ کی محبت وعشق کے اور کسی چیز سے آباد نہیں ہوتی۔چاہے جتنی دولت مل جائے،چاہے جتنا بڑا عہدہ مل جائے مگر آدمی کے اوپر اداسی رہتی ہے۔جب اللہ کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے تب آدمی کے اندر زندگی آجاتی ہے کیونکہ دل کے اس خانے کو تسکین ہوجاتی ہے:"ألا بذكر الله تطمئن القلوب"(اللہ کی یاد سے دل کو سکون ملتا ہے)۔

ترے قدموں نے رونق دے کر جن سے چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہوں اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے تاجر،ان کے چہروں پر اداسی دیکھی گئی ہے۔ایک بوریا نشین کے چہرے پر تازگی محسوس کی گئی ہے،وہ معرفت کی تازگی،وہ اللہ کے عشق کا سایہ اور اس کی دولت ہے۔مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ اسی مومنانہ اطمینان قلب سے معمور تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو اعلیٰ اخلاق سے سرفراز فرمایا تھا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے۔آپ کی نمایاں صفت جس کا ہر شخص قائل وہ آپ کے اعلیٰ اخلاق ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"إن المؤمن ليدرك بحسن خلقه درجة الصائم القائم"،جن پر عمل کرکے ہر انسان بلند ترین مقام پر پہنچ سکتا ہے جو اللہ کے محبوب ومقبول بندوں کو حاصل ہے۔یہ اپنا خاص کرم اللہ اپنے بندوں کے ساتھ فرماتا ہے۔ان سب کا اظہار ان کے قول وعمل سے ہوتا تھا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے کو منور کر رکھا تھا۔ان کے چہرے کو پرکشش وپرنور بنایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مرحوم ذاتی طور پر بلند کردار،خوش گفتار،خندہ رو اور باوقار انسان تھے۔ان سے جب بھی ملاقات ہوتی تو ان کے اوصاف کے نقوش دل ودماغ پر مرتسم ہوجاتے۔مجموعی طور پر وہ ندوہ کے لیے ایک عظیم سرمایہ تھے۔

مولاناؒ عربی ادب کے ماہر تھے اور ساتھ ہی اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے،مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ خدمت دین وعلم میں گزرا،ان کی تحریر وتقریر میں امت مسلمہ کے لیے دردمندی،دلسوزی اور ذہنی نشوونما کی فکر واضح تھی،ان کی عربی تحریر میں ایک کشش وچاشنی اور سحر انگیزی تھی،چونکہ مولانا کی تحریریں عربی واردو میں بہت جامع ہوتی تھیں اس لیے لوگ ان کی تحریریں بڑے شوق وذوق سے پڑھتے تھے،آپ ایک اچھے انشاء پرداز تھے۔

انہوں نے متعدد ادبی،نظریاتی اور تاریخی مضامین کے ترجمے کیے اور مضامین لکھے۔ان کو عربی زبان اور جملوں پر بہت عبور حاصل تھا۔عربی زبان میں معیاری مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کئی کتابوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔وہ علم وادب کے گوہر آب دار تھے،قلم وقرطاس کے شہ سوار تھے۔لکھنا پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ان کی زندگی آج کے علماء وطلباء کے لیے ایک نمونہ ہے۔وہ راہ علم کے ایسے مسافر تھے جو راحت وآرام سے ناآشنا تھے اور ہر وقت هل من مزيد کی صدا لگانے والے فکر ابوالحسن کے امین تھے۔

مولانا ندوہ کے سچے ترجمان اور اس کی فکر کو وسیع کرنے کے لیے بہت کوشاں رہتے تھے۔اسی کی خاطر انہوں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور وہاں کی علمی شخصیتوں نیز کاروباری وملازمت پیشہ افراد سے ملاقات کرکے انہیں فکرِ ندوہ سے آگاہ کیا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں خانوادۂ علم اللّٰہی کی خصوصیات اس طرح یکجا کردی تھیں کہ گویا وہ ایک گل دستہ ہوں۔

مولانا خوش اخلاق،شفیق اور باوقار شخصیت کے حامل تھے۔مرحوم کی ہردل عزیز شخصیت،ان کی سادہ لوحی اور ندوہ کے اہم منصب پر فائز ہونے کے باوجود ان کی انکساری ایک قابل تقلید نمونہ تھی۔مولانا کی درس

وتدریس کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔مولانا نہایت خلیق ومشفق اورعوام الناس سے محبت کرنے والے ایک بے لوث انسان تھے۔مولانا مرحوم علمی وادبی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔وہ عربی زبان وادب کے مایہ ناز صاحب قلم ، ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ عربی جریدے''الرائد'' کے مدیر اعلیٰ اورعلم وادب کی دنیا کے ایک درخشندہ ستارہ تھے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ سادی مزاجی،بات چیت میں بھولا پن اور معصومیت،عاجزی اورانکساری،تواضع ومروت مرحوم کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔جفاکشی اور محنت سے کبھی نہیں گھبراتے تھے۔قناعت مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اپنے ہم عصروں میں نہایت مقبول اوراپنے عزیزوں میں نہایت محبوب،ہر شخص کے کام آنے والے اور ہر ایک پر مر مٹنے والے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو گوناگوں اوصاف سے سرفراز فرمایا تھا۔بیک وقت وہ مقرر،مصنف،مدرس اورمنتظم تھے۔ دامے درمے سخنے کبھی انہوں نے کسی کے کام آنے سے دریغ نہیں کیا اوراس فکر کے ساتھ کہ:''یاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا''۔کسی سے نہ جھگڑا ہوا،نہ کسی سے رنجش، سب کے عزیز اورسب کے محبوب تھے۔اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب فرمائے۔

مولانا نے موزوں طبیعت پائی تھی۔دیکھنے میں اتنے سادہ مزاج اور بھولے معلوم ہوتے تھے مگر اندر سے دل ودماغ سرسبز وشاداب تھا۔خاک ساری،فروتنی،انکساری،مروت،حلم، عفوودرگزر، حق گوئی، راست بازی، جرأت وہمت، صداقت وشرافت انسانی زندگی کے وہ سدا بہار وخوشنما پھول ہیں جن سے چمن انسانیت ہمیشہ عطر بیز رہتا ہے اور جب یہ صفات کسی مومن صادق کی صفات بن کر جلوہ گر ہوتی ہیں تو اس کی پاکیزگی کے اجالے میں شر وفساد،حرص وہوس،خود غرضی، بدخواہی کی ظلمتیں وتاریکیاں کافور ہوجاتی ہیں۔مولانا مرحوم کا شمار انہیں عالی صفات افراد میں ہوتا تھا جن کے وجود سے زندگی،انسانیت اور معاشرہ میں اعتبار پیدا ہوتا ہے۔مولانا نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ دین کی فکر اوراس کی لگن میں صرف کیا۔اس وصف نے ان کی زندگی کو قابل رشک بنادیا تھا۔اور پھر موت بھی کیوں نہ قابل رشک ہوتی جس کی طبیعت میں دین کی فکر غالب وحاوی رہی۔اوریہی اس بے ثبات انسانی زندگی کا نقطہ عروج وکامرانی اوراس کی فتح مندی ہے جس پر ہزار زندگیاں اوراس کی رعنائیاں نثار اورقربان کردی جاتی ہیں۔صحیح وسچے بزرگان دین وعلماء کرام کی زندگیاں اس لیے بھی قابل اعتبار ومستند ہوتی ہیں۔مولانا ایک مومن کامل کا نمونہ تھے۔وہ مشکلات کے سامنے کبھی سپر انداز نہیں ہوتے تھے۔ہرطرح کے حالات نہایت خندہ پیشانی سے برداشت فرمایا کرتے تھے۔ وہ اللہ کی نصرت پر پورا توکل رکھتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی بہت خاص درجہ کا تھا۔

حضرت شاہ علم اللہؒ کے پہلو میں جہاں اس خاندان کے بہتیرے لعل وجواہر دفن ہیں وہاں ایک نیا نگینہ بھی دفن ہوگیا یایوں کہیے کہ آخرت کا مسافر اپنی منزل پر پہونچ گیا جہاں کی مہمانی روح وریحان وجنۃ النعیم ہے اور جہاں مہمانی کرنے والا غفور ورحیم وشاکر وعلیم ہے۔

راقم کو مرحوم کے ذوق عبادت وتلاوت،شفقت ومحبت،اتباع سنت اورمختلف ومتنوع مشاغل کا شب وروز مشاہدہ رہا۔ان پر اسلاف کا رنگ گہرا ہوتا گیا اور تواضع ومسکنت، دین ودیانت اور اطاعت وانقیاد کے جذبات جو ان کا آبائی ورثہ تھا ان کی طبیعت میں ظاہر وبیدار ہونے شروع ہوئے اوراس انداز سے ان کی شفقت والفت میں اضافہ ہوتا رہا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ حادثہ حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی دامت برکاتہم العالیہ اوران کے خاندان کے لیے بہت سنگین اورصبر آزما ہے۔اس سانحہ پر صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنا فی الحقیقت غیر معمولی عزیمت اور ہمت کا کام ہے اور خاصان خدا کے سوا عام انسانوں کے لیے اس طرح کے حادثے پرصبر کرنا آسان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا اور ان کے پورے خاندان کوصبر جمیل کی توفیق عطا فرما کر مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت میں بلند مقام سے سرفراز فرمائے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا جس پر پوری زندگی عمل پیرا رہے وہ کسی کی دل آزاری سے پرہیز اور انسانیت کا احترام اوراس کا احساس کہ ان کی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہونچے۔ دل دُکھانا تو آپ نے جانا ہی نہیں۔ہر ایک کی دادرسی کرتے تھے خواہ خود پر کیسی بھی کیفیت گزر جائے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، دور کا ہو یا قریب کا، اپنا ہو یا غیر، ہر ایک کے ساتھ درجہ بہ درجہ احترام اور اکرام کا معاملہ فرماتے جس میں مرتبے اورنسبت کا خاص خیال رکھتے۔اپنوں کا دل دکھانا تو بہت دور کی بات ہے مخالفین کی بھی دل شکنی گوارا نہ تھی۔ اس طرح مولانا ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوئے۔اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے،صدیقین اور شہداء کے ساتھ ان کا معاملہ فرمائے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے،آمین۔

☆☆☆☆☆

ندوۃ العلماء کا ایک گلِ صد بہار

مولانا ادیب الرحمٰن ندوی☆

۱۵؍جنوری ۲۰۲۵ء کی شام کو آفتاب اپنی تمام تر ضیاپاشیوں کے ساتھ غروب ہوا تھا کہ اسی کے چند ساعتوں کے بعد ندوۃ العلماء کے ناظر عام، خاندان سید احمد شہیدؒ کے روشن چشم و چراغ، عالم و فاضل، ادیب وصحافی، واعظ خوش بیان، استاد بے مثیل، عالم اسلام کے حالات پر گہری نظر وعمیق و فکر کے حامل، عوام وخواص کے ذہن و دماغ ان کے شعور کو اپنی زبان و بیان اور اپنی گراں قدر تحریروں سے روشن کرنے والا یہ دوسرا آفتاب بھی بالکل نصف النہار میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا، یعنی مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی ایک ناگہانی حادثہ کا شکار ہوکر جام شہادت نوش فرما گئے: انا للہ و انا الیہ راجعون، العین تدمع والقلب یحزن و لا نقول الا ما یرضی بہ ربنا:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ کی رحلت ایسے حالات میں ہوئی جبکہ ندوۃ العلماء کو بڑی شدت سے ان کی موجودگی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اہالیان ندوہ کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، جس کی وجہ سے ان کی موت کا حادثہ ایک ایسے المناک حادثہ کی شکل اختیار کرگیا جس نے ان کے متعلقین ولواحقین ہی نہیں، ان کے اعزہ واقربا، دوست واحباب وہمنشین ہی نہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ ، اسٹاف و ملازمین ہی نہیں، بلکہ پورے ملک ہندوستان کے عوام وخواص کو رنج وغم میں مبتلا کردیا، علوم دینیہ کے مراکز و مدارس پر سکتہ سا طاری ہوگیا، علم و ادب کی محفلوں اور درس و تدریس کی مجلسوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا، ہرکوئی زبان حال سے گویا تھا کہ علمی وادبی محفلوں کی دنیا کا بہت بڑا خسارہ ہوگیا، ملت اسلامیہ کی دیوار میں ایک خلا پیدا ہو گیا، اور صحیح معنوں میں ''موت العالم موت العالم'' کا منظر سامنے آگیا:

رفتی و از رفتت یک جہاں تاریک شد
تو مگر شمعے چوں رفتی بزم برہم ساختی

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ ایک ایسے علمی وروحانی خانوادے کے فرد فرید تھے جس سے سارا عالم اسلام خصوصاً ہند وپاک مستفید ہوتے رہے ہیں اور یہ استفادہ کا سلسلہ آج بھی اپنی تمام تر خوبیوں اور تابانیوں کے ساتھ جاری وساری ہے، شاہ علم اللہ حسنیؒ اس خانوادہ کے جد امجد تھے جن کی عظمت وبلندی نے عقیدۂ توحید اور اتباع سنت کی ترویج واشاعت کا ایک روشن باب قائم کیا ہے۔ یہ خانوادہ سید احمد شہیدؒ کا ہے، جن کی ایک ایک مجلس میں ہزار ہا ہزار لوگ اسلام کے حلقے میں داخل ہوتے تھے، اسی خانوادہ میں مولانا سید عبدالحی حسنیؒ پیدا ہوئے جنکی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' اہل علم کے درمیان مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی خانوادہ میں مفکر اسلام اور خانہ کعبہ کے کلید بردار حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنیؒ ندوی نے آنکھیں کھولیں، جن کے اوصاف وکمالات پر سیکڑوں کتابیں اور جریدوں کے نمبر شایع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں اور آج بھی لکھنے والے ان کے کسی نہ کسی گوشۂ حیات پر لکھتے رہتے ہیں، اسی خاندان کے ایک درخشاں ستارے مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ تھے، جو ایک متقی عالم، عربی زبان وادب کے ماہر اور قوم وملت کا درد رکھنے والے عظیم انسان تھے، ان کے بھائی مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ بھی علم وادب کی دنیا میں ایک بلند وبالا مقام ومرتبہ رکھتے تھے، وہ عالم فاضل اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم صحافی بھی تھے، نہایت خاموش مزاج، متواضع اور نیک طبیعت کے مالک تھے، مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ انہی کے فرزندار جمند تھے، جو بہت ہی ملنسار خوش مزاج خلیق، شفیق ذہین ذکی وفطین انسان تھے، اور کیوں نہ ہوں، کیونکہ ذہانت، فطانت اور ذکاوت عموماً خدا داد یعنی بڑی حد تک موروثی خصوصیات ہوتی ہیں اور اگر ان خصوصیات کو سازگار ماحول، اعلیٰ تربیت، مناسب تعلیم اور محرکات مل جائیں تو یہی خصوصیات بالترتیب عقل وفہم اور لیاقت وسوجھ بوجھ میں بدل سکتی ہیں۔ مولانا خود بھی باصلاحیت نیک صفت اور صالح طبیعت کے حامل تھے اور ان کو سازگار ماحول بھی میسر تھا یہ سب ایسی خوبیاں ہیں جو انسان کو بلندی پر پہونچا دیتی ہیں اور جب یہ چیزیں کسی ایسے خانوادے کے فرد میں ہوں جن کی صالحیت اور نیکی بین العوام والخواص مسلم رہی ہو تو پھر اس پر چار چاند لگ جاتے ہیں، یہ سب چیزیں کسی انسان میں اسی وقت پیدا ہوسکتی ہیں جب اس میں خود

☆ کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی لائبریری، ندوۃ العلماء لکھنؤ

صالحیت موجود ہو۔ مولانا مرحوم کو یہ ساری اچھائیاں حاصل تھیں جس کی وجہ سے وہ ایک ممتاز اورنمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

مولانا مرحوم ۱۳؍ستمبر ۱۹۶۰ء میں تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے، آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، قرآن مجید حفظ کیا اور ایک اچھے حافظ تھے، اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور ۱۹۸۱ء میں عالمیت، ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی ڈگری حاصل کی، اس وقت ندوۃ العلماء کے ناظم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ تھے اور مہتمم مولانا محب اللہ لاری صاحبؒ تھے۔

مولانا سید جعفر ندویؒ کے اساتذہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور مولانا عبداللہ عباس ندویؒ، خود ان کے حقیقی چچا مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور والد بزرگوار حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ نیز حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن ندوی اعظمی دامت برکاتہم جیسی علوم وفنون کے میدان میں اپنی استادانہ لیاقت ومہارت کے تابندہ نقوش ثبت کرنے والی ہستیاں قابل ذکر ہیں، جن سے ندوۃ العلماء میں مولانا جعفر مرحوم نے پورے شعور و احساس کے جذبے سے اپنی کشت علم و عرفان کو سیراب کیا۔ دینی علوم کی تحصیل کے بعد آپ عصری علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے بھی کیا، ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب گئے جہاں مشہور درسگاہ "جامعة الملك سعود" سے ایک سالہ تربیتی کورس کیا اور ممتاز علماء سے کسب فیض کرنے کے بعد انہوں نے اپنی علمی وتدریسی خدمات کی انجام دہی کا محور مدرسہ عالیہ عرفانیہ لکھنؤ کو بنایا اور وہاں وہ ایک طویل عرصہ تک نہایت انہماک کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، ہزار ہا ہزار تشنگان علوم نبوت کو اپنے علمی چشمے سے سیراب کرتے رہے، جو آج ملک و بیرون ملک قوم وملت کی پیاس بجھانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ مولانا مرحوم مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں اپنی متعینہ مدت پوری کرنے کے بعد باقاعدہ طور پر ندوۃ العلماء سے منسلک ہوئے اور ۲۰۲۳ء میں ناظر عام کے عہدے پر فائز ہوئے، اس سے قبل ۲۰۱۹ء میں پندرہ روزہ مجلّہ "الرائد" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال چکے تھے۔

آپ کی ذات میں تعلیمی وتدریسی صلاحیت کے علاوہ انتظامی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی اس لئے جب وہ ندوۃ العلماء کے ناظر عام کے عہدے پر فائز ہوئے، تو اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کے ساتھ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور اسی کے ساتھ ساتھ تدریسی اور تعلیمی فرائض کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے، ان دونوں حضرات کا ساتھ یعنی مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی بحیثیت ناظر عام ندوۃ العلماء، ان میں سے ایک یعنی موجودہ ناظم سابق ناظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے بھتیجے اور دوسرے ناظر عام سابق معتمد تعلیمات حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ کے صاحبزادے۔ ان کا رشتہ، ان کا آپسی تعلق، باہمی تال میل اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ اور ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے کی عادت کو دیکھ کر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے ایک ساتھ رہنے اور ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی عادتوں کی یاد آتی تھی، نگاہوں کے سامنے وہی مناظر پھر جاتے تھے اور وہی دیرینہ یادیں تازہ ہوجایا کرتی تھیں، جن سے ہماری نگاہیں اور ہمارے دل و دماغ بہت پہلے سے مانوس تھے، ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آ جاتی تھی دلوں میں ایک خوشی کی کیفیت گزر جاتی تھی۔ محبان ندوۃ العلماء کے لئے بالکل ویسے ہی یہ دونوں حضرات بھی روشن امید بنتے جارہے تھے، ان کے اندر ندوۃ العلماء کی ترقی کی ہر ممکن راہوں کو ہموار کرنے کا حوصلہ اور جذبہ بھی تھا، صلاحیت اور لیاقت بھی تھی اور عمدہ سوچ وفکر بھی رکھتے تھے۔ جس سے آنے والے دنوں میں یہ امید بندھتی جا رہی تھی کہ یہ دونوں حضرات اپنے دونوں بزرگوں کے ہو بہو ہونگے۔ لیکن تقدیر الٰہی کے سامنے ساری تدبیریں ایک سوچ بن کر رہ جاتی ہے۔ مشیت ایزدی، کہ حضرت، مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ ہمارے درمیان اتنے ہی دن تک رہے جتنا انھیں دنیا میں رکھنا اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمادیا تھا، پھر انھیں اپنے جوار رحمت میں بلالیا:

کوئی دنیا میں نہیں آیا ہمیشہ کے لیے
بس خدا کا نام ہی نام خدا رہ جائے گا

مولانا کو قرآن سے بہت گہرا تعلق تھا، قرآن شریف چوں کہ منبع ہدایت ہے، اس کی رہنمائی انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، قرآنی رہنمائی کے مطابق زندگی گزارنا موجب سعادت ہے، مولانا اپنی تدریسی زندگی میں قرآن کی تعلیم سے متعلق رہے،..................

..................بقیہ صفحہ ۱۰۲ پر

تمہاری نیکیاں زندہ، تمہاری خوبیاں باقی

مولانا محمد شمیم ندوی☆

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ یہاں خوشی خالص ہے، نہ غم خالص، اس میں راحت و تکلیف دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، موت برحق ہے، وہ یتیموں کی آہ، بیواؤں کی پکار سننے کو تیار نہیں، اس کو اس سے بحث نہیں کہ کون کلی کھلنے سے پہلے مرجھا جائے''، انسان فنا کی منزل کا مسافر ہے، لوگ وقت معینہ کیلئے سرائے فانی میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، باقی رہنے والا نام اللہ کا ہے، یہی خالق کائنات ورب ذوالجلال کا تکوینی و حتمی فیصلہ ہے۔

ماضی قریب میں خاندان حسنی کی ایک ایک مایہ ناز شخصیت سامنے آتی رہی اور اپنے حصہ کا کام کر کے اپنے پالن ہار کے حضور حاضر ہوتی رہی، جن میں مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی وفات ۳۰/جنوری ۲۰۱۳ء کے بعد اس خانوادہ کے افراد تسبیح کے دانوں کی طرح مسلسل رخصت ہونے لگے، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی وفات ۱۶/جنوری ۲۰۱۹ء مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ کی وفات ۷/مئی ۲۰۲۱ء مولانا سید محمود حسنی ندویؒ، کی وفات ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء، مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات ۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء، اور ۱۵/جنوری ۲۰۲۵ء مطابق ۱۴/رجب المرجب ۱۴۴۶ھ کو ناظر عام جناب مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کا اچانک حادثہ وفات، ایک اور دل خراش سانحہ وفات ثابت ہوا، جس نے ملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، یہ خبر ایسی تھی کہ دل ماننے کو تیار نہ تھا۔

آخری دیدار کے لیے علماء، قائدین ہر مکتبہ فکر، اور ہر خاص و عام سمیت، پروانہ وار تکیہ رائے بریلی کے لئے نکل پڑے، جس میں احقر، اہلیہ سمیت بچے بھی شامل تھے۔

مولاناؒ کی ناگہانی موت سے امت نے جرأت واستقلال کا پیکر، اسلاف کی روایات کا امین و پاسبان، خاندانی خصوصیات وشرافت کا وارث، علم وعمل کا حسین سنگم، اور اپنے ہر دلعزیز کو کھو دیا ہے۔

کتنا پاکیزہ ہے وہ غم، جس میں آہ وفریاد نہیں، کتنا مبارک ہے وہ صبر جو بندوں کو مولی سے جوڑ دے، اور اس کے فیصلہ سے راضی وشاکر کر دے، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی زندگی کے آخری لمحات بھی مقصد تخلیق کی راہ میں نچھاور ہوں، اس غم گسار ماحول میں کتنا عظیم ہے کردار حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی مدظلہ کا، رضا بالقضا کا نمونہ، اور خوئے تسلیم کی قابل تقلید مثال۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ ابن مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کی پیدائش اولیاء اللہ کی آماجگاہ، سید احمد شہید علیہ الرحمہ کی بستی، دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں، رائے بریلی، صوبہ اتر پردیش کے معزز ومحترم خانوادہ سادات میں ۱۳/ستمبر ۱۹۶۵ء، کو ہوئی، اس بستی کو فقیر منش درویش حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ نے آباد کیا تھا، یہاں تسلسل کے ساتھ علماء، صلحاء، اہل دل، اولیاء کاملین پیدا ہوتے رہے ہیں یہاں ایمان و عزیمت کی مثالی شخصیات کی قبور بالترتیب موجود ہیں، جنھوں نے اپنی زندگیاں دین کی خدمت کے لیے وقف کیں، اور علمی وروحانی سرمایہ ورثہ میں چھوڑا، اس سرزمین سے دین وایمان اور اصلاح معاشرہ کی ایسی پرجوش تلاطم خیز آندھیاں چلیں ہیں جن کے اثرات سارے عالم پر پڑتے آ رہے ہیں، اور اسی خاندان کے گل سرسبد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے دورِ نظامت کو اس ملی ادارہ کا زریں دور کہا جاتا ہے، جس نے ایک صدی سے زائد مدت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اپنے خون جگر سے آبیاری کرتی آ رہی ہے، جس کے سپوتوں نے عرب کی مقدس سرزمین میں جنم لینے والے دانشوروں کی بھی فکری قیادت کی، یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں پر نسلیں پروان چڑھیں، جو ملت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی آ رہی ہیں، اور اپنے علم وعمل کے وہ نشان چھوڑ گئے ہیں جو مدارس عربیہ وامت مسلمہ کے لیے مشعل راہ ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ، مایۂ ناز ہستی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے عظیم فرزند تھے، جنھوں نے اپنی عمر عزیز کے تقریباً پچاس سال اللہ کے دین کی خدمت اور قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، اور نشر واشاعت میں صرف کئے تھے، آپ کی شخصیت، قیمتی تجربات کے پیکر، اور علم و معرفت کا حسین سنگم تھے، احوال زمانہ پر ان کی گہری نظر تھی، انکی زندگی فنائیت اور نفس کشی سے عبارت تھی، وہ استاذ الاساتذہ، مربیوں کے مربی،

☆ ناظم مدرسہ ریاض الجنۃ، مکارم نگر، لکھنؤ

اورنسلوں کے معمار تھے،وہ پختہ علم اور فکر عالی کی اونچی مسند پر تھے،متعدد خوبیوں کا گلدستہ بہار،علم و عمل کے دھنی،اور قلم کے ایسے شہسوار ،جسکا پوری عرب دنیا میں غلغلہ تھا،وہ شاندار وجاہت وشباہت کے ساتھ اسلامی جمالیات کا نمونہ تھے،اور ایسے قدآور صحافی، کہ دعوتی وفکری محاذ ہو، یا مستشرقین و مغربی یلغار، ہر محاذ پر اسلام کا بھر پور دفاع کیا،اور بہت ہی خوبصورتی سے اپنے فرزند کو ہیرے کے مانند تراشا تھا،اور اپنے مثالی کارناموں سے زمانہ کو یہ کہنے پر مجبور کردیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عمر عزیز کی ۶۰ / بہاریں دیکھی تھی،اگر عمر عزیز کا کچھ حصہ بڑھ جاتا، تو اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے علم وفضل کا تیز دھارا نہ جانے کہاں جاکے رکتا،اتنی تیزی سے وہ عظیم کام انجام دئے جو دوسرے لوگ اپنی عمر عزیز کا سارا حصہ صرف کر کے بھی کچھ نہ کر سکے۔

مولانا مرحوم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کے حقیقی بھانجے، مدبر اسلام مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے بھتیجے و داماد تھے، خاندان حسنی کے علمی و تصنیفی روایتوں کے امین و عکس جمیل ہونے کے ساتھ ان کے اندر اسلاف کی پاکیزہ روایات اور عزم وعمل کی امانتیں محفوظ تھیں، جس سے ہر ایک خاص کر ندوۃ العلماء کو آپ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں،عربی زبان و ادب ،فکر اسلامی ان کا موضوع تھا،وہ اپنی علمی ، دینی، تدریسی و تصنیفی خدمات کے ساتھ ندوۃ العلماء کی اہم ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دے رہے تھے،مولاناؒ بنیاد کا وہ پتھر تھے جو دکھائی نہیں دیتا،لیکن جب وہ اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے تو پوری عمارت چرمرانے لگتی ہے،لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

آپ کا اسلوب نگارش صاف ستھرا،اور لکھنا، پڑھنا زندگی کا ایک ضروری مشغلہ تھا، افہام وتفہیم کی بے پناہ صلاحیت تھی،اور اپنی ذاتی زندگی میں نہایت سادہ مزاج،تواضع وانکساری،حسن اخلاق بلند کردار کے مالک تھے،عالم اسلام کی صحافت پر گہری نظر،اور زمانہ کے تقاضوں سے واقف تھے،آپ کی شفقت اور علم دوستی نے بے شمار شاگردوں کے دل جیتے،تصنیف وتالیف اور صحافت کے میدان میں بھی ایک نمایاں وعظیم کردار تھا،درجنوں علمی وادبی نایاب کتابیں لکھیں، جو اپنی گہرائی اور معنویت کے اعتبار سے نہایت ممتاز اور قارئین کو مفید ومتاثر کیا۔

وہ بہترین نمونہ تھے،سادگی اور تواضع کا، بے نفسی اور بے نیازی کا، انکے یہاں علم بھی تھا،اور عمل بھی،حسن اخلاق بھی تھا، اور صلہ رحمی بھی، وسعت نظر بھی تھی ، اور وسعت قلبی بھی ، انداز میں محبت کا عکس جمیل ،گفتار میں پختگی،خمیر میں انسانیت اور ہمدردی تھی، وہ بہترین منتظم بھی تھے اور اعلی صلاحیت کے حامل بھی، آپؒ کا ہر وصف انوکھا، ہر خوبی نرالی،اور صفتیں بے نظیر تھیں، ان کے اندر بزرگان دین،اکابرین ندوہ کا ذوق پوری طرح رچا بسا تھا،ندوۃ العلماء کے بنیادی تخیل قدیم صالح وجدید نافع کی بہترین مثال، اور خاندان حسنی کے چشم وچراغ تھے۔

اللہ نے آپ کو عالی نسبتوں اور خاندانی نجابتوں ،اور حج وعمرہ جیسی عظیم نعمتوں سے نوازا تھا ،وہ باکمال شخصیات کی سرپرستی وتربیت،اور گہوارہ علم وعمل میں پروان چڑھے،بزرگوں سے بڑی محبت وعقیدت ،اوران کی شفقتیں ودعائیں حاصل تھیں،جس سے اہل علم کے درمیان قابل رشک مقام تک پہونچے،وہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ، ناظم ندوۃ العلماء کے دست بازو تھے،آپ کی سادگی،شہرت سے کنارہ کشی ایک ایسا امتیاز تھا، جو کم ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے،مولاناؒ کی شخصیت نگاہ کی بلندی،سخن کی دلنوازی،اور جاں پرسوزی کا پیکر تھی،وہ صلاحیت ،صالحیت اوراخلاق حسنہ کا مجسمہ تھے، جس سے طلباء واسٹاف براہ راست مولاناؒ سے جڑے ہوئے تھے۔

ان کی شخصیت علم وعمل کی پیکر تھی،ان کی زندگی اخلاقی اقدار اور علمی جواہر کا حسین امتزاج تھی،وہ ایک متبحر عالم دین اور شاگردوں کے لئے مشفق اور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے،ان کی باتوں میں شیرینی،علم میں گہرائی،اور شخصیت میں تواضع و انکساری کا عنصر تھا،ان کی زندگی میں قناعت پسندی،اور سادگی وتواضع کا رنگ نمایاں تھا،وہ دنیاوی نمود ونمائش سے بے نیاز اور اپنے مقصد حیات کے لئے یکسو تھے، ندوۃ العلماء کی انتظامیہ میں جب سے شمولیت ہوئی تو اس منصب کے شایان شان اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا،ان کے ذریعہ کسی کا کام بن جائے اس میں ہر ممکن تعاون کرتے،جو ان کے حسن اخلاق، بلند کردار کا مظہر ہے۔

وہ ہم چھوٹوں کے بڑے شفیق اور ہر موقع، ہر ملاقات ت پر حوصلہ افزائی کی،مولانا نے ہمیشہ درس وتدریس کے ساتھ ذمہ دار شہری بننے اور وسعت قلبی پیدا کرنے کا درس دیا،شفقت کا معاملہ کرنا انکا امتیازی پہلو تھا۔

راقم سطور کی برسوں کی وابستگی، اور چندو اقعات یاد تازہ کرتے ہیں کہ:

انتقال سے دو دن قبل دوشنبہ کے دن غالباً ۱۲ر بج رہے ہوں گے، مہمان خانہ کے سامنے تشریف فرما تھے، مہمانوں سے ملاقات کرنے اور جناب احمد صدیق صاحب (دفتر نظامت) کے ذریعہ لائی ہوئی فائلوں و دفتری کاموں کو انجام دے رہے تھے، اور قریب تھا کہ وہ کسی پروگرام میں تشریف لے جانے والے تھے، کہ فدوی اپنی درخواست کے ذریعہ مدرسہ ریاض الجنۃ کا ممکنہ تعاون دیے جانے، اور بینک کھاتہ کھولنے کی مہلت کی درخواست پیش کی، اور وقت غالباً میری آخری درخواست پر دستخط فرما کر مہلت کی اجازت دی، کہ چلتے چلتے بھی راقم کے لیے مولانا مرحوم کا ہمدردانہ برتاؤ و مشفقانہ رویہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، اور مدرسہ کے لیے صدقۂ جاریہ ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اکابر ندوہ کے اہم مضامین مدرسہ کی تعلیمی دائری میں بطور طلباء کے استفادہ کے لیے راقم کو جمع کرنا تھا، جب حضرت مولانا بلال حسنی ندوی مدظلہ (ناظم ندوۃ العلماء) جناب مولانا محمد زکریا ندوی مدظلہ (عمید کلیۃ الشریعہ) جناب مولانا محمد خالد ندوی مدظلہ (عمید کلیۃ الدعوہ) جناب مولانا محمد علاء الدین ندوی مدظلہ (عمید کلیۃ اللغہ) کے مضامین حاصل کر لیے تو مولاناؒ سے بھی "تعلیم کی اہمیت وافادیت" پر مضمون کے لیے درخواست کی، تو دل جوئی وہمت افزائی کے ساتھ مذکورہ موضوع پر اپنا جامع مضمون عنایت فرمایا، اور استفادہ وقبولیت کی دعاؤں سے نوازا۔

راقم سطور کے ساتھ انکی سادگی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ بندہ عشاء کی نماز کے بعد وقتاً فوقتاً حسب معمول بزرگوں کی آماجگاہ مہمان خانہ گیا ہوا تھا، اس وقت ہمارے رفیق درس جناب مولانا جمال احمد ندوی (رکن مجلس شوریٰ ندوۃ العلماء) کے ساتھ مولانا محترم کی واپسی نیپال سے ہوئی تھی، دیکھ کر دونوں حضرات انتہائی خوش ہوئے، اور میز پر چائے وناشتہ لگایا گیا، اس وقت منصب اور ہر لحاظ سے جس کرسی پر مولاناؒ کو بیٹھنا چاہئے، اس پر نہ بیٹھ کر ناچیز کو بیٹھنے کی ترجیح دی، اور انتہائی عزت وسعادت سے نوازا۔

اسی طرح غالباً ۱۹۹۴ء میں ندوہ کمپیوٹر سنٹر کا احقر ذمہ دار تھا، اور مولانا مرحومؒ "ماہنامہ بانگ حراء" کے مدیر بنائے گئے تھے، اور معروف صحافی و سابق استاذ انگریزی دارالعلوم ندوۃ العلماء امین الدین شجاع الدینؒ بھی پرچہ کے ذمہ دار تھے، کمپوز کرنے، مضامین کی سٹنگ، اور منظّم کرنے میں جب رات کے گیارہ، بارہ بج جاتے، تو مولانا محترم بند، مکھن چائے وغیرہ کا اہتمام کرتے، اور خوب شوق سے کھلاتے، مولاناؒ کی سادگی وتواضع کے ایسے خوشگوار لمحات وایام تھے، جسے بھلایا نہیں جاسکتا، جس کا تذکرہ مولاناؒ نے ندوۃ العلماء کے اعلی منصب پر فائز ہونے کے باوجود اکثر ملاقات پر کرتے، یا الٰہی! وہ ایسے وقت ہم سب کے درمیان سے اچانک چلے گئے جبکہ سب سے زیادہ ندوے کو اور تشنگان علم و ادب کو ان کی ضرورت تھی اس طرح حسن اخلاق و مخلص معلم کی بہت سی یادیں ہیں۔

بس سانحہ وفات کے دن ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ علم وعمل کا گوہر نایاب، ایسا پھول جسکا مہکنا اور آسمان کی بلندیوں کو جسکا چھونا ابھی باقی تھا، اور شاعروں کے کلام کا سہارا لیکر اپنے دلی کیفیات اور جذبات کو اس طرح پیش کر رہے تھے۔

جہاں مولانا کے تینوں فرزند خلیل حسنی ندوی، امین حسنی ندوی، عبدالحیٔ حسنی ندوی، ہمارے پڑوسی عزیز اور خانوادۂ حسنی کے داماد جناب مولانا اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی اور ان کے واہل خانہ، متعلقین، اساتذہ، طلباء، شاگرد سمیت سبھی کی آنکھ اشک بار، اور دل سوگوار تھے۔

افسوس کہ تسلسل کے ساتھ باصلاحیت افراد اور علمی چراغ بجھتے جارہے ہیں، وہ عظیم قدریں جن سے ندویت عبارت ہے، معدوم ہوتی جارہی ہیں۔

ایسے میں مولانا کے تینوں ہونہار، عالم دین فرزندوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اپنے والد محترمؒ کے عظیم سرمایہ اور قیمتی ورثہ کو نہ صرف باقی رکھیں گے، بلکہ قوم وملت کے استفادہ کے لیے اپنے حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء (سید بلال عبدالحی ندوی مدظلہ) کی سرپرستی اور اہل علم کی رہنمائی میں والد محترمؒ کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کے ساتھ اس میں اضافہ کریں گے، اس طرح مولانا ہمارے درمیان نہ ہونے کے باوجود ان کا مشن جاری رہے گا، اور اس میں حصہ لینے والوں کے لیے ذخیرہ آخرت، اور کامیابی وکامرانی کا ذریعہ ثابت ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مادر علمی کو ہر طرح کے شرور وفتن سے محفوظ رکھے، اور اس مرکز علم وفن کو حاسدین کی درانداز یوں سے بچائے، مرحوم کی مغفرت اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، جن شخصیات کے لیے مولانا دست بازو تھے، انھیں اس سانحہ کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

☆☆☆☆☆

’’خیر کم خیر کم لأهله‘‘

مفتی مسعود حسن حسنی ندوی☆

دین برحق دین اسلام ہے، یہ یہ خدائے واحد کا پسند کردہ دین ہے، اس کی حفاظت کا ذمہ بھی رب کائنات نے لے رکھا ہے، جس نے بھی اس میں کتر بیونت کرنے کی کوشش کی، اپنی عقل وفکر کے نہاخانوں پر اعتماد کر کے کوئی ایسی نئی بات کہی جس سے اس دین پر آنچ آئی ہو تو ذلت ورسوائی کے دلدل میں گھستا چلا گیا، اس کی عقل اس کے کام نہ آئی، اور جنہوں نے اسلام کے اصولوں وضابطوں پر چلتے ہوئے صحیح راہ کو چنا، وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے، ایک جائزہ لیتے جایئے تو ابتدائے آفرینش سے آج تک تواتر کے ساتھ افراد کار کی ایک کڑی آپ کو نظر آئے گی، اس کڑی میں کسی قسم کا خلا نظر نہیں آئے گا۔

موجودہ زمانے کے افراد کار میں جہاں بہت سے افراد متعدد میدانوں میں کام کرتے نظر آئیں گے، وہیں ایک اہم شخصیت جو فطری طور پر خاموش طبع اور شہرت سے دور رہنے والی صفات کی حامل تھی، اچانک شہرت کے اُفق پر نمودار ہوتے ہی لوگوں کے ذہن ودماغ پر اپنے علم وفضل، اخلاق اور اعلیٰ سیرت و کردار کی چھاپ چھوڑ گئی، یہ شخصیت بہت ہی تیزی کے ساتھ اُفق پر ظاہر ہوئی اور اپنی شخصیت کے گہرے وتابندہ نقوش کے تاروں کے ذریعے لوگوں کے دل و دماغ پر کیف وسرور کی کیفیت طاری کر دی، دلوں کو گرمایا، دماغوں کو مسحور کیا، کانوں کو مخمور کیا، بات کیا کی، دلوں میں اتار دی، مشورہ کیا دیا، ایک ساز چھیڑ دیا۔

یہ شخصیت ایک اختراعی شخصیت کے طور پر نمودار ہوئی اور موفق من اللہ بن کر اسلام کے دفاع کے لیے اپنے آپ کو وقف کر ڈالا اور چند ہی سالوں میں وہ عظیم کارنامہ انجام دے ڈالے جس کے لیے خاصہ وقت درکار ہوتا ہے اور اپنا کام کر کے اپنے مالک حقیقی سے جزا لینے کے لیے چل نکلے۔

غور وفکر کرتے جایئے اور جاننے کی کوشش کیجئے کہ کیا اسباب تھے اور کیا وجوہات تھیں جس نے ایک کم گو شخصیت کو میدان عمل میں قدم نکالنے پر ابھارا اور اپنی زندگی کے دھارے کو تبدیل کرنے میں مہمیز کا کام کیا۔

اس میں سب سے بڑی وجہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے لوگوں کو اسلامی سانچے میں ڈالنے کی فکر تھی، پھر والدین کے لیے صدقہ جاریہ بننے کا تصور، اور ذمہ داری کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی سے گریز، ان تمام خصوصیات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو جناب مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کی زندگی کے تانے بانے میں یہ خصوصیات دکھائی پڑتی ہیں۔

۱۹۸۵ء کا زمانہ جو ہمارے بچپن کا اور ان کی جوانی کا تھا، رائے بریلی تکیہ میں ان کا آنا ہوتا تھا، ہم لوگ ان کے آنے سے بڑے خوش ہوتے تھے اور ان کے پاس بیٹھتے تھے، کبھی ان سے علمی باتیں بھی ہوتی تھیں، وہ اپنی دادی، ہمشیرہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آتے، گفتگو کرتے، وہ ان کے نخرہ وغیرہ برداشت کرتیں، ان کی والدہ ان کو بہت چاہتی تھیں، وہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے، لیکن چاہت ایسی نہیں تھی جو تربیت کے اصولوں پر اثر انداز ہو، وہ جس طرح دوسرے لڑکوں (جو ان کے بھانجے وغیرہ تھے) سے کام کرواتی تھیں، اسی طرح وہ اپنے بیٹے سے بھی کام کرواتی تھیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتی تھیں، ان کے رشتے کے خالہ زاد بھائی احمد کمال فریدی صاحب جن کی والدہ اور مولانا جعفر صاحب کی والدہ خالہ زاد بہنیں تھیں اور مولانا جعفر صاحب اور احمد کمال چچا دونوں گہرے دوست تھے، ان کا کہنا ہے کہ چھوٹی خالہ نے آج تک ہمارے اور جعفر کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا۔

زمانہ ایسے ہی گزرتا رہا، ۱۹۹۰ء کے بعد میرا ندوہ آنا ہوا، یہاں خاتون منزل میں قیام رہا، ہر وقت ماموں جی کا ساتھ رہا، ان کو اصولوں پر کاربند با صلاحیت انسان پایا، ایک طرف وہ بہترین استاد نحو وصرف اور ادب وانشاء کے ماہر تھے، دوسری طرف بہترین بیڈمنٹن کے کھلاڑی، بڑوں بڑوں کو انہوں نے مات دی، گھر کے بچوں کی علمی صلاحیت کو آگے بڑھانے میں ان کو بڑا ملکہ تھا، محمود بھیا اور عمیر بھیا نے باقاعدہ الگ سے بعض کتابیں ان سے پڑھیں، سمجھانے کا ایک اچھوتا ملکہ ان کو حاصل تھا۔

متعدد مضامین میں نے بھی ان کو دکھائے، اصلاح کا انوکھا انداز تھا، تحریر بڑی شستہ اور پختہ تھی، ان کی تحریر کے بارے میں مولانا ابوبکر حسنی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ جعفر کی تحریر میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تحریر کی جھلک نظر آتی ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے عشق کی حد تک تعلق تھا، ان کے خلاف بولنے والے اور لکھنے والے کے خلاف ان کا قلم سیل رواں کی طرح کام کرنے لگتا تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ ان کی تقاریر کے کیسٹ کا ایک سلسلہ تیار ہو جائے جس کے ذریعے دعوتی فکر عام ہو، یہ کام مولانا جعفر حسنی

☆ استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ذمہ لیا اور پورے انہماک کے ساتھ اس کام میں لگ گئے اور ایک ایک کیسٹ کو سن کر عربی وار دو تقاریر کے مجموعہ کو تیار کیا اور اس کو لوگوں میں عام کیا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے بے حد خوشی ہوئی اور انہوں نے ان کو بے پناہ دعائیں دیں، غالباً یہ وہی دعائیں تھیں جس نے ان کو آسمانِ دنیا کے افق پر چمکنے والا ستارہ بنا دیا، ان کی ایک اہم خصوصیت ان کے انہماک کی تھی، جس کام میں لگتے اس میں جٹ جاتے تھے، جب تک وہ کام کر نہیں لیتے تھے اس کو نہیں چھوڑتے تھے، متولی شعراوی کہ تفسیری نکات سنتے تو سنتے چلے جاتے تھے، علی طنطاوی و یوسف القرضاوی کو سنتے تو مسلسل سنتے رہتے، جب تک ان کے الفاظ ان کی زبان پر آنے نہ لگتے، نہ چھوڑتے، پڑھتے تو عبارتیں کی عبارتیں یاد کر لیتے، اسی طرح لڑکوں کو تیار کرنے میں ان کا اہم کردار رہا ہے جو کام دیتے اس کو کروا کر چھوڑتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو تربیت کا نرالا اسلوب عطا فرمایا تھا، اسی طرح خدمت میں وہ ممتاز مقام کے حامل تھے، ان کی والدہ بیمار ہوئیں تو بغیر کسی کی مدد لیے پورے انہماک کے ساتھ ان کی خدمت کرتے رہے جہاں جہاں دکھانے کی ضرورت پڑی وہاں ان کو لے کر گئے، پھر رائے بریلی میں ڈاکٹروں کے مشورے سے قیام رہا، روزانہ ٹھنڈ ہو یا سخت گرمی، ایک بجے لکھنؤ سے چل کر رائے بریلی والدہ کی خدمت کے لیے آنا اور صبح ۶، ۷ بجے لکھنو مدرسہ عالیہ عرفانیہ پڑھانے کے لیے جانا معمول بن گیا اور جب تک والدہ حیات رہیں، یہی معمول رہا، ان کے انتقال کے بعد پوری توجہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحت کی فکر میں لگے رہے اور مخدوم چچا حضرت مولانا رابع حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آتے جاتے رہے، وہ ان سے اپنے امور میں مشورہ کرتے اور بے انتہا ان پر اعتماد کرتے، مولانا حمزہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے چچا زاد بھائی تھے؛ لیکن سگے بھائی سے بڑھ کر دونوں کا ایک دوسرے پر اعتماد اور محبت مثالی کردار کا حامل، مولانا حمزہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری میں ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے علاج کی فکر میں مسلسل لگے رہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے ملنے والوں سے حسن سلوک کا معاملہ کرتے رہے، ان کی ایک بڑی خصوصیت لوگوں کے کام آنے کی تھی، وہ ہر ایک کے کام آتے، کام جسمانی نوعیت کا ہو یا مالی نوعیت کی کسی قسم کی مدد کا ہو، جو ان سے ہوسکتا وہ کرتے، اور اپنی استعداد سے زیادہ کرتے، خود موٹے جھوٹے کم قیمت والے کپڑے استعمال کرتے، غریبوں کو اچھے کپڑے دلواتے۔

مدرسہ عرفانیہ میں پڑھانے کے دوران لباس کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ غریب لڑکوں کے لباس کو دیکھ کر اچھا لباس پہننا اچھا محسوس نہیں ہوتا، اپنے سے سال دو سال بڑے بھائیوں کی خدمت میں لگتے، گھر میں جب عورتیں عید کے بعد دیر سے آتیں تو رات کے کھانے میں عام طور پر کھچڑی تیار کی جاتی تھی جو ماموں جی جعفر تیار کرتے تھے، یا راقم تیار کرتا تھا، پھر راقم کے والد جناب حسن حسنی صاحب جو ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی صاحب کے سب سے بڑے نواسہ تھے اور مولانا حمزہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبد اللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا جعفر حسنی رحمۃ اللہ علیہ اور موجودہ ناظر عام مولانا عمار حسنی مدظلہ العالی اور جب رائے بریلی سے مولانا بلال صاحب آتے اور مولانا محمود حسنی اور مولانا عمیر حسنی صاحب، سب ساتھ بیٹھ کر وہ کھچڑی تناول فرماتے۔ پھر لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی بنا پر اپنی اہلیہ کو انہوں نے رائے بریلی منتقل کر دیا تھا اور ہر جمعرات کو انہوں نے رائے بریلی جانے کا معمول بنایا جس کی وجہ سے ان کی زندگی مسافرانہ ہوگئی، سفر کے دوران مطالعہ کا معمول رہتا، وقت ضائع کرنے سے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بچاتے رہے۔

مدرسہ کے امور پر کبھی کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی، باغات کے امور بھی مولانا حمزہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سپرد کر رکھے تھے، ان کو نہایت تندہی سے وہ انجام دیتے رہے، اس کی وجہ سے دینی امور اور تدریسی امور میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا اور نہ کوتاہی ہوئی، حقوق میں کسی قسم کی کوتاہی کے وہ روادار نہ تھے، ایک ایک پائی کا حساب رکھتے تھے، معاملات میں بڑے اصول پسند تھے، حکومتی ٹیکسوں اور بجلی وغیرہ کے بل کے معاملات میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں رکھتے تھے، ان کے اندر برّ الوالدین کی عظیم صفت بدرجہ اتم موجود تھی اور و کان أبوهما صالحاً کے مستحق نے ان کو اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا، ایک بڑی خصوصیت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے عشق و وارفتگی کا پایا جانا تھا جس نے ان کے اندر ایک الگ شان پیدا کر دی تھی، اور اس معاملہ میں ان کی حساسیت بہت بڑھ گئی تھی اور اس میں وہ کسی طرح کی مداہنت برداشت نہیں کرتے تھے، اسی وجہ سے ایک صاحب جو کسی ملک سے آئے تھے، ندوہ میں آنے سے روک دیا تھا۔

وہ اسلام میں کسی بھی قسم کی کتر بیونت کو برداشت کرنے کے روادار نہیں تھے، وہ اپنے بڑوں اور جمہور کے نقش قدم کو اختیار کرنے کے حامی تھے، وہ رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر کا مصداق بن چکے تھے، لہٰذا اس فانی دنیا کو اللہ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے الوداع کہہ دیا اور انعام کے حصول کے لیے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، رحمه الله رحمة واسعة۔

☆☆☆☆☆

آہ! جعفر بھائی

ڈاکٹر محمد وثیق ندوی☆

۱۴؍رجب ۱۴۴۶ھ مطابق ۱۵؍ جنوری ۲۰۲۵ء کی شام سڑک حادثہ میں جس ''عظیم انسان'' نے ہمیں داغ مفارقت دیا، اس کی جدائی سے ایک جہاں اشکبار ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو؟ وہ میدانِ صحافت کا عظیم شہسوار، علم وادب کا درخشندہ تارہ، دعوت دین کا علمبردار اور فکر اسلامی کی ایک اہم شناخت اور مضبوط ستون تھا، وہ ندوۃ العلماء کا ناظر عام، عربی پندرہ روزہ اخبار ''الرائد'' کا چیف ایڈیٹر، صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی کا نائب اول اور اس کے شعبہ برصغیر کا صدر تھا، ایک ایسا خوشبودار پھول تھا جس کے کھلنے سے گلشن میں آمدِ بہار کی بے شمار توقعات تھیں اور عالم شہود پر جس کا ظہور ہر کوئی دیکھنے لگا تھا؛ لیکن وہ ایک لخت مرجھا گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محسن وکرم فرما، ہمدرد ومہربان رفیق کار، ہم راز وہم سفر، غمگسار وغم خوار، عزیز از جاں محبّ گرامی قدر مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ ہم سے اس وقت جدا ہوگئے جب ندوہ بلکہ ملت کو ان کی سخت ضرورت تھی، وہ ایک کہنہ مشق صاحب قلم تھے جن کی رہنما اور موثر تحریریں زندگی کے ہر گوشے میں رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں، ایک ایسا مثالی انسان جس کو دیکھ کر زندگی کی سمت درست کی جاسکے، مثالی باپ اور مثالی معلم جس کی گواہی ہر متعلم اور طالب علم دے رہا ہے، ایسا آئیڈیل مربی جس کی شہادت آج وہ ہر شخص دے رہا جس نے زندگی میں انہیں قریب سے دیکھا، ایسا ہمدم، ہم راز اور ہمدرد وغمخوار جس کی جدائی ہمیشہ محسوس کی جائے گی اور جس کی مفارقت سے دل آج بھی مغموم ورنجور ہے، خصوصا راقم کو اس کی کمی کا ہر موقع پر احساس ہوگا، گویا ان کا ہر طرز عمل مثالی تھا، عام لوگوں کے ساتھ ہو یا اپنے جاننے والوں کے ساتھ، طلبا کے ساتھ ہو یا اساتذہ کے ساتھ، بڑوں کے ساتھ ہو یا چھوٹوں کے ساتھ، درسی ساتھیوں کے ساتھ ہو یا سینئر دوستوں کے ساتھ، ایک بار ملنے والوں کے ساتھ ہو یا ہمشہ سایہ کی طرح ساتھ رہنے والوں کے ساتھ، منجملہ ہر ایک کے ساتھ ان کا رویہ اور سلوک اس قدر مشفقانہ ہوتا تھا کہ بس جو بھی ملتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ ایسے پاکباز کم ہوتے ہیں، تواضع ایسا مثالی کہ ہر پہلو سے عظیم وبلند ہونے کے باوجود کبھی اس کا اظہار نہیں، نام ونمود اور شہرت سے کوسوں دور، دنیا اور اس کی لذتوں سے بالکل لاتعلق، مجھے تو تقریباً پچیس برسوں کا مشاہدہ اور سفر وحضر کا عملی تجربہ ہے:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

آج سے پچیس سال پہلے راقم کا ان سے تعلق ہوا، جو گزرتے وقت کے ساتھ قریب سے قریب تر اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور اس طویل عرصہ میں میں نے انہیں بڑے بھائی کی طرح ہمدرد وغمگسار، سچا پکا مومن، شرافت کا پیکر، طلبا کے حق میں ایک مہربان اور شفیق استاذ اور وعظ ونصیحت میں سلگتا دل اور دھڑکتا جگر رکھنے والا پایا، وہ ایک ایسے پاکیزہ اور صاف دل کے مالک تھے جہاں نہ تو حسد وعداوت کی گنجائش تھی اور نہ ہی کسی کے ساتھ زیادتی کا امکان تھا، ذاتی مفاد سے بے نیاز، ذاتی اغراض سے بے پرواہ دینداری اور حسن اخلاق کی صفات سے متصف تھا، سادہ دل، سادہ مزاج، تواضع اور انکساری کا پیکر، جو بھی ملا متاثر ہوا، بلکہ اسیر ہوگیا، آج دنیا انھیں جن اوصافِ خیر سے یاد کررہی ہے، ہر ایک کی زبان پر بس ایک ہی بات کہ ''جعفر بھائی'' جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

وہ ایک اسلامی مفکر اور اسلامی ادب کا نقیب تھا تحریریں ہر طرح کے تکلفات سے پاک، اسلامی افکار کی آئینہ دار ہوتی تھیں، ''الرائد'' میں ان کے اداریے اور دیگر تحریریں اس کا واضح ثبوت ہیں جس میں ملت کے تئیں ان کی کڑھن اور بالخصوص عالم اسلام کے مسائل وقضایا پر ان کا اٹھنے والا قلم ان کی تحریروں کو ایک شان امتیازی عطا کرتا ہے، وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے نوجوانوں میں ایک نئی روح، نیا جذبہ، نیا ولولہ اور نیا خون پیدا کرنا چاہتے تھے، یہ باتیں ان کی کتاب "اخی العزیز" میں دیکھنے کو ملتی ہیں، وہ ہمیشہ ''عملی اسلام'' پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے اور تقریر وتحریر سے اس کی دعوت دیتے تھے۔

آہ! اے میرے محبوب، میرے مشفق وکرم فرما ''جعفر بھائی''، آپ نے ہمیں ایک لخت داغ مفارقت دے دیا اور ہمیں غیر متوقع روتا چھوڑ دیا، اس کے باوجود ہم وہی کہتے ہیں جو رب کریم نے حکم دیا کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور جب خدا کا فیصلہ آن پہنچتا ہے تو پھر کسی تقدیم وتاخیر کی

☆استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

گنجائش باقی نہیں رہتی اور رہی موت تو وہ مومن کے لیے محض مکان کی تبدیلی کا نام ہے یہ جدائی وقتی اور عارضی ہے:

موت کو سمجھے ہے غافل اختتام زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

اللہ تعالیٰ نے جعفر بھائی کو حکمت وتدبر، استغناء اور تواضع جیسی ممتاز خوبیوں سے مالا مال کیا تھا، بانیان ندوہ خصوصاً مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے فکر ومنہج پر گامزن تھے اور ندوۃ العلماء کو اصل بنیادوں پر آگے بڑھانے میں بڑے معاون ومددگار تھے۔ذاتی طور پر میرے لیے وہ ایک شفیق بھائی اور ہمدرد وغمخوار رفیق کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی رواں دواں زندگی، دوسروں کے لیے جینے کی ادائیں اور اپنے اسلاف کے کردار کو روشن کرنے کی کوششیں ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی، مرحوم ایک عالم، ادیب، صحافی، مفکر، داعی، خطیب، مصنف، مدرس اور سب سے بڑھ کر ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے، اسلامی اخلاق کردار سے ان کی زندگی روشن تھی، ٹوٹے ہوئے دلوں کو، کمزوروں کو سینے سے لگانا ان کا شیوہ تھا، تواضع، بے نفسی، ان کی خاص ادا تھی، سب کچھ ہوکر انھوں نے اپنے آپ کو کبھی کچھ نہ سمجھا، یہی ان کی وہ بلند صفات اور زندگی کی قدریں تھیں جس نے سب کو رلا دیا، آج ساری دنیا ان کو یاد کررہی ہے۔وہ پچھلے چند برسوں میں جس طرح تیزی کے ساتھ آگے بڑھے، ندوہ کو سنبھالا، بیسیوں اداروں کی سرپرستی کی، امت کی رہنمائی کے لیے اپنی زبان وقلم کو وقف کردیا، بڑی امید تھی مگر:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

وہ ہم سے جسمانی طور پر جدا تو ضرور ہوگئے ہیں لیکن ہمارے دلوں میں زندہ ہیں، ہماری زبانوں پر ان کا ذکر خیر ہے، وہ اپنی پاکیزہ زندگی، پاکیزہ طرز عمل، حسن اخلاق، حسن سلوک اور خیرخواہانہ رویے کی بدولت ہمارے درمیان موجود ہیں، یہی وہ سرمایہ ہے جو انسان کو مابعد الموت بھی زندگی بخشتا ہے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

آنکھیں اشکبار ہیں، آنسو ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتا، دل ہے کہ بس درد کے مارے پھٹا جاتا ہے:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

☆☆☆☆☆

.........بقیہ صفحہ ۹۵ کا

قرآن کی ہمہ گیری، اس کی افادیت اور اہمیت پر ان کی کئی تقاریر موجود ہیں، رمضان المبارک کے مہینہ میں تکیہ رائے بریلی میں ان کا قرآن کا درس بھی ہوتا تھا، جس میں وہاں کے بہت سے لوگ شریک ہوتے اور ان کے نورانی دروس سے اپنے قلب و دماغ کو منور کرتے تھے۔

مولانا کو مبدا فیاض کی طرف سے رواں دواں سیال قلم بھی عطا کیا گیا تھا، آپ کی پرکشش تحریروں کی بدولت آپ کا شمار ممتاز قلم کاروں اور نمایاں صحافیوں میں ہونے لگا تھا۔مجلّہ ’’الرائد‘‘ میں کثرت سے آپ کے ہمہ جہت مضامین شائع ہوتے تھے۔مولانا نے کئی کتابوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی کتاب ’’کاروان زندگی‘‘ کا عربی ترجمہ ’’في مسيرة الحياة‘‘ اسی طرح ’’حضرت شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلوی‘‘ کا عربی ترجمہ ’’المحدث محمد زكريا الكاندهلوي و مآثره العلمية‘‘ مولانا محمد الحسنی ندویؒ کی اردو کتاب ’’سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی‘‘ کا عربی ترجمہ ’’الشيخ محمد يوسف الكاندهلوي حياته و منهجه‘‘ کے نام سے، اسی طرح ان کی تصانیف میں ’’دعوت فکر ونظر‘‘ اردو، ’’أخي العزيز‘‘ اور ’’الخواطر‘‘ عربی میں قابل ذکر ہیں۔

مولانا مرحوم نہایت خلیق وملنسار تھے، ندوۃ العلماء کے عہدۂ نظارت کے باوجود ان کے اندر نہ تکلف کے انداز تھے نہ ہی جاہ ومنصب کی کچھ شان، ملنے والوں سے نہایت خندہ پیشانی اور شگفتہ مزاجی سے پیش آتے تھے، قدرت نے حلم و بردباری، اعتدال وتواضع سے ان کا خمیر تیار کیا تھا۔دین کی اشاعت وتبلیغ میں کوشاں رہتے تھے، یہی ان کی شخصیت کی پہچان تھی اس سے انھوں نے علم وادب کے بڑے حلقے کو متاثر کیا اور عام ملنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا، ان کی دلآویز شخصیت، ان کی زندگی کی خوبصورت یادیں، ان کی علم وفکر پر مشتمل روشن تحریریں اور ان کے اعلیٰ اخلاق کے عمدہ نمونے بطور حوالے اور مثال کے ہمارے درمیان موجود ہیں جن کا زمانہ دراز تک تذکرہ نگار تذکرہ کرتے رہیں گے:

زندگی جن کی گزرتی ہے اجالوں کی طرح
یاد رکھتے ہیں انھیں لوگ مثالوں کی طرح
علم والوں کو کبھی موت نہیں آتی ہے
زندہ رہتے ہیں کتابوں میں حوالوں کی طرح

☆☆☆☆☆

فکر وعمل کے نقیب

ڈاکٹر محمد فرمان ندوی☆

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ فکر وعمل کے داعی اور نقیب تھے، وہ صرف باتوں کے دھنی اور نظریات وافکار کے مبلغ نہیں تھے، بلکہ عملی زندگی کے ذریعہ ان کا نمونہ بھی پیش کرتے تھے، یہ حقیقت ہے کہ قول وعمل کی جامعیت انسان کو بلندی تک پہونچاتی ہے، اوراس کا تضاد انسان کو بے وقعت بنا دیتا ہے۔ مولانا سید جعفر حسنی ندوی دیکھتے تھے کہ معاشرہ میں گفتار کے غازی تو بہت ہیں، لیکن کردار کے غازی کا فقدان ہے، معاشرہ کو اگر بلندیوں تک لے جانا ہے تو ان دونوں صفات کو اپنے اندر منتقل کرنا پڑے گا، تبھی ایک مثالی معاشرہ کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

قول وعمل کی جامعیت کا بہترین امتزاج اور اس کا عملی نمونہ ہمیں سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت، عادات واطوار اسی جامعیت کا عکس جمیل ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے خطبات مدراس میں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کا تذکرہ کیا ہے، وہاں لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو پانچ فرض نمازوں کے بارے میں بتایا؛ لیکن خود آٹھ نمازوں کا اہتمام فرمایا کرتے تھے: فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء، تہجد، اشراق، اوابین، عوام کے سامنے رمضان کے روزے کی اہمیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی؛ لیکن خود ہفتہ کے دو روزے (دوشنبہ اور جمعرات) اور مہینے کے تین روزے (۱۳، ۱۴، ۱۵) کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ اخلاق کے باب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم جامعیت کا حال یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی؛ لیکن آپ نے کبھی مجھ سے اُف تک نہیں کہا، اور کسی کام سے متعلق جس کو میں نے کیا تھا یہ نہیں کہا کہ کیوں کیا، اور کسی کام کے متعلق جس کو نہیں کیا تھا یہ نہیں کہا، کیوں نہیں کیا۔ [صحیح مسلم، کتاب الفضائل: ۲۳۰۹]

اس تناظر میں مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کی یہ تحریر پڑھئے:

''ربیع الأول کے مبارک موقع پر میلاد النبی کی محفلیں سجتی ہیں، خطباء اور واعظین کی پر جوش اور ولولہ انگیز تقریریں ہوتی ہیں، نعتیہ مشاعروں کا اہتمام ہوتا ہے، اور پوری رات یہ سلسلہ جاری رہ کر صبح کی اذان پر اختتام کو پہونچتا ہے، لیکن پوری رات جاگ کر جب لوگ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں تو وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ حضور کی گھریلو اور سماجی زندگی کیسی تھی، وہ معراج کا واقعہ بیان کرسکتے ہیں، غزوۂ اُحد کی تفصیلات آپ کے سامنے رکھ سکتے ہیں، آپ کے معجزات پر روشنی ڈال سکتے ہیں، غار حراء میں آپ کی عبادت کی منظر کشی کرسکتے ہیں، مکہ سے مدینہ منورہ کی ہجرت کی روداد بیان کرسکتے ہیں، مدینہ میں ہونے والے آپ کے استقبال کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں، لیکن آپ کی گھریلو اور سماجی زندگی کے بارے میں وہ بالکل لاعلم اور خاموش نظر آتے ہیں، حالانکہ سیرت پاک کا وہ پہلو جو گھریلو اور سماجی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، انسانی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، عبادات کے معاملہ میں سیرت یقیناً ہماری پوری رہنمائی کرتی ہے، بلکہ عبادت کو قابل قبول بنانے میں سیرت کا بنیادی کردار ہے''۔ [دعوت فکر ونظر: ص ۱۷]

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی نے خطابت وتقریر کا عمل جاری نہیں رکھا، وہ تدریسی عمل میں پوری زندگی مشغول رہے، لیکن جب وہ اس میدان میں آئے تو انہوں نے اس میں اپنے جوہر دکھائے، یہاں تک اہل علم کو اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑا، انہوں نے انتقال سے پہلے ایک جلسہ میں مقرر کی تین صفات کی طرف اشارہ کیا تھا: ۱- سنجیدہ اسلوب میں بات کہی جائے، کیونکہ گھن گرج کے ساتھ کی گئی باتوں کا اثر نہیں ہوتا ہے، وہ صرف واہ واہ کی نظر ہو جاتی ہے، ۲- دوسرے یہ کہ ایک خطیب کے لیے ضروری ہے کہ اس کے قول وعمل میں جامعیت ہو، وہ جو کہتا ہو، اس پر عمل بھی کرتا ہو، ۳- تیسرے یہ کہ وہ ہر بات کو تحقیق واستناد کے ساتھ کہے، بے بنیاد قصوں اور واقعات سے اپنی تقریر کو مزین نہ کرے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کے اصلاحی مضامین میں ایک مضمون ''نسخہ معاشرہ کی اصلاح کا'' ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''طبیب اچھے سے اچھا نسخہ لکھ دے، عطار اچھی سی اچھی دوا بنا دے، نسخہ ہماری جیب میں سوتے میں، جگتے میں رہے، تصور میں سفوف بھی ہم پھانکتے رہیں اور دوا کا شربت دن رات آنکھوں

☆ استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

سے اپنی پیٹتے بھی رہیں تو کیا ہماری بیماری دور ہو جائے گی؟ مرض سے کیا ہم کو افاقہ ہو جائے گا؟ چلئے، حکیم حاذق کا تجویز کردہ اور کسی پرانے عطار کا تیار کردہ یہ نسخہ سوتے میں نہیں، جگتے میں، تصور میں نہیں، حقیقت میں، آنکھوں سے نہیں منھ سے، ہم اپنے نہیں دوسروں کے پیٹ میں پہونچاتے رہیں تو کیا اس طرح ہمارا مرض دور ہو جائے گا، اور یہ کیا نسخہ ہمارے لئے کارگر ثابت ہوگا، نسخہ تو ہم رکھتے ہیں، لیکن استعمال اس کا دوسروں پر کرتے ہیں، سلام کرے تو دوسرا، رحم کرے تو دوسرا، عیادت کرے تو دوسرا، معاف کرے تو دوسرا، خدمت کرے تو دوسرا''۔[دعوت فکر ونظر:ص۱۰۵]

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی عظیم اسلامی اسکالر و مفکر مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کی نرینہ اولاد تھے، اور عربی مثل مشہور ہے: الولد سرّ لأبيه (لڑکا باپ کے نقش قدم پر ہوتا ہے) تو مولانا نے بھی انہی خطوط ونقوش کو اختیار کیا، جن کو ان کے والد مرحوم نے اختیار کیا تھا، اسلامی تاریخ، یورپین تاریخ، قرون وسطی کے حالات، اقوام وملل کے نشیب وفراز، معاصر تحریکات، تخریب کار نظریات، الحادی سوچ وفکر، مثبت زاویہ نگاہ، حقائق کی روشنی میں تجزیہ، جذباتیت سے دور، عقل وقلب کو متاثر کرنے والا اسلوب۔ یہ وہ مختلف الجہات امور ہیں، جو انسان کو فکر ونظر کی وادی میں سلامتی کے ساتھ سفر کی ضمانت دیتے ہیں، مولانا کے فکری پہلو کا قابل ذکر امر یہ ہے کہ انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں فکر اسلامی کی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، وہ طلباء کے درمیان اس موضوع پر محاضرات دیا کرتے تھے اور طلباء ان سے حالات حاضرہ اور اس کے پس منظر سے واقف ہوتے تھے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی نے اس پہلو پر توجہ دی، سب سے پہلے ان کے قلم سے ''دعوت فکر و نظر'' کے نام سے ایک کتاب ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کو دار الرشید لکھنؤ نے شائع کیا ہے، اور بقول حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی: ''پیش نظر کتاب ''دعوت فکر ونظر'' ان مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں مسلمانوں کی پستی وانتشار، اخلاقی وسماجی بگاڑ اور اسلام دشمن طاقتوں کی مخفی سازشوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں اچھی واقفیت اور نشاندہی سے کام لیا گیا ہے''۔

اس کتاب کے نمایاں مضامین میں ایک ملاقات جرمن نومسلم مراد ہوف مین سے ہے، مراد ہوف مین ایک جرمن دانشور ہیں، جو ڈپلومیٹ تھے، اور ۳۳ سال سے اس پیشہ وابستہ رہے، وہ ناٹو کے میڈیا ایڈوائزر رہے، انہوں نے ۱۹۸۰ء میں اسلام قبول کیا، اور آپ کی زندگی کا مقصد اسلام کی درست تصویر پیش کرنا ہے، جو میڈیا، فلم، سیریل اور لٹریچر کے ذریعہ مسلسل بگاڑی جارہی ہے، اور اس کے پرکشش چہرہ، دلکش نقوش اور دلفریب خدوخال پر آڑھے ترچھے برش چلا کر اس کو کچھ اس طرح بدنما، بلکہ ڈراؤنا بنانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اچھا بھلا آدمی بھی اب اس سے ڈرنے لگا ہے۔ مراد ہوف مین کہتے ہیں کہ یورپ ابھی تک صلیبی جنگوں کے تصورات سے آزاد نہیں ہوسکا ہے، مسلمانوں کے بارے میں کیتھولک چرچوں کا منفی رویہ ابھی تک برقرار ہے، مغربی میڈیا کے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے، ایسی صورت میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مقامی باشندوں کے خوف اور اندیشوں کو دور کرنے کی کوشش کریں،

اور اپنے طرز عمل سے ثابت کریں کہ ہمارا مذہب، اور ہماری تہذیب ان کے لیے، ان کے ملک کے لیے، اور ان کی آنے والی نسلوں کے لیے اپنے اندر صرف اچھائیاں ہی اچھائیاں لیے ہوئے ہے اور اس کے لیے ہم کو اخبار ریڈیو، انٹرنیٹ، اور دوسرے ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے''۔[دعوت فکر ونظر:ص۶۲]

ایک مفکر جہاں واقعات کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے، وہیں دوسری طرف تجزیہ نگاری اور نتیجہ خیزی بھی اس کا حصہ ہوتی ہے، وہ معاصر نظریات اور افکار کو دیکھ کر نئی جہات دریافت کرتا ہے، حکیم لقمان کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے جب احمقوں کو احمقانہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو اپنے آپ کو ان سے بچایا، پھر ایک زمانہ میں ان کو حکیم ودانا کے خطاب سے نوازا گیا، دعوت فکر ونظر میں ایک مضمون ''مہذب قوم کی غیر مہذب باتیں''۔ ۱۱۸۰ صفحات پر مشتمل ایک کتاب ہے، نام: شہاب نامہ ہے، مصنف اس کے قدرت اللہ شہاب ہیں، کتاب دلچسپ بھی ہے، اور پر از معلومات بھی، واقعات اتنے عجیب کہ عقل حیران رہ جائے، اسلوب اتنا دلکش کہ ختم کئے بغیر چین نہ آئے،''[دعوت فکر ونظر:ص ۱۸۱] پھر جو انہوں نے مغربی تہذیب کی جو قلعی کھولی اور اس کے قابل اعتراض پہلو کو طشت از بام کیا ہے کہ جو لوگ مغربی تہذیب کو من وعن قبول کرتے ہیں۔

مولانا سید جعفر حسنی ندوی کی ایک کتاب خواطر کے نام سے ہے، وہ ان کے افتتاحیات کا مجموعہ ہے، اس کا مقدمہ شیخ حسن امرانی صدر رابطہ ادب اسلامی نے لکھا ہے،..................

......................بقیہ صفحہ ۱۰۸ ر پر

برسے بغیر ہی جو گھٹا گھر کے کھل گئی

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی☆

یہ دنیا ایک سرائے ہے، یہاں روز نہ جانے کتنے لوگ آتے ہیں، ٹھہرتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں، سرائے سے جانے کے بعد وہ "نسیاً منسیاً" ہوجاتے ہیں، کوئی انھیں یاد نہیں رکھتا؛ لیکن کچھ مسافر ایسے ہوتے ہیں جو سرائے کے ہر فرد؛ بل کہ وہاں آنے جانے والے ملاقاتیوں تک کے دل ونگاہ میں بس جاتے ہیں، ان کے ہیولے اور چہرے بشرے ابھر ابھر کر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں، اپنے آنے اور چلے جانے کا وہ برسہا برس تک احساس دلاتے رہتے ہیں اور بہ زبان شاعر کہتے رہتے ہیں:

اب کے بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ بھی انھیں لوگوں میں تھے جنھوں نے جاتے جاتے ایسے نقوش اپنے پیچھے چھوڑے ہیں کہ اہل تعلق ان کو بھلا نہیں پارہے ہیں، ان کے اس طرح اچانک راہیٔ ملکِ عدم ہوجانے کی وجہ سے چمن کی بہار لٹ گئی ہے، دلوں کا قرار چھن گیا ہے، جس نے بھی ان کے جانے کی خبر سنی، اس کا دل دھک سے رہ گیا:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

یہ بات اٹل اور محکم ہے کہ جو بھی اس جہانِ آب وگل میں آیا ہے، وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے نہیں آیا، انبیاء کرام آئے، ایک وقت معین تک رہے پھر چلے گئے، اولیائے عظام آئے، ایک مدت کے بعد انھیں بھی رختِ سفر باندھنا پڑا، علماء آئے، اپنی تقدیر کا کام سرانجام دیا، پھر عازم ملک عدم ہوئے، بادشاہ آئے، حکومتوں کو تاراج بھی کیا، لوگوں کو غلام بھی بنایا، کچھ ایسے بھی بادشاہ آئے جو اچھے بھی تھے، جن کی مثال آج بھی دنیا دے رہی ہے، سبھوں نے اپنے اپنے خوانِ نصیبہ کے حصہ سے استفادہ کیا؛ لیکن پھر انھیں بھی کجاوہ کسنا پڑا اور یہاں سے جانا پڑا، امراء آئے، جانا انھیں بھی پڑا، زمین دار آئے؛ لیکن ایک وقت کے بعد وہ بھی اسی زمین میں رَل مَل گئے، مفکرین وفلاسفر آئے، اپنی فکر اور اپنا فلسفہ تو چھوڑ گئے؛ لیکن خود چلے گئے، دلوں کو اپنی طرف کھینچ لینے والے اہل قلم، خطباء وشعراء آئے؛ لیکن ان کی زندگی کا آخری ورق بھی پلٹا اور کتابِ زندگی بند کرکے رکھ دی گئی، موت سے کسی کو مفر نہیں، "کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ".

مولانا جعفر صاحب ویسے تو کئی دہائیوں سے درس وتدریس کے میدان کے فارس رہے ہیں؛ لیکن ان کا جوہر اصلی آخری چند سالوں میں کھل کر لوگوں کے سامنے آیا؛ بل کہ صحیح بات یہ ہے کہ ابھی آہی رہا تھا، لوگ ان کے اندر ان کے والد محترم کی شان دیکھ رہے تھے، لوگ ان کے اندر ان کے تایا اور سسر کی جھلک پارہے تھے، امید تھی کہ جانشینی کا حق ادا کریں گے؛ لیکن افسوس! قزاقِ اجل نے انھیں ہم سے لوٹ لیا۔

مولانا نہایت سادگی پسند، کم گو، خلیق وطلیق انسان تھے، بے پہچانے لوگوں سے بھی ایسے ملتے جیسے برسوں سے جان پہچان ہو، ان کے اندر ایک دھڑکتا؛ بل کہ پھڑکتا دل تھا جو امت کی خانماں بربادی پر اشک بہاتا تھا، ایک موقع سے وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار پر اپنے اشک ریز قلم سے رقم طراز ہیں:

"ہندوستان کی صورت حال کچھ اور خطرناک ہے، یہاں مسلمانوں میں علاقائیت تو نہیں؛ لیکن مسلک اور برادری کی بنیاد پر عصبیت شدت اختیار کرتی جارہی ہے اور بعض شہروں میں تو صورت حال اتنی بگڑ چکی ہے کہ دوسرے مسلک یا دوسری برادری کا آدمی کسی دوسرے مسلک یا برادری کی مسجد میں نماز تک نہیں پڑھ سکتا ہے؛ بل کہ بعض مسجدوں میں یہاں تک لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس مسجد میں فلاں فلاں کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں اور غلطی سے اس مسجد کو خدا کا گھر سمجھ کر کوئی نماز کے لیے چلا جاتا ہے تو اس کو زدوکوب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خدا کے گھر میں خدا کی بندگی پر یہ درگت؟ حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ اسی مسلکی تشدد اور برادری کی بنیاد پر اسی عصبیت نے اس ملک میں مسلمانوں کی وہ حیثیت کردی ہے جو موسم خزاں میں کسی سوکھے پتے کی ہوتی ہے کہ نہ اس کے اڑنے کا کسی پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ اس کے گرنے کا؛ لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ہر شخص اپنی ایک اینٹ کی مسجد کو ہی صرف مسجد سمجھتا ہے؛ کیوں کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کا وہی متولی ہوتا ہے، وہی امام ہوتا ہے، وہی مؤذن ہوتا ہے اور وہی مقتدی۔ یہی سوچ تعلیمی اداروں میں کام کررہی ہے، یہی تربیت گاہوں میں کام کررہی ہے، یہی خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں کام کررہی ہے اور یہی چیریٹیبل تنظیموں اور ایجوکیشنل سوسائٹیوں میں کام کررہی ہے، پہلے دوسرے کے کام کی نفی ہے، پھر اپنے کام کام کا اثبات ہے، تو کیا

☆استاد جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک

اس سلبی ذہن اور تخریبی سوچ کے ساتھ کوئی قوم ترقی کرسکتی ہے؟ کیا ایسی بکھری ہوئی اقلیت کسی یونائٹ اکثریت کا مقابلہ کرسکتی ہے؟''
(دعوتِ فکر ونظر،ص:۶۴-۶۵)

یہ ایک اقتباس ان کی فکر، ان کی سوچ، ان کی کڑھن، ان کے دلِ دردمند اور ان کی زبان ہوش مند کو واشگاف کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس ایک اقتباس میں قلم کی روانی بھی ہے،فکر کی جولانی بھی ہے اور درد وکسک کی طغیانی بھی۔ اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے باپ کے بیٹے ہیں، اپنے ہی خاندان کے چشم وچراغ ہیں،حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اپنے خاندانی روایات واقدار کے امین وجانشین تھے۔

عالمی حالات اور عالمی میڈیا پر مولانا کی گہری نظر تھی،قوموں کے مابین جو نفاق وشقاق پایا جاتا ہے، ایک موقع سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج دنیا میں جو بگاڑ ہے، فساد ہے، لوٹ مار ہے، دہشت گردی اور تشدد پسندی ہے، کشیدگی اور فرقہ واریت ہے،خوں ریزی وخوں آشامی ہے، بدگمانی وبے اعتمادی ہے،تہمت والزام تراشی ہے، سچ کو جھوٹ قرار دینا اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا ہے، اجالے کو اندھیرا اور اندھیرے کو اجالا بتانا ہے، صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح قرار دینا ہے، یہ سب اسی فاسقانہ صفات کے حامل میڈیا پر آنکھیں بند کرکے یقین کرنے کا نتیجہ ہے۔'' (دعوتِ فکر ونظر،ص:۶۷)

مولانا کا قلم بہت رواں تھا،اردو میں بھی اور عربی میں بھی، الرائد کا ''براعم الایمان'' کسے یاد نہیں؟ پھر والد صاحب کی وفات کے بعد جو اداریئے لکھے وہ بھی بین دلیل ہیں۔ اردو تحریر اگر دیکھنی ہو تو ''دعوتِ فکر ونظر'' کا مطالعہ کافی ہے۔ موقع کی مناسبت سے قلم کے تعلق سے ان کا ایک اقتباس نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ذرا سوچیے! قلم کا ذکر کب ہوا؟ اس وقت جب پہلی وحی کا نزول ہوا، جب آسمان سے زمین کو ایک پیغام ملا، جب فخر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو پروردگار عالم کی جانب سے حکم ہوا:''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ،خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ،اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ،الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ،عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ'' [العلق:۱-۵] (پڑھیے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے تخلیق فرمائی، انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا، پڑھیے اور آپ کا رب (کریم) خوب نوازنے والا اور کرم فرمانے والا ہے، جس نے قلم کو ذریعہ تعلیم بنایا اور انسان کو ان (تمام) چیزوں کا علم عطا کیا جن سے وہ ناواقف تھا۔) افسوس کہ قلم کی اس اہمیت کو ہم نے نظر انداز کر دیا اور اپنے کو صرف درس وتدریس اور وعظ وتقریر کے دائرہ میں محدود کردیا، کمرہ سے ہال اور ہال سے پنڈال، بس اس کو ہم نے اپنی دنیا سمجھ لیا، اس طرح ہتھیار رکھتے ہوئے بھی ہم بے ہتھیار ہوگئے اور ہمارے اسی ہتھیار کو ہمارے ہی دشمن نے ہمارے ہی خلاف بڑی ذہانت، بڑی خوبصورتی اور بڑی منصوبہ بندی سے استعمال کیا...... ہمیں ہوش اس وقت آیا جب بہت کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور ترقی پسند ادب کے پجاریوں، لادینی ادب کے علم برداروں، جنسی ادب کے پروردہ لوگوں اور مغربی تہذیب کے حامل نام نہاد مسلم دانشوروں کی پوری ایک ٹیم تیار ہوچکی تھی، اب ہماری اولاد ہی ہمارے خلاف کھڑی تھی، گھر کی اینٹ سے اینٹ بجانے کو تیار تھی، اس کے اندر بغاوت تھی، سرکشی تھی، آنکھوں میں بے اطمینانی اور دلوں میں بے یقینی تھی، اس کو شک تھا اپنی روایات پر، اس کو شبہ تھا اپنی قدروں پر، اس کو شرم آتی تھی اپنی تہذیب وثقافت پر، اس کے نزدیک فرسودہ ہوچکی تھیں وہ سب باتیں جو منبر ومحراب سے کی جاتی ہیں اور آؤٹ آف ڈیٹ ہوچکی تھیں وہ صدائیں جو مدرسوں اور خانقاہوں سے لگائی جاتی ہیں۔ یہ تھا نتیجہ قلم سے بے اعتنائی کا، خدا کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت کی ناقدری کا، قلم تو ہمارے ہاتھ سے گیا ہی؛ لیکن وہ اپنے ساتھ ہماری دنیا بھی لے گیا اور ہماری آخرت بھی، وہ ہمارے نوجوانوں کو لے گیا جو ہمارے دست وبازو تھے، وہ دماغ لے گیا جو ہم کو ترقی کے بام عروج تک پہنچا سکتے تھے، وہ باصلاحیت افراد لے گیا جو اس وقت کی متمدن اور ترقی یافتہ قوموں کی حاشیہ برداری سے ہمیں آزاد کرا سکتے تھے، وہ تعلیم یافتہ اولاد لے گیا جو ہمارے لیے صدقہ جاریہ بن کر قبر کی تاریکیوں میں اپنے نیک عمل سے اجالا کرسکتی تھی، ہم نے اپنے دشمن کو صرف قلم ہی نہیں دیا؛ بل کہ سارا سرمایہ دشمن کے حوالہ کردیا، ہم نے اس کو دل بھی دیا اور دماغ بھی، اب جسم تو ہمارا ہے؛ لیکن دل ودماغ اس کا اور یہی کہا تھا ایک مغربی مفکر نے کہ ہم اپنی تحریروں سے مسلمانوں کی ایک ایسی نسل تیار کردیں گے جن کے جسم تو ضرور ان کے ہوں گے؛ لیکن دل ودماغ ہمارے ہوں گے۔'' (دعوتِ فکر ونظر،ص:۸-۹)

ان اقتباسات سے مولانا کی اٹھان کا ہم اندازہ لگا سکتے ہیں، ابھی ہم لوگوں نے ان سے خاطر خواہ فائدہ بھی نہیں اٹھایا تھا، ابھی ہم ان کے رہوار اشہب قلم کا مزہ ہی چکھ سکے تھے، ابھی ہم نے ان کی فکر رسا کا ذائقہ ہی چکھا تھا، ابھی تو سحابِ ممطر کی مانند ہمارے سروں پر سایہ فگن ہی ہوئے تھے؛ لیکن برسے بغیر ہی یہ گھٹا گھر کے کھل گئی، ان سے ہماری امیدیں ابھی جلیل تھیں؛ لیکن افسوس! ہاتف غیب نے انھیں قلیل کردیا؛ بل کہ منقطع ہی کردیا اور یہ تو تقدیری امر ہے، جس پر بادلِ ناخواستہ بھی ہمیں راضی رہنا ہے۔

☆☆☆☆☆

علمی وفکری روایت کے امین

عبدالرشید راجستھانی ندوی☆

ہر عہد میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا وجود محض کسی ادارے یا جماعت کے لیے نہیں، بلکہ ایک علمی وفکری تسلسل کے لیے لازم ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی علم، حکمت، اخلاق اور بصیرت کی علامت ہوتی ہے، اور ان کا فقدان پورے معاشرے کے لیے ایک بڑا خلا پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ بھی ایسی ہی ایک علمی شخصیت تھے، جو ندوۃ العلماء کی علمی روایت کے امین، اس کے فکری سرمائے کے محافظ، اور اس کی تعلیمی ودعوتی مزاج کے بہترین ترجمان تھے۔

وہ نہ صرف یہ کہ ایک کامیاب مدرس اور حکیم مربی تھے، بلکہ وہ ایک سنجیدہ مفکر، متوازن مزاج ادیب، شائستہ اور کہنہ مشق صحافی، ندوہ کے منتظمین میں ایک اہم ستون، اور اسلامی ادب وصحافت کے ایک نمایاں نمائندہ تھے۔ ان کی وفات ایک بڑا علمی نقصان ہے۔

علمی روایت اور فکری استقامت

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ علمی مدارج تک ندوۃ العلماء کے فکری وعلمی ماحول میں پرورش پائی۔ وہ اسی علمی روایت کے امین تھے، جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الحسنی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہم اللہ جیسے اکابر نے پروان چڑھائی تھی۔

ان کی علمی زندگی میں مطالعہ اور تحقیق کا ایک خاص مزاج تھا۔ وہ ندوہ کے مخصوص علمی منہج سے گہرائی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے اور اس کی فکری اساس کو مضبوطی سے تھامے رہے۔ وہ امت کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے، اور ان کے علمی و فکری تجزیے ہمیشہ متوازن، حقیقت پسندانہ اور حکمت وبصیرت سے بھرپور ہوتے تھے۔

ان کی تحریریں محض معلوماتی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ ایک فکری رہنمائی فراہم کرتی تھیں۔ وہ ندوہ کے مخصوص طرزِ نگارش کے امین تھے، جو سنجیدگی، وقار، اور زبان وبیان کی فصاحت کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی کا حامل ہوتا ہے۔ ان کی عربی اور اردو تحریریں اپنے اسلوب اور تعبیر کے لحاظ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھیں، جن میں نہ سطحیت تھی، نہ لفاظی، بلکہ ایک فکری گہرائی اور استدلال کی روشنی نظر آتی تھی۔

ادب و صحافت میں سنجیدگی اور متانت

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ نے اسلامی ادب اور صحافت میں بھی ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ ''رابطہ ادب اسلامی'' سے وابستہ رہے اور اس کے ذریعے اسلامی ادب کی فکری سمت متعین کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا۔ ان کے نزدیک ادب محض جمالیاتی اظہار یا فنی مہارت کا نام نہیں تھا، بلکہ وہ اسے امت کے فکری اور تہذیبی احیاء کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔

وہ ایک ماہر صحافی بھی تھے، خصوصاً ''الرائد'' میں ان کے اداریے علمی سنجیدگی، حالاتِ حاضرہ کی بصیرت، اور امت کے مسائل پر ایک گہری فکر کے مظہر تھے۔ ان کے اداریے محض جذباتی اپیل یا وقتی جوش پر مبنی نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ ایک حکیمانہ انداز میں امت کو درپیش چیلنجز اور ان کے ممکنہ حل کی طرف توجہ دلاتے تھے۔

ان کی تحریریں توازن، اعتدال، اور بصیرت کا نمونہ ہوتی تھیں، وہ حالات کو سمجھنے اور ان پر ایک حکیمانہ تبصرہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے اسلوب میں سادگی، شستگی، اور ایک خاص وقار ہوتا تھا، جو سنجیدہ علمی شخصیات کی پہچان ہے۔

بصیرت افروز خطابت اور حکیمانہ نظم و نسق

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ تدریس، تحریر اور تنظیمی امور کے ساتھ ساتھ ایک بہترین خطیب بھی تھے۔ ان کی خطابت محض جوشیلی تقریر کا نام نہیں تھی، بلکہ وہ دلیل، استدلال، اور سنجیدہ علمی تجزیے کے ساتھ سامعین کو قائل کرنے کا ہنر رکھتے تھے۔ وہ چیخ وپکار اور سطحی جذباتیت سے گریز کرتے تھے، اور ان کا خطاب ہمیشہ ایک فکری رہنمائی فراہم کرتا تھا۔

وہ ندوۃ العلماء کے علمی و تنظیمی امور میں بھی متحرک رہے اور ایک سنجیدہ منتظم کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ ان کا اندازِ قیادت ہمیشہ مشورے، حکمت، اور تحمل پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ مشکل حالات میں بھی تدبر اور حکمتِ عملی کے ساتھ مسائل کا حل تلاش کرتے اور جذباتی فیصلوں سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔

حسنِ اخلاق، تواضع اور شرافت

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ کی

☆ استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کا حسنِ اخلاق تھا۔ وہ سراپا خیر خواہی، محبت، اور شفقت کا پیکر تھے۔ علم وفضل کے بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود وہ انتہائی متواضع تھے۔ ان کی طبیعت میں انکساری تھی، وہ بڑے چھوٹے سب کے ساتھ یکساں شفقت اور عزت واحترام کا معاملہ کرتے تھے۔

جو بھی ان کے پاس آتا، وہ خندہ پیشانی سے پیش آتے، اس کی بات غور سے سنتے اور حتی المقدور اس کی مدد کی کوشش کرتے۔

طلبہ کے ساتھ ان کا معاملہ سراسر شفقت اور خیر خواہی پر مبنی ہوتا۔ وہ ان کی علمی وفکری تربیت کے ساتھ ان کی اخلاقی اصلاح کی بھی فکر رکھتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھنے والے طلبہ کو نہ صرف علم حاصل ہوتا بلکہ انہیں اخلاق، بردباری، اور وقار کا عملی سبق بھی ملتا۔ ان کی شرافت اور خوش اخلاقی صرف اپنے حلقے تک محدود نہیں تھی بلکہ عوام کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ سراسر خیر خواہی اور اخلاص کا نمونہ تھا۔ وہ لوگوں کے مسائل میں ان کے ساتھ شریک رہتے، ان کے کام آتے، اور ہر ممکن مدد کرتے۔ وہ ایک مربی، ایک عالم، ایک منتظم اور ایک رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاقی اوصاف کے حامل ایک مثالی انسان بھی تھے۔

آج جب علمی دنیا میں سطحیت، بے سمتی اور فکری انتشار کے سائے گہرے ہو رہے ہیں، ایسے میں مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ جیسے اہلِ علم کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ان کی زندگی ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ حقیقی علمی ورثہ محض معلومات کا ذخیرہ نہیں، بلکہ ایک فکر، ایک نظریہ، اور ایک طرزِ عمل ہوتا ہے، جسے آنے والی نسلوں تک پہنچانا ہر صاحبِ علم کی ذمہ داری ہے۔

ان کی وفات کے بعد یہ سوال ہمارے سامنے ہے کہ ہم ان کے علمی وفکری سرمایہ کو کس طرح زندہ رکھ سکتے ہیں؟ ان کی تحریریں، ان کے افکار، ان کا تعلیمی و اصلاحی اسلوب، اور ان کی حکمت و بصیرت پر مبنی طرزِ تدریس —— یہ سب چیزیں ان کے بعد بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں، بشرطیکہ ہم ان سے صحیح استفادہ کریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا مرحوم کو اپنے شایانِ شان جزا دے، ان کی خدمات کو قبول فرمائے، اور ہمیں ان کے علمی ورثے کو سنبھالنے اور اس سے رہنمائی لینے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

.........بقیہ صفحہ ۱۰۴ کا

اس میں مولانا نے خالص فکری موضوعات کو چھیڑا ہے، مولانا نے جون ۲۰۲۱ء کے شمارے میں قضیہ فلسطین پر لکھا ہے، موجودہ حالات میں جبکہ طوفان الأقصی پندرہ مہینوں سے جاری ہے، ۱۹۴۸ء سے اسرائیل کا وجود عالم اسلام اور خاص طور پر عالم عربی کے لیے ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے، مولانا نے اس مسئلہ کے حل میں دوٹوک بات کہی ہے، انہوں نے اپنے فکری اداریے کا موضوع بنایا ہے: ما أخذ بالقوة لا يؤخذ الا بالقوة (جو چیز طاقت کے زور پر چھینی جاتی ہے، وہ اسی طرح واپس بھی لی جاسکتی ہے) ایک دوسرے مضمون کا عنوان ہے: أسخف خرافة رددها الناس في التاريخ نہایت ہی احمقانہ بات جس کو لوگ دہرا رہے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔

شیخ حسن امرانی نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ شیخ جعفر اپنے مضامین میں سرسری باتیں نہیں ذکر کرتے ہیں، بلکہ دلائل و براہین کی روشنی میں بات کہتے ہیں، وہ دلائل قرآن وحدیث کے بھی ہوتے ہیں، اور تاریخی بھی ہوتے ہیں، اور غیر مسلم حضرات کے اعتراف کی شکل میں ہوتے ہیں، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ ابو الحسن کی روح ان کے اندر سرایت کرگئی ہے۔

قول وعمل کی جامعیت اور اس کے اثرات کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی لکھتے ہیں: ''مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے، کشمیر میں ان میں اللہ کا ایک بندہ سید علی ہمدانی پہنچا اور سارا کشمیر مسلمان ہو گیا، اسی طرح بنگال ہے، خاص طور پر مشرقی بنگال سارا کا سارا صوفیائے کرام کے حساب میں ہے''۔ مولانا جعفر حسنی ندوی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: یہی ہمارا پیغام ہے، اور یہی ہماری دعوت، اجتماعیت پیدا کریں، جذباتیت سے پرہیز کریں، عبادات کے موقع پر نیتیں درست رکھیں، معاملات کو شریعت کے تابع کریں، اخلاق کو نبوی اخلاق کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں، یہی ہمارا سب سے مؤثر ہتھیار اور یہی ہماری سب سے مضبوط ڈھال ہے''۔ [ص ۱۳۸]

غرض مولانا سید جعفر مسعود ندویؒ نے قول و عمل کی جامعیت میں قابل قدر نقوش چھوڑے ہیں، ضرورت ہے کہ ہم ان نقوش سے واقف ہوں اور نئی نسلوں تک ان کو پہونچائیں، تاکہ ان کو فکری شعور بیدار رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اور ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور خیر کا ذریعہ بنائے۔

☆☆☆☆☆

علم وعمل کے حسین پیکر - استاذ ومربی

محمد کلام الدین ندوی☆

سادات خانوادۂ حسنی کے چشم وچراغ ، معروف علمی، فکری، دینی، دعوی، فکری، تعلیمی و تربیتی ادارہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظر عام، ملت کے مایۂ ناز، محبوب وعظیم فرد جنرل سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ کی اچانک رحلت ایک ایسا حادثہ ہے کہ اس نے ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا مگر واقعہ یہ ہے کہ: "اِنَّ لِلّٰہِ مَا أَخَذَ وَلَہٗ مَا أَعْطٰی وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِأَجَلٍ مُّسَمًّی فَاصْبِرُوْا وَاحْتَسِبُ"، اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ، اہل ندوہ اور ندوۃ العلماء سے متعلق ادارے خاص کر پورے خاندان و اہل خانہ و پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے ، اور مرحوم کا بہترین نعم البدل عطا فرمائے ، آمین۔

حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ مشہور سادات علمی خانوادۂ حسنی میں ۱۳؍ستمبر ۱۹۶۰ء کو ایک چھوٹے سے قصبہ تکیہ کلاں (رائے بریلی، اتر پردیش) میں پیدا ہوئے ، ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن اپنے وطن تکیہ کلاں میں حاصل کی، مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا اور اپنے بزرگوں کی تربیت کے سایہ میں رہ کر علوم شرعیہ کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی ، ندوۃ العلماء سے سن ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت سے فراغت حاصل کی، ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان ادب میں ایم .اے. پاس کیا ، ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب کی مشہور معروف دانش گاہ 'جامعة الملك سعود' کے زیر اہتمام ٹیچرز ٹریننگ کا کورس مکمل کیا، اور عربی زبان وادب میں ماہر ہو گئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء کی مشہور شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ چوک لکھنؤ میں بڑی سنجیدگی ومتانت کے ساتھ اپنی تدریسی خدمات کا آغاز کیا اور تقریباً ۳۵؍سال خدمت انجام دی، مولانا مرحوم راقم الحروف کے مخلص استاذ بھی رہے، مولانا مرحوم سے چھ سال کی مدت میں متعدد کتابیں مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں پڑھیں ، اس دوران علمی استفادہ حاصل کرنے کا اچھا موقع ملا ، تدریس وتفہیم کا انداز سلیس اور بڑا ہی نرالا ہوتا، ایک بار کتاب سے ترجمہ کراتے پھر سرسری خلاصہ بیان فرماتے ، جس سے طلباء اچھی طرح مفہوم سمجھ لیتے ، مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں تقریباً ۶۲؍ساٹھ سال کی عمر تک دینی، علمی، تدریسی خدمات انجام دیں، مولاناؒ کو عربی زبان و ادب پر بڑی دست رس حاصل تھی ، درس وتدریس کے دوران عربی زبان میں معیاری مضمون نگاری کے ساتھ کئی کتابوں کا اردو سے عربی میں ترجمہ بھی کیا ہے، ان کی کتابوں میں "فی مسيرة الحياة" (کاروان زندگی کا عربی ترجمہ)، "الشيخ محمد يوسف الكاندهلوی حياته ومنهجه في الدعوة" (مولانا محمد الحسنیؒ کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)، "الامام المحدث محمد زكريا الكاندهلوی ومآثره العلمية" (حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)" دعوة للتأمل والتفكير"، (دعوت فکر ونظر)، "بصائر" (حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ) شامل ہیں، اس کے ساتھ ساتھ پوری زندگی اپنے بزرگوں کی رہنمائی اور نقش قدم پر چل کر گزار دی، والد ماجد حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد پندرہ روزہ عربی جریدہ "الرائد" کے مدیر ہوئے اور بڑی مہارت ولیاقت کے ساتھ عربی مضامین اور اداریے تحریر کرتے رہے۔

استاذ محترم حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے مارچ ۲۰۲۳ء میں تدریسی خدمت سے سبکدوش ہوئے ، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کی مجلس نظامت نے مولاناؒ کو ناظر عام کے عہدہ پر فائز کیا، اور درس وتدریس کی بھی ذمہ داری بھی دی، اسی کے ساتھ اتفاق رائے سے 'رابطہ ادب اسلامی' (شعبۂ برصغیر وممالک مشرقیہ) کے صدر، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے سکریٹری اور مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء کے صدر کے عہدوں پر فائز ہوئے، اس کے علاوہ کئی اداروں ، سوسائٹیوں کے سرپرست بھی اور بہتیرے مدارس ومکاتب کے ذمہ دار بنائے گئے۔

مولانا مرحوم ندوۃ العلماء میں گلاب کے پھول کی طرح پوری طرح کھل چکے تھے ، طلباء اپنی تعلیم و تعلم اور مختلف سرگرمیوں میں منہمک، اساتذہ درس وتدریس اور مختلف ذمہ داریوں میں سرگرم، کارکنان اپنے مختلف امور اور ملازمین اپنی ذمہ داریاں انجام دینے میں منہمک تھے، ان سب کو مولاناؒ کی ذات

☆معاون انچارج مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ

سے فیض پہنچ رہا تھا، سبھی حضرات مولاناؒ کی سرپرستی سے نہایت خوش تھے، مولانا مرحوم نے دوسال کے اندر ندوہ کے تمام شعبوں کو متحرک اور فعال بنانے میں پوری توجہ صرف کی، جملہ شعبوں میں ملازمین و کارکنان پر مشفقانہ نظر ہوتی، بلا معاوضہ آپ نے ندوہ کی خدمت کی، اور اپنے عہد کے تعمیری کاموں کو حسن انتظام کے ساتھ انجام دلانے میں اپنی خدمات پیش کیں؛ ندوۃ العلماء کے کسی بھی شعبہ میں اچانک پہنچ جاتے اور پوری جانکاری حاصل کرتے؛ لیکن افسوس ہے کہ خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ اچانک ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئے، وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، مخلص ذمہ دار اور مشفق استاذ ہونے کی حیثیت سے رہ رہ کر ان کی یاد آرہی ہے اور آتی رہے گی، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، اتنی ہمہ جہت صفات وخصوصیات کے حامل عالم دین کی جدائی بلاشبہ ندوۃ العلماء، مدارس اسلامیہ ومکاتیب دینیہ، فلاحی ادارے، سوسائٹیوں اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کے لیے بہت بڑا اور ناقابل فراموش خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ اس نیک انسان کا بہترین بدل عطا فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ ایک مقبول استاذ، قابل تقلید ادیب وصحافی، اعلیٰ منتظم، ماں باپ کے اکلوتے فرزند اور خانوادۂ حسنی کے ایک عظیم فرد تھے، ان کے والد ماجد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) اور سابق سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اپنے عہد کے نامور ادیب وصحافی، ممتاز قلم کار، کامیاب استاذ ومربی، علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کے ماہر، جنہوں نے اپنی زندگی میں بڑی دینی علمی تدریسی وتصنیفی خدمات انجام دیں، پوری زندگی اپنے خال معظم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو آئیڈیل بنا کر گزار دی، ٹھیک اسی طرز پر حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ اپنے خاندان کے بزرگوں بالخصوص اپنے چچا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ، والد محترم حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے مشورہ ورہنمائی، تربیت وتوجہ سے خوب خوب دینی، علمی، تعلیمی وتربیتی استفادہ کیا اور لکھنا پڑھنا سیکھا، علوم اسلامی کے ساتھ عربی زبان وادب میں بھی مہارت پیدا کی، آپ کا اصل موضوع تفسیر و ادب اور فکر اسلامی تھا، اب تک بے شمار ادبی فکری وتاریخی مقالات ومضامین سپرد قلم کر چکے۔ مولانا مرحوم تدریسی زندگی میں پروگرام اور اسٹیج سے اکثر بیشتر دور رہتے؛ لیکن جب ندوۃ العلماء کی ذمہ داری دی گئی اور ان کو مختلف پروگراموں میں دعوت دی جانے لگی، اور تقریر وبیان کا ان کو موقع ملا تو انہوں نے اپنے علم وفکر سے سب کو متاثر کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے انداز میں تسلسل کے ساتھ تقریر کرتے اور کرتے ہی چلے جاتے ایسا لگتا کہ بہت پرانے مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے بہت جلد بولنے کا بہترین ملکہ عطا فرما دیا تھا۔

استاذ محترم حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ علم وادب کے گوہر آبدار تھے، قلم وقرطاس کے شہسوار تھے، لکھنا پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، وہ راہ علم کے ایسے مسافر تھے جو تکان وآرام سے ناآشنا تھے، فکر ابوالحسن کے امین تھے، سادگی کی اعلیٰ مثال تھے، مولانا عربی زبان وادب کے ممتاز صاحب قلم، انشاء پرداز، بیباک خطیب، انتہائی خوش مزاج، معاملہ فہم انسان تھے، زہد وتقویٰ اور خاص کر عربی زبان وادب میں اپنے والد مرحوم کے حقیقی وارث تھے، آپ بڑے ہی بااخلاق، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کرنے والے رحم دل انسان تھے، آپ کا طرز زندگی بہت سادہ، قلم توانا، طرز نگارش صاف، شستہ وشگفتہ تھا، خشیت الٰہی، عشق رسول ﷺ، محبت صحابہؓ، تواضع، سادگی، اخلاص، نام ونمود سے اجتناب اور اشاعت علم کا نمونہ تھے، اپنی تنخواہ کا ایک خاص حصہ غریبوں، یتیموں، بیواؤں، ضرورت مندوں پر خرچ کرنے والے انسان تھے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، ان کی سادگی کی مثال یہ تھی کہ وہ اتنی اہم ذمہ داری کے عہدے پر رہتے ہوئے بھی ندوہ یا خاتون منزل، رائے بریلی کوئی ملنے جاتا تھا تو اسے وقت دیتے اور اس کی خاطر تواضع کرتے تھے، ان کا حادثۂ وفات محض ان کے اہل خانہ کا حادثہ نہیں؛ بلکہ علم وادب کی دنیا کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، ان کی وفات کی شکل میں قوم و ملت نے ایک ایماندار اور قوم کا ہمدرد مخلص انسان کھو دیا ہے۔

حضرت مولانا سید حمزہ حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد مولاناؒ کو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا سکریٹری مقرر کیا گیا، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پر مولاناؒ کی بڑی توجہ تھی، ہمیشہ مجلس کی مطبوعات کی فکر کرتے، نظم ونسق کے لیے توجہ دلاتے، جب کوئی مہمان کہیں سے آتے تو جو کتاب عطیہ دینا مفید ہوتا، اس کتاب کے لیے فون کرتے، کبھی کبھی اچانک مہمان کو لے کر مجلس تحقیقات تشریف لاتے، مجلس کی مطبوعات دکھاتے اور کتابوں کا تعارف کراتے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے نظم ونسق میں مولانا مرحوم کا بڑا اہم رول رہا، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول کرے اور انہیں اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

بچھڑا کچھ اس ادا سے............

ارشاد علی افریقہ☆

قال تعالیٰ: "أو آوي إلى ركن شديد".

سیدنا لوط علیہ السلام کا یہ جملہ توکل علی اللہ کے منافی نہیں ہے؛ بلکہ ظاہری اسباب کے مطابق ہے، مخدومی و مرشدی حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کا دست و بازو مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ، کئی کتابوں کے مصنف، کئی اداروں کے ذمہ دار و سرپرست، مدیر ''الرائد'' حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ایک حادثہ میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہوئے راہی جنت ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، مولانا عبدالقادر جیلانی شاہ بندری بھٹکلی، مولانا عبدالصمد قاضی ندوی مرحوم، مولانا عبدالباری فکردے ندوی بھٹکلی، مولانا حشمت اللہ ندوی کے رفیق درس مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مختصر سفر کے دوران آخرت کے سفر پر چل بسے۔

سچی بات تو یہ ہے جس نے بھی خبر سنی ہکا بکا رہ گیا اور جس نے سنا وہ انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد کرتے دیکھا سنا گیا، اجل موعود کو کو ٹالنے لایستاخرون ساعة و لا يستقدمون کی پیشگی اطلاع الکتاب المبین کے ذریعہ بتائی جاچکی ہے، اس حادثہ موت نے جہاں پورے حسنی خانوادہ کو رلا دیا، وہیں مولانا مرحوم کے لواحقین، متعلقین، متنسبین کو رلایا ہے۔

بالخصوص ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مرشدی ومخدومی حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کے لیے دو اعتبار سے تکلیف دہ حادثہ ہے، ایک خانوادۂ حسنی کی حیثیت، دوسرے ناظر عام جو ایک مضبوط بازو دست راست کی حیثیت سے تھا، بندہ کا گمان ہے مولانا مرحوم کو جب ناظر عام نظامت کمیٹی یعنی مجلس عاملہ نے منتخب کیا ہوگا تو اس انتخاب سے ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو بہت خوشی ہوئی ہوگی اور ہونی بھی چاہیے تھی، چونکہ آپسی تبادلہ خیال کے لیے فکری دعوتی علمی خاندانی ہم آہنگی ہونا بہت ضروری ہوتی ہے مگر کسی پتہ تھا یہ رکن شدید اتنی جلد بچھڑ جائے گا۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ کے سڑک حادثہ میں وفات کی خبر سن کر کانوں نے باور نہیں کیا مگر وقت گزرتے خبر صاعقہ کی تصدیق ہوئی، طالب علمی کے دور میں بڑوں سے سنا تھا وہ بات یاد آگئی جب مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم تھے، اس وقت آپ کے دو بازو تھے: ایک کتاب و قلم کے ماہر و دھنی داعی الی اللہ حضرت مولانا سید محمد الحسنی رحمہ اللہ، دوسرے دعوت و عزیمت کے سپاہی حضرت مولانا اسحاق جلیس ندوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ دونوں مفکر اسلام ہی کی حین حیات میں وفات پائی جس سے حضرت مولانا بہت افسردہ ہوئے تھے، حضرت مولانا مفکر اسلام کو ظاہری و باطنی اعتبار سے بڑا خسارہ ہوا اور مدتوں اس حادثہ سے متاثر نظر آتے تھے مگر رب تعالیٰ نے ان کے بعد دو اور مضبوط بازو مولانا معین اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کی شکل میں نوازا تھا۔

اب جو رکن شدید ورجل رشید چل بسے ہیں، خانوادۂ حسنی کے لیے ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مرشدی ومخدومی حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کے لیے یقیناً اسباب کے درجہ میں یقیناً جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہوگا، رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ رب ذوالجلال مخدومی حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی خانوادۂ حسنی کو اہل ندوہ و منتسبین ندوہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور جو رکن شدید اجل موعود کے تحت راہی جنت ہوئے ہیں، ندوہ وملت کو خلف رشید سے نوازے اور مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے، اعلیٰ علیین کے زمرے میں شامل فرمائے۔

ارکان اسلام کی پیروی و پابندی فرائض منصبی میں شامل ہیں؛ لیکن ایک مرد مومن کی پہچان اس کا روشن مستقبل اس کے ذاتی اخلاق و کردار ہوتے ہیں، اس کی معاشرتی علمی دعوتی زندگی ہوتی ہے، اس ناحیہ سے مولانا مرحوم کو اپنی مادی آنکھوں نے جو دور سے قریب سے دیکھا ہے، سنا ہے، ان صفات سے مولانا مرحوم صد فیصد متصف پایا اور یہ بات جگ ظاہر ہے۔ حضرات سادات کی حیثیت سے جو خوبیاں ہونی چاہیے تھیں، آنکھوں نے دیکھا ہے تواضع وانکساری، مہمان نوازی، عہدہ ومنصب سے دوری بنائے رکھنا، وقت شناسی، مردم شناسی، امانت داری، دیانت داری، سچائی، علم وحکمت، علم و کتاب سے گہرا تعلق یہ سب باتیں مرحوم کی زندگی کا خاصہ اور آئینہ دار تھیں۔

آخری بات مولانا مرحوم اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے بڑے ابا سرپرست خسر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ علیہ کے ہر اعتبار سے خلف رشید تھے، رب تعالیٰ ان سب کی تربتوں کو تر وتازہ رکھے، جنت الفردوس میں حضرت سیدنا محمد صلی اللہ

☆ حال مقیم دبئی

علیہ وسلم کی رفاقت نصیب فرمائے اور ملت کو ان نعم البدل نصیب فرمائے، آمین۔

مولانا عبدالسلام خطیب بھٹکلی ندوی استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ناظر عام بننے کے بعد شخصی زندگی میں نیز طلبہ واساتذہ سے متعلقین کا آپ سے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک دوسال سے ہمارے ناظر عام صاحب جس طرح اہل ندوۃ کے دلوں میں رچ بس گئے تھے جس طرح سے ندوہ کا علمی، ادبی، دعوتی اور اصلاحی پیغام بڑی سادگی اور پورے اعتدال وتوازن کے ساتھ ملک و بیرون ملک عام کر رہے تھے اور جس محبت اپنائیت اور تواضع و سادگی کے ساتھ طلبہ و اساتذہ سے ملاقاتیں کررہے تھے اور مل رہے تھے ،اس سے ندوہ کے طلبہ، اساتذہ اور پورا اسٹاف بہت خوش اور مطمئن تھا، ہر ایک ان سے ملنے اور مصافحہ کرنے کی خواہش کرتا، ان کے دروس و پروگرام میں حاضر رہتا، اپنے ہاسٹل کے افتتاحی واختتامی اور تقسیم انعامات کے پروگراموں میں شرکت اور اس کی صدارت کی آپ سے درخواست کرتا، اس وقت بھی مختلف ہاسٹلس کے پروگرام میں شرکت اور اس کی صدارت آپ کے ذمہ تھی، طلبہ اپنے مسائل لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ فوراً اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے؛ کتنے غریب اور غیر مستطیع طلبہ کی طعام فیس معاف کردی؛ بہت سے طلبہ جو داخلے کے موقع پر آسانی سے داخلہ منظور ہونے کی فکر میں مستطیع کی حیثیت سے داخلہ فارم پُر کرتے لیکن داخلہ کے بعد ان کے لیے طعام فیس کا جمع کرنا مشکل ہوجاتا تو وہ طلبہ ناظر عام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اپنے مالی وسائل کی کمی اور گھریلو حالات کے ناگفتہ بہ ہونے کی درخواست دیتے تو آپ ان کو غیر مستطیع کی سہولت سے نوازتے، بعض طلبہ کے تعلق سے معلوم ہوا کہ دار العلوم کے بعض ضوابط کی بناء پر ان کو کچھ رقم دفتر مالیات میں جمع کروا کر رسید دفتر اہتمام یا تعلیمات میں پیش کرنی تھی تو انھوں نے ناظر عام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس ضابطہ سے اپنے معاملہ کو مستثنیٰ کرانے کی درخواست کی تو ناظر عام صاحب نے فرمایا کہ ضابطہ تو وہی رہے گا؛ البتہ آپ کی فیس کی رقم میں اپنی طرف سے ادا کروں گا، پتہ نہیں ندوہ کے طلبہ کو مولانا سے ان دوسال بلکہ اس سے بھی کم مدت والی نظارت عامہ کی ذمہ داری کے باوجود کیا والہانہ تعلق قائم ہوگیا تھا جیسے ہی حادثۂ وفات کی اطلاع ملی تو طلبہ ٹھنڈک اور امتحانِ سالانہ کے بالکل قریب ہونے کے باوجود مولانا کی آخری زیارت اور نماز جنازہ میں شرکت کی نیت سے جوق در جوق قافلہ در قافلہ جیسے موقع ملا رائے بریلی کے لیے رات ہی سے روانہ ہونا شروع ہوئے، ہمارے بھٹکل کے طلبہ نے تو ایک پوری بس ہی بک کرلی تھی جس پر وہ فجر کی نماز پڑھتے ہی روانہ ہوگئے"۔

میرے خیال میں حسنی خاندان کے کسی فرد کے جنازے میں ندوہ کے طلبہ کی اتنی بڑی تعداد تکیہ حاضر نہیں ہوئی ہوگی جتنی ہمارے ناظر عام مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ کے جنازے میں شریک ہوئے ہوں، اس طرح سے پورا ندوہ ہی اُمڈ پڑا، ندوہ کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے مدارس ملحقہ کے طلبہ و اساتذہ عوام و خواص کا مجمع قابل رشک رہا۔

جہاں تک مولانا جعفر مسعود حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات کی بات ہے بندہ کا موصوف سے ذاتی روابط تو خاص نہیں رہے؛ البتہ حضرات سادات سے دلی تعلق ومحبت رہی ہے اور رہے گی، مولانا مرحوم بھی اس ضمن میں شامل ہیں ویسے بھی حسنی برادران سے تعلقات کا سلسلہ حضرت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی نسبتوں سے قائم ہوئی بہت بلند اور نہایت ہی شریف النفس والنسب علماء سے کچھ سیکھنے پڑھنے کا موقع میسر ہوا۔

میرے مخلص مولانا عبدالسلام خطیب ندوی زید مجدہم سے معلوم ہوا رواق سید محمد مونگیری رحمۃ اللہ میں جمعیۃ الاصلاح کے قیام کا عمل آپ کی توجہات کا بڑا دخل ہے، مولانا لکھتے ہیں:

ہمارے ناظر عام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رواق مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ میں جمعیۃ الاصلاح کا نظام قائم فرمایا، اس کے لیے ہر طرح کی سہولیات فراہم کی تاکہ طلبہ کی تحریری وتقریری صلاحیتیں نکھر سکے اور طلباء رواق مونگیری جمعیۃ الاصلاح کے اس نظام سے فائدہ اٹھا کر اپنے اندر کے دعوتی واصلاحی مزاج کو فروغ دے سکیں، ان شاء اللہ آپ کی سعی مشکور آپ کے میزان حسنات میں اضافہ کا باعث ہوگا"۔

ندوہ کے نئے طالب علم محمد رفاعہ منکوی آپ کے مفکرانہ دروس کا ذکر خیر کرتے ہوئے اپنے تاثرات لکھتے ہیں:

ندوہ آنے کے بعد اگر کسی چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے تو وہ مولانا مرحوم کے فکرِ اسلامی کے دروس ہیں، مولانا کے ایک درس سے وہ موتی ہاتھ آتے تھے جو بلا مبالغہ سینکڑوں صفحات کی ورق گردانی سے حاصل ہونا مشکل ہے۔ مولانا کی ایک طرف تاریخ پر وسیع وعمیق نظر تھی تو دوسری طرف تاریخی واقعات سے عبرت آموز نکات اخذ کرنے کا ملکہ بھی تھا، نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر بھی تھی اور صحیح تجزیہ کار بھی تھے، ایک طرف کسی اہم مسئلے کی سنگینی کو

جانتے تھے تو دوسری طرف اُن مسائل کے اسباب بھی بیان کرتے اور حل بھی پیش کرتے تھے“۔

مولانا جعفر مسعود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ندوہ کے ناظر عام کے عہدے پر فائز رہنے کی قلیل مدت یعنی دو تین سال کا عرصہ رہا، اس مختصر سی مدت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے خوب کام لیا۔ آپ نے اس مختصر مدت میں ہندو بیرون ہند دورہ کیا بالخصوص خلیج عرب کا دورہ بہت مفید رہا، اس دورہ میں حجاز مقدس میں حاضری اور عمرہ روضہ رسول اللہ پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی بہر حال جہاں کہیں قیام رہا وہاں آپ نے دعوتی اصلاحی و تربیتی خطابات و محاضرات سے وہاں کے عوام و خواص علمائے کرام اور پڑھے لکھے مثقف طبقے کو مستفید کیا، اس ضمن میں متحدہ عرب امارات دبئ آمد پر مولانا موصوف سے ملاقات ہوئی، بھٹکل مسلم جماعت دبئ کے ذمہ داران کے اصرار پر اراکین انتظامیہ وممبران سے ملاقات اور آپ کے ساتھ کچھ اوقات گزارنے آپ کے پند ونصائح سے مستفید ہونے کا سنہرا موقع ملا، کس کو پتہ تھا کہ مولانا سے یہ آخری ملاقات ہوگی اور آپ اس دار فانی سے یکلخت جدا ہوں گے، کسی کے وہم وگماں میں نہیں تھا گرچہ موت کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے، وہ کسی کو بتا کر نہیں، قل الروح من امر ربی کے تحت حضرت ملک الموت اپنا کام دے جاتے ہیں اور انسان کف افسوس ملتا ہی رہتا ہے، کاش ہم فلاں سے ملاقات کرتے، فلاں سے بات کر لیتے وغیرہ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا سید جعفر مسعود حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے، ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کا نعم البدل نصیب فرمائے، آمین یارب العالمین۔

☆☆☆☆☆

کامیاب منتظم وصالح عالم دین

محمد ابو عامر ندوی☆

مولانا جعفر مسعود حسنی مرحوم کا نام راقم سطور کے کانوں میں جب پڑا، اس وقت وہ معہد دارالعلوم میں درجہ ہفتم یا ہشتم کا طالب علم تھا، یہ عنفوان شباب کا دور تھا اور اس وقت فطری طور پر انسان کی طبیعت تعلیم کے ساتھ کھیل کود کی طرف بھی کسی نہ کسی درجہ مائل رہتی ہے، مادرِ علمی میں اس وقت تعلیم وتربیت اور علمی ذوق کے ساتھ کرکٹ کھیل کا بھی شوق طلباء میں تھا اور مولانا اس وقت کسی بڑے درجے میں زیر تعلیم تھے؛ لیکن مولانا کرکٹ بھی اچھا کھیلتے تھے۔

سابق ناظر عام مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی مرحوم کے دور میں گاہے بگاہے مرحوم و مشفق استاذ اور درجہ تخصص فی الادب میں علمی ذوق اور خاص کر ادب عربی وصحافت کی طرف توجہ دلانے والے مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کے دفتر میں مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ سے ملاقات ہوجاتی تھی؛ لیکن مختصر طور پر، مولانا موصوف مسکرا کر ملتے اور مصافحہ کرتے، ان کے کریمانہ اخلاق کی وجہ سے فطری طور پر دل میں ان کی قدر ومحبت جاگزیں ہونے لگی، اس ناچیز کے علم میں عصر حاضر کے فارغین اور علماء کے درمیان ان کی امتیازی صفت ان کی حد درجے سادگی اور منکسر المزاجی تھی جس کا گواہ یہ راقم سطور خود ہے، اس کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک عالمی ادارہ ندوۃ العلماء کے ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہونے کے باوجود خندہ پیشانی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب جو کہ مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ مرحوم کے قدیم شناسا تھے، امین آباد سے مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ مرحوم سے ملاقات کے لئے ان کے دفتر تشریف لائے، مولانا مرحوم ان کے استقبال میں اٹھ کھڑے ہوگئے اور ناظر عام کی کرسی پر نہ بیٹھ کر مہمان کے بغل کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

مولانا ایک کامیاب مدرس بھی تھے اور ایک کامیاب منتظم بھی۔ ابھی ماضی قریب ہی میں شعبۂ مدارس ملحقہ ندوۃ العلماء جس کا کارکن راقم سطور بھی ہے، اس کا ایک سالانہ تربیتی جلسہ ۱۶/۱۷ اکتوبر ۲۰۲۴ء کو حضرت ناظم صاحب مدظلہ کی صدارت میں منعقد ہوا، اس جلسے کو مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی مرحوم نے بھی خطاب کیا تھا، خود احتسابی پر ایسا برملا اور بے لاگ خطاب شاذ ونادر سننے کا اتفاق ہوا، مولانا مرحوم کے دل میں ندوۃ العلماء کی ترقی وترویج کے لیے فکرمندی کوئی وقتی چیز نہ تھی؛ بلکہ یہ فکر ان کا ہمہ وقتی مشغلہ تھا اور اس معاملہ میں وہ اسلاف ندوہ کے سچے وارث تھے۔

مدارس کے تعلیمی نصاب پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وقت وحالات کے پیش نظر ان کی نگاہ بہت دوررس تھی جس کی زندہ مثال ملحقہ مدارس کے تعلق سے مولانا کے بعض اہم اقدامات تھے، ان کا ایک وصف جو ان کی زندگی میں لوگوں سے مخفی رہا اور انتقال کے بعد عیاں ہوا، وہ خدا کے بندوں کی حاجت روائی اور ان سے محبت تھی؛ بلکہ اسی فکر اور کوشش میں انھوں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، اگر زندگی وفا کرتی تو ادارہ کو اور بندگان خدا کو ان سے بڑا فیض حاصل ہوتا؛ لیکن ہر انسان کا وقت موعود اللہ کے اختیار میں ہے، تقدیر کا یہی فیصلہ تھا: و کان أمر اللہ قدراً مقدوراً۔

☆☆☆☆☆

☆ معاون انچارج شعبۂ ملحقہ مدارس، ندوۃ العلماء لکھنؤ

چند باتیں چند یادیں

طلحہ بن ابوسلمہ ندوی☆

افسوس کہ ندوہ کا ایک تابندہ ستارہ ۱۵/جنوری ۲۰۲۵ کو رائے بریلی میں جاں بحق ہوگیا اور ندوہ سوگوار ہوگیا؛ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عالم اسلام سوگ میں ڈوب گیا، میری مراد ناظر ندوہ حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی ہیں، ایک تیز رفتار گاڑی نے مولانا کو ٹکر ماری اور مولانا نے جان جانِ آفرین کے سپرد کردی، ادھر ندوے نے دو تین سالوں میں بری بڑی شخصیت کو کھویا کہ جس کا بدل ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، حضرت مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی یکے بعد دیگرے اللہ کے پیارے ہوگئے۔

مولانا سے میری زیادہ دید و شنید نہیں تھی؛ لیکن مولانا حمزہ صاحب کے انتقال کے بعد ندوہ کے ناظر عام ہوئے تو قربت اور تعلق میں بھی اضافہ ہوا۔

آپ نے اپنی عملی زندگی کی شروعات ندوہ کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے کی۔ آپ کے ذمے عربی ادب و دیگر فنون کی کتابیں تھیں۔ مدرسہ عرفانیہ میں تقریباً تیس سال سے زائد عرصہ گزارا۔ آپ نے ۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی ڈگری لی۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی کیا، اس کے بعد پھر شاہ سعود یونیورسٹی میں تدریب المعلمین کا کورس پورا کیا۔

جب مولانا حمزہ ندوی صاحب کا انتقال ہوا تو مجلس شوریٰ نے اتفاق رائے سے ان کو ناظر عام کی حیثیت سے منتخب کرلیا، ناظر عام بننے کے بعد ان کے جوہر کھلے اور کئی اداروں کے سرپرست بنائے گئے اور اس کی ذمہ داری کما حقہ پورا کیا۔

ندوہ کا ترجمان پندرہ روزہ ''الرائد'' عربی کے چیف ایڈیٹر رہے اور ''الرائد'' کی پوری ذمہ داری نبھائی، ''الرائد'' عربی کا وہ رسالہ ہے جو ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے مضامین عرب کے اخباروں میں بھی نقل ہوتے ہیں۔ عربی داں حضرات اس رسالہ کو بہت ذوق وشوق سے پڑھتے اور آنے والے رسالہ کا شدت سے منتظر ہوتے ہیں۔ آپ عالم اسلام میں بھی مقبول رہے۔ عالم اسلام کی سب سے بڑی تنظیم رابطہ ادب اسلامی مشرقی ایشیا کے صدر بنائے گئے اور اس کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا۔ ابھی گذشتہ سال ۲۰۲۴ء کے نومبر میں رابطہ ادب اسلامی کا بین الاقوامی سیمینار کیا جس میں عرب کے فضلاء اور علماء کی شرکت ہوئی اور مقالے پڑھے گئے، سیمینار بہت کامیاب رہا اور مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کو سیمینار کامیاب ہونے پر مبارکباد دی، مولانا بہترین ادیب اور قلم کار ہونے کے علاوہ بہترین مترجم بھی تھے، انہوں نے بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جس میں چند یہ ہیں: ۱- ''فی مسیرۃ الحیاۃ'' (حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''کاروان زندگی'' کا ترجمہ ہے)، ۲- ''الشیخ محمد یوسف الکاندھلوی''، ۳- ''الامام المحدث زکریا الکاندھلوی'' (حضرت مولانا علی میاں ندوی کی اردو کتاب کا ترجمہ)، ۴- ''بصائر'' (حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی اردو کتاب کا ترجمہ)۔

مولانا مرحوم نے خود بھی کئی کتابیں لکھیں، اس کے علاوہ ''الرائد'' کے اداریے اور مضامین بھی شامل ہیں۔ گذشتہ ۲۹/جون ۲۰۲۴ کو حضرت مولانا بلال حسنی ندوی اور حضرت مولانا جعفر صاحب بھی کلکتہ آئے تھے۔ دونوں حضرات سے کلکتہ کے تاجر حاجی جمیل کے دردولت پر ملاقات ہوئی تھی، یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

مرشد الامۃ حضرۃ الاستاذ مولانا رابع حسنی ندوی کے انتقال پر ایک ضخیم اور معیاری مضامین سے پُر ایک شاندار نمبر ''الرائد'' کا شائع کیا تو مجھے بھی ایک جلد بذریعہ رجسٹری ڈاک بھیجی اور رائے لکھنے کی بھی توجہ دلائی۔ یہ ان کے اوصاف اور اخلاق کا عمدہ نمونہ ہے۔

ندوہ کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جو ندوہ کی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔ وہ حضرت مولانا حمزہ حسنی ندوی مرحوم کے صحیح جانشین تھے۔ وہ حضرت حمزہ کے چھوڑے ہوئے کاموں کو بھی انجام دے رہے تھے کہ وقت مدعو آ پہنچا۔

میرے پاس حضرت مولانا ابوالحسن حسنی ندوی، حضرت استاذ مولانا رابع حسنی ندوی اور حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندوی کے پچپاس ساٹھ خطوط تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میرے پاس ان سب کے خطوط ہیں تو خطوط بھیجنے کی فرمائش کی اور یہ بھی تاکید کی کہ زیروکس کاپی بھیجیں، اصل خط نہیں، یہ علم نہیں ہے کہ خطوط کا کام آگے بڑھایا نہیں۔

ان کے انتقال سے ندوہ میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے، خبر ملی کہ مولانا عمار حسنی ندوی کو کو ناظر عام بالاتفاق منتخب کرلیا گیا۔ الحمدللہ

دعا گو ہوں کہ مولانا کے ناگہانی حادثہ فاجعہ سے مولانا کے اہل خانہ عزیز واقارب اور اہالیانِ ندوہ کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

☆ کولکاتا، مغربی بنگال

اک شمع تھی دلیل سحر، سو خموش ہے

ڈاکٹر محمد اعظم ندوی☆

زندگی ایک بہتا دریا ہے، یہ اپنی کشتی کے سواروں کو لے کر آگے بڑھتا جاتا ہے، کچھ لوگ وقت کے دھارے میں بہہ جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہزار موجوں کی کشاکش کے باوجود اپنے عزم وحوصلے سے دریا عبور کرتے ہیں اور ساحل مراد تک پہنچتے ہیں، جو طمانچے موج کے کھاتے ہیں، وہی گہر بن کر نکلتے ہیں، اپنے نقوش سے راستوں کو روشن کرتے ہیں اور اپنی بصیرت سے آنے والی نسلوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ مولانا جعفر مسعود ندویؒ انہی حوصلہ منداور دوراندیش لوگوں میں تھے، ان چراغوں میں تھے جو بجھ کر بھی اپنی یادوں کے اجالے چھوڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مال واولاد کو دنیوی زندگی کی زینت اور رونق قرار دیا ہے، وہ ان سے بھی سرفراز تھے، لیکن "الباقیات الصالحات" (باقی رہ جانے والی نیکیاں) رب کریم کے پاس ثواب کے اعتبار سے زیادہ بہتر اور اُمید لگائے جانے کے اعتبار سے زیادہ اچھی ہیں اور وہ انہی امیدوں کے ساتھ پروردگار کے حضور حاضر ہوگئے، حیات جاودانی کی خاطر، باغ بہشت جیسی جزا پانے کے لیے، نوروسرور اور حور وقصور سے سرفراز ہونے کے لیے، "لِتَبْلُغُوْا أَشُدَّكُمْ" کے بعد اور "أَرْذَلَ الْعُمُرِ" سے پہلے، "وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى" کے مطابق اور اس طرح حیات فانی کو الوداع کہا جیسے اپنے بہت سے غریب الدیار دوستوں اور شاگردوں کو یہ کہہ گئے ہوں کہ:

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ہم نے اپنے بچپن سے ہی مولانا کو دیکھا تھا، شروع میں اکثر، پھر کبھی کبھی، مولانا مرنجاں مرنج معلوم ہوتے تھے، بے تکلف اور بے غرض، صاحب زادگی ان میں نام کو نہ تھی، مجلس آرائی سے دور تھے، کھلے ملے انسان، ذاتی وجاہت، شہرت، جاہ وحشم اور مال ومنال سے بے نیاز، "المؤمن غرٌّ كريم" (مؤمن بھولا بھالا اور شریف ہوتا ہے) کا مجسم پیکر، تکیہ کلاں سے میدان پور خراماں آتے جاتے ہوئے ہمیشہ دیکھتے تھے، نہ ان کو سلام وقیام کا منتظر دیکھا، نہ ہٹو بچو کا آرزومند، بس سب سے جدا، سب کے رفیق، قسامِ ازل کی فیاضی سے مولانا کو طبیعت کی وہ لطافت اور موزونیت نصیب ہوئی تھی جو کم ہی کسی کے حصہ میں آتی ہے، وہ علم کی بارش میں بھیگے ہوئے تھے، فکر کی وسعتوں میں پرواز کرتے تھے، خامہ وجامہ اور گفت وشنید میں جمال و اعتدال کا امتزاج رکھتے تھے، ان کی تحریریں ان کے ذاتی تخیل کا ثمر اور ذاتی فکر کا ماحصل ہوتی تھیں، مگر ان تخیلات کی جولانیاں بے سمت نہ تھیں، سلیمان وبو الحسن، محمد الحسنی ومحمد الرابع، واضح رشید اور اعظمی سعید کے نقوش وخطوط کی پابند، وہ سخن سازی کے اسیر نہ تھے، وہ خواہ مخواہ کی طوالت اور بناوٹ سے بے زار تھے، ان کے یہاں ہر لفظ سوچا سمجھا، ہر جملہ نپا تلا اور ہر خیال نکھرا ہوا ہوتا تھا، وہ جانتے تھے کہ وقت ایک بہتا دریا ہے اور انسان اس میں ایک پتوار کی مانند ہے جو اپنی قوت اور مہارت سے اپنی سمت متعین کرتا ہے اور یہی انہوں نے کیا۔

مدرسہ عالیہ عرفانیہ لکھنؤ میں عمر عزیز کا بیشتر حصہ ایک بافیض استاذ کی حیثیت سے گزارا، بے شمار شاگرد تیار کیے، جن میں اپنے علمی ذوق کے اثرات منتقل کیے اور ان کو باکمال بنانے میں ہمیشہ اپنا کردار ادا کرتے رہے، جب ندوۃ العلماء سے منسلک ہوئے، خواہ وہ الرائد کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوں یا ناظر عام کی حیثیت سے یا مجلس تحقیقات کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے، ان کو "سریر آرائے سلطنت" ہونے کا خبط نہ تھا اور نہ "جہاں پناہ" بننے کا مرض، خادمانہ آئے، فیاضانہ رہے اور بے اختیارانہ چلے گئے، ندوہ جوار بابِ علم و ادب کا گلستاں اور مہبط انوار عرفاں ہے، وہاں وہ نہ صرف ایک ذمہ دار، بلکہ ایک مربی اور ایک رہنما کی حیثیت سے خدمت انجام دی، بڑوں کے سامنے جھک کر، ہم عصروں اور ہم صفیروں کو گلے لگا کر، چھوٹوں کو اپنا بنا کر؛ اسی لیے ہیروں کے مینا بازار میں ایک گوہر آب دار بن کر چمکے۔ مولانا کمال اختر ندوی صاحب مشیر ناظر عام ان کے دست راست تھے اور وہ حضرت مولانا بلال حسنی ندوی صاحب کے ہم راز ومحرم اسرار، بارہا ان دونوں بزرگوں کی زبان سے ان کے حسن سیرت اور بلند اخلاق کی تعریف سنی، فیاضی، خاطر مدارات اور صدقہ و خیرات میں اپنی مثال آپ تھے، دوستوں کے لیے سراپا اخلاص اور یاروں کے یار تھے، جن کی صحبت وفا، مروّت اور خلوص سے معمور رہتی۔

ان کی منکسر المزاجی اور سادگی مشہور تھی، میں

☆استاد المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد

نے ندوہ کے ایک اسٹیج پر دیکھا،ایک بزرگ استاذ کا عصا گرا جارہا تھا،کئی بار اس کو ایستادہ کیا،جب کامیاب نہ ہوئے تو دیر تک اس کو سہارا دیئے بیٹھے رہے،جے پور میں ایک صاحب کسی مقرر کی بے تکی بات پر تبصرہ کرنے کے لیے پرجوش تھے اور اٹھ کر مائک پر آنا چاہتے تھے،وہ ان کے ساتھ بیٹھے تھے، میں نے دیکھا،انہوں نے ادب سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور درگذر کرنے کی درخواست کی،وہ اہل ندوہ کے لیے قابل احترام بھی بن گئے تھے اور محبوب بھی،ان کی باتوں میں درسِ اخلاق تھا،ان کے جملوں میں تاثیر تھی، ان کے الفاظ میں حلاوت تھی اور زندگی محاسن اسلامی کی آئینہ دار،ان کے وجود میں علم وحلم یکجا تھا اور ان کی شخصیت میں متانت ووقار اور نشاط وانبساط دونوں کا حصہ تھا،ان کے ہم عصر صاحبانِ ذوق ان میں کشش محسوس کرتے تھے۔

وہ آسمانِ ادب کے درخشاں ستاروں میں بڑی تیزی سے شامل ہورہے تھے،وہ اپنی تحریر وتقریر میں نرمی اور لطافت رکھتے تھے، وہ کسی تیز دھوپ کی طرح جلاتے نہیں تھے، بلکہ کسی چراغ کی مانند جلتے تھے،ان کے خانوادہ میں صاحب شمشیر بھی گزرے ہیں اور صاحب تدبیر بھی، جہاں حکمت کے چراغ روشن تھے، وہیں شجاعت کی داستانیں بھی محفوظ تھیں، وہ اسی روایت کے وارث تھے، اسی تربیت کا عکس جمیل تھے،مگر صبر کے خوگر اور ضبط کے عادی تھے،زندگی کی تلخیوں کو چکھا،مگر کبھی شکوہ نہ کیا، وقت کے نشیب وفراز دیکھے،مگر اپنی بصیرت کو دھندلا نہ ہونے دیا،ابھی اس گیسوئے تابدار کو اور تابدار ہونا تھا اور نکھرنا تھا اور سنورنا تھا،زمانہ پہ چھانا تھا اور قلب ونظر کو شکار کرنا تھا،لیکن وصال یار سے بڑھ کر کیا سعادت ہوگی اور شہادت سے بڑھ کر کون سی موت، آفتاب عمر لب بام آ گیا تھا، ڈوب گیا،لیکن اپنے پیچھے شفق کی سرخیاں چھوڑ گیا:

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کو میں نے زیادہ تو نہیں پڑھا لیکن ان کی کتاب ''دعوتِ فکر ونظر'' پڑھی ہے، یہ کتاب محض الفاظ کا ایک سلسلہ نہیں بلکہ اس میں عقل وروح کی ایسی ہم آہنگی ہے جو قاری کو اپنے اندر کی دنیا میں جھانکنے پر مجبور کر دیتی ہے،ایمان اور روحانیت کے باب میں مولانا ندوی نے جس گہرائی سے ایمان کی حقیقت کو بیان کیا ہے، وہ ایک زندہ تجربہ کی مانند محسوس ہوتا ہے،ان کے الفاظ کاغذ پر جامد نہیں رہتے، بلکہ قاری کی روح میں اتر کر ایک ایسی شمع فروزاں کرتے ہیں جو ظلماتِ شب میں رہنمائی کا کام دیتی ہے، وہ ایمان کو خشک نظریات کی دنیا سے نکال کر ایک جیتی جاگتی حقیقت میں تبدیل کر دیتے ہیں، جہاں روحانیت کسی زاویہ نشینی کا نام نہیں، بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں نورانیت کا ورود ہے، یہی کیفیت ان کے اخلاقی مباحث میں بھی نمایاں ہے، اخلاق ان کے نزدیک محض گفتار کی چاشنی نہیں، بلکہ کردار کی چمک ہے، جو نہ صرف فرد کی ذات کو منور کرتی ہے، بلکہ پورے معاشرہ میں روشنی پھیلانے کا سبب بنتی ہے، ان کے الفاظ آئینہ کی مانند ہیں جن میں قاری اپنی اصل شکل دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اسے اپنے ''پندار خودی'' کا جواب مل جاتا ہے، وہ زبان سے زیادہ عمل کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور یہ درس دیتے ہیں کہ اصل دعوت وہی ہے جو خاموشی سے عمل کے ذریعہ دی جائے،مگر مولانا ندوی محض ایک ماضی پرست صوفی یا اخلاقیات کے واعظ نہیں، بلکہ ایک نباضِ وقت ہیں جو عصر حاضر کے مسائل کو گہری بصیرت سے جانچتے ہیں،مغربی تہذیب کی یلغار ہو،امت کے زوال کا نوحہ ہو یا نوجوانوں کے فکری بھٹکاؤ کا المیہ، وہ ہر مسئلہ کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور قاری کو درپیش چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے فکری ہتھیار فراہم کرتے ہیں۔

ان کی تحریر میں وہ توازن موجود ہے جو نہ شدت پسندی کی طرف جھکنے دیتا ہے، نہ مداہنت کا شکار ہونے دیتا ہے، ان کے تجزیہ میں گہرائی ہے جو فکری وسعت اور اجتہاد کی ضرورت کو اجاگر کرتی ہے، اجتہاد کے باب میں ان کی گفتگو ایک زبردست علمی استدلال اور ادبی چاشنی سے لبریز ہے،تقلید وتجدید کی بحث ہو یا فکر ونظر کی آزادی کا سوال،مولانا کا اسلوب ایک ایسے معلم کا اسلوب ہے جو شاگرد کے ذہن پر جبر نہیں کرتا بلکہ اسے سوال اٹھانے،غور وفکر کرنے اور دلیل کے ساتھ آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے،وہ تقلید کو محض ایک روایتی بوجھ نہیں سمجھتے، بلکہ اسے اجتہاد کے دروازے کی ایک کنجی کے طور پر دیکھتے ہیں جو وقت اور حالات کے مطابق دروازہ کھولنے میں مدد دیتی ہے،لیکن علم،فکر اور تجزیہ کی دنیا میں سفر کرتے کرتے مولانا قاری کو نفس کی تربیت اور اصلاحِ ذات کے ایک اور جہان میں لے آتے ہیں، یہاں وہ انسان کے داخلی اور خارجی پہلوؤں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ تربیت کو کوئی جامد اصول نہیں بناتے، بلکہ اسے فرد کے حالات اور نفسیاتی کیفیات کے ساتھ مربوط کرتے ہیں، ان کے نزدیک کامیابی کا راز محض ظاہر کی اصلاح میں نہیں بلکہ باطن کی درستی میں ہے، جہاں خود احتسابی اور مثبت طرزِ فکر کے چراغ جلائے بغیر اندھیروں سے نکلنا ممکن نہیں، یہ ساری فکری و روحانی پرواز ایک عظیم تر مقصد

سے جڑی ہے اور وہ ہے امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری، مولانا کی تحریر ایک فرد کو اس کے ذاتی دائرہ سے نکال کر اجتماعی شعور سے جوڑ دیتی ہے، وہ قاری کو دعوت کی راہوں پر اس انداز سے لے کر آتے ہیں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ صرف ایک مذہبی فریضہ نہیں بلکہ زندگی کا سب سے حسین اور سب سے ضروری کام ہے۔

دعوتِ فکر و نظر کا مطالعہ محض ایک کتاب پڑھنے کا تجربہ نہیں، بلکہ ایک فکری اور روحانی سفر ہے، اس میں گزرے ہوئے زمانوں کی روشنی بھی ہے اور آنے والے وقتوں کی بشارت بھی، مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کی تحریروں میں مولانا عبد الماجد دریابادی کی ادبی لطافت literary elegance کی جھلک صاف نظر آتی ہے، لیکن ایسے جیسے کسی ندی کے پانی میں آسمان کا عکس لرزاں ہو، وہی متانت، وہی تجزیاتی نزاکت analytical precision اور وہی الفاظ کی سادگی جو بیک وقت گہری بھی ہے اور پر اثر بھی، مولانا دریابادی کا مقام بہت بلند ہے لیکن مولانا ندوی کے اسلوب میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے، نہ خطابت کی بلند آہنگی، نہ محض الفاظ کی چمک، بلکہ ایک ایسی لطیف قوت جو خاموشی سے دل و دماغ میں اترتی ہے اور دیر تک اپنا اثر باقی رکھتی ہے، فرق یہ ہے کہ مولانا دریابادی کی تحریر میں صحافتی تیزی اور دوٹوک انداز نمایاں ہے، چبھتے ہوئے جملے، نپی تلی تنقید اور گہرا استدلال جو قاری کو چونکا دیتا ہے، وہ سوالات کو ادھورا نہیں چھوڑتے بلکہ واضح اور حتمی جواب دیتے ہیں، دوسری طرف، مولانا حسنی ندوی کی تحریر تدریجی فکری سفر کی مانند ہے جو قاری کو آہستہ آہستہ ساتھ لے کر چلتی ہے، سوچ کے دروازے کھولتی ہے اور اسے خود دریافت کرنے کا موقع دیتی ہے، اس کا ایک نمونہ پڑھئے اور فیصلہ کیجیے:

”ذرا تصور کیجیے! ایک معمولی سا مکان ہے، بادشاہ سلامت کی تشریف آوری ہے، اللہ کا ایک بوریہ نشیں بندہ شہاب حلبی پاؤں پھیلائے بیٹھا ہے، خدام و مریدین کی جماعت اس مہمان ذی شان کی آمد پر خوشی سے سرشار ہے، لیکن خدا کا یہ بندہ بالکل خاموش ہے، ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں، چہرہ پر کوئی تاثر نہیں، بادشاہ کی آمد پر خوشی کا کوئی اظہار نہیں، استقبالیہ تیاریوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں، دل میں اس کے سکون ہے، چہرہ پر اس کے جلال ہے، آواز میں اس کے اعتماد ہے، لہجہ میں اس کے یقین ہے، آنکھوں میں ایسی چمک ہے کہ ملنے والوں کے دل کی اندھیری دنیا میں روشنی ہونے لگتی ہے، آواز میں ایسا اثر ہے کہ سننے والوں کے دل کی گہرائی میں اترنے لگتی ہے۔ بادشاہ کی سواری پہنچتی ہے، اشرفیوں کی تھیلی نذرانہ کے طور پر اس بندۂ خدا کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، جواب ایسا ملتا ہے کہ بادشاہ کی حقیقت خود بادشاہ پر عیاں ہو جاتی ہے، وہ جواب کیا تھا ایک آئینہ تھا جو بادشاہ کو دکھلایا گیا، ایک سچ تھا جو بادشاہ کے سامنے پہلی بار بولا گیا۔ انہوں نے کہا: بادشاہ کے سامنے پاؤں پھیلانے کی جرأت کرنے والا بادشاہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی غلطی نہیں کرتا۔“

مولانا جعفر مسعود ندویؒ کی عربی تحریروں میں بھی فکر کی روانی، زبان کی چاشنی اور اظہار کی بلاغت یکجا ہوگئی تھی، خوش تراش صیقل شدہ آئینہ کی مانند، وہ عربی کے حسن و جمال سے آشنا تھے، اس کے رموز و نکات سے بخوبی واقف تھے، ان کے اسلوب میں قدیم عربی کی خوبیاں بھی تھیں اور جدید طرز نگارش کی شگفتگی بھی، ان کی عربی تحریروں میں بھی نہ تو تصنع کا بوجھ تھا، نہ تکلف کی گھٹن، بلکہ ہر جملہ اپنے اندر ایک خاص تازگی اور معنوی عمق لیے ہوئے ہوتا، گویا کہ وہ ”سحر حلال“ کے مالک تھے، جو زبان کو حسن بخشتا اور فکر کو جلا دیتا ہے، مولانا جعفر مسعود ندوی کی نثر ”جزالة الألفاظ ووضوح المعاني“ (خوش بیانی اور وضوحِ معانی) کا دل کش امتزاج بن گئی تھی، جب وہ طلبہ اور نونہالانِ ادب کے لیے لکھتے تو ”سهولة التعبير مع عمق الفكرة“ (سادگی میں گہرائی) کا ایسا رنگ پیدا ہوتا جو ذہن کو بوجھل کیے بغیر علم کے چراغ جلاتا، وہ آسان الفاظ میں حکمت سمو دیتے، یوں جیسے کوئی مہربان استاذ کسی بچہ کا ہاتھ تھام کر نئی فکری دنیا کی سیر کروا رہا ہو جیسا کہ ”اخی العزیز“ سے معلوم ہوتا ہے، جب وہ اصحابِ علم سے مخاطب ہوتے، تو ”الإيجاز غير المخل، والإسترسال غير الممل“ (ایجاز جو مفہوم کو محدود نہ کرے اور تفصیل جو اکتاہٹ نہ دے) کا نادر نمونہ پیش کرتے ہیں، جب وہ عصر حاضر کے مسائل پر قلم اٹھاتے تو گہری بصیرت، فکری تازگی، اور اپنے والد گرامی مولانا واضح کے واضح استدلال کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے، ان کی عربی تحریر کا صرف ایک نمونہ دیکھئے:

”إن من معجزات النبي محمد صلى الله عليه وسلم أن الإساءة إليه والتطاول عليه ووصفه بما لا يليق بشأنه، تجمع كل من يدين بالإسلام، مهما كان شغله، ومهما كان منصبه، ومهما كان عمله، ومهما كان انتماؤه، ومهما كان مستواه العقلي والفكري والديني والعلمي، على رصيف واحد، وتجعلهم صوتاً واحداً وكلمة واحدة، ويداً واحدة، وتوقظه من السبات، وتنهضه من الفراش، وتثير فيه الحمية،

وتجدد فيه الإيمان، وتوثق بين المسلمين الصلة، وتوطد بينم الإخوة، وتعيد إليهم الحماسة، وتحولهم إلى بنيانيشدّ بعضه بعضاً، ويرى العالم كله وبدهشة غريبة أن كل مسلم مستعد لنصرة دينه بدمه وروحه وماله وولده، حباً لنبيه محمد صلى الله عليه وسلم، فهو أقرب إليه من قلبه، وأحبّ إليه من نفسه، وصدق من قال: إنه لم يستطيع أحد أن يتجرأ مهما بلغ من الحقد والكراهية والعداء والضغينة، على أن يسيء إلى محمد صلى الله عليه وسلم بكلمة إلا بعد ما ضعفت الأمة، وهانت وفرطت وقصّرت في أداء واجبها تجاه دينها وعقيدتها وشريعتها، ولا يحترم هؤلاء السفلة دين هذه الأمة وكتابها ومقدساتها إلا إذا احترمت الأمة نفسها وكتابها وسنة نبيها، ولا يعني الاحترام إلا العمل بما جاء به نبيها محمد صلى الله عليه وسلم."

اردو ترجمانی: (بلاشبہ نبی کریمؐ کے معجزات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب بھی کوئی ان کی شان میں گستاخی کرتا ہے، ان کی ذاتِ اقدس پر نازیبا کلمات کہتا ہے، یا ان کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے، تو یہ چیز ہر اس شخص کو جو خود کو مسلمان کہتا ہے، ایک ہی صف میں لاکھڑا کرتی ہے، خواہ اس کا پیشہ کچھ بھی ہو، اس کا منصب کتنا ہی بلند ہو، اس کی مصروفیات کیسی بھی ہی ہوں، اس کی فکری وعلمی سطح جیسی بھی ہو اور اس کا کسی بھی گروہ یا مکتبِ فکر سے تعلق ہو، سب یکجا ہوجاتے ہیں، ایک آواز بن جاتے ہیں، ایک ہی موقف اپناتے ہیں اور ایک مٹھی کی مانند مجتمع ہوجاتے ہیں، یہ گستاخی ان کے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے، ان کی غیرت کو بیدار کرتی ہے، ان کے ایمان کو تازگی بخشتی ہے، مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو مضبوط کرتی ہے اور ان کے درمیان اخوت کو مستحکم کردیتی ہے، اس سے ان میں ایک نئی حرارت، ایک نیا جوش پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسی مضبوط دیوار کی طرح متحد ہوجاتے ہیں جو ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہے، یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب پوری دنیا حیرت زدہ ہوکر دیکھتی ہے کہ ہر مسلمان اپنے دین کی سربلندی کے لیے اپنی جان، اپنا مال، اپنی اولاد اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہے، کیوں کہ نبی کریمؐ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں اور وہ ان سے اپنی ذات سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ کسی میں یہ جرأت ہی نہیں تھی کہ وہ نبی اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرتا، جب تک کہ امت خود کمزور نہ ہوئی، ذلت کا شکار نہ ہوئی اور اپنے دین، عقیدہ اور شریعت کے حوالہ سے کوتاہی نہ برتی۔ یہ بدبخت کبھی بھی اس امت کے دین، اس کی کتاب اور اس کی مقدسات کی عزت نہیں کریں گے جب تک کہ خود امت اپنے دین، اپنی کتاب اور نبی کریمؐ کی سنت کا احترام نہ کرے اور عزت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس دین پر پوری طرح عمل پیرا ہوجائیں جو نبی کریمؐ لے کر آئے تھے)۔

ندوہ اور خانوادۂ حسنی کا آسمان ہمیشہ علم وفضل کے ستاروں سے روشن رہا ہے، مولانا مرحوم کے تینوں نورِ نظر مولوی خلیل حسنی ندوی، مولوی امین حسنی ندوی اور مولوی عبدالحی حسنی ندوی بھی ماشاء اللہ باذوق، سعادت مند اور علم وقلم سے وابستہ ہیں، ان شاء اللہ والد کے نقش قدم پر چلیں گے اور یہی تسلسل علم وحکمت کی شمع کو فروزاں رکھے گا:

از صد سخن پیرم یک حرف مُرا یاد ست
عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد ست!

☆☆☆☆☆

..................بقیہ صفحہ ۸۶/ کا

اس کے بعد ۲۰۱۳ء میں جب جناب مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی صاحب کا انتقال ہوا تو ۱۴/فروری ۲۰۱۳ء کو ان کی جگہ پر مدیر التحریر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، اس طرح براہ راست ان سے مزید قریب ہونے موقع ملا۔ بعدازاں ۲۳/جنوری ۲۰۱۹ء اپنے والد محترم کے انتقال کے بعد رئیس التحریر ہوئے، پھر اور قریب ہوگیا اور زیادہ ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ کیونکہ وہ دفتر الرائد کے ذمہ دار بھی ہوگئے تھے، اس لئے مجھے الرائد کے ہر واؤچر پر ان کے دستخط کرانا لازمی ہوتا تھا، یوں تو ہم دونوں کے درمیان حاکم ومحکوم کا رشتہ تھا، مگر پرانے رشتہ کو ہی انہوں نے ہمیشہ ترجیح دی۔

وہ میرے مشفق استاذ وسرپرست ومربی نور اللہ مرقدہ کے فرزندار جمند کے ساتھ ہمارے بے تکلف اور گہرے دوست بھی تھے، وہ مجھ سے بڑے بھائی کی طرح ملا کرتے تھے انکا اچانک چلا جانا میرا اور میرے اہل خانہ کا ذاتی نقصان ہے۔

انکی نماز جنازہ بعد نماز ظہر قریب دو بجے ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ العالی نے پڑھائی۔ ان کے آبائی قبرستان اور تکیہ کلاں رائے بریلی میں ایک جم غفیر کی موجودگی میں سپرد خاک کیا گیا۔ عوام الناس سے انکا تعلق کتنا گہرا تھا اسکا اندازہ انکے اچانک سانحہ ارتحال پر انکی نماز جنازہ میں ہزاروں کی تعداد میں عام وخاص مسلمانوں کی شرکت سے ہوا۔ اگرچہ نماز جنازہ دو بجے سے کچھ پیشتر ہوگئی تھی مگر کثرت ازدحام اور جم غفیر کی وجہ سے بہتوں کو مٹی دینے کا بعد نماز عصر موقع مل سکا۔ اللہ تعالیٰ ان لغزشوں اور خطاؤں کو معاف فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

ماموں جی - کچھ یادیں کچھ باتیں

منصور حسن حسنی ندوی ☆

جب بھی ماموں جی کا ہنستا مسکراتا چہرہ ذہن میں آتا ہے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ آپ ابھی آتے ہی ہونگے؛ لیکن جب یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ آپ ہم میں موجود نہیں تو دل ودماغ ہل سے جاتے ہیں، ایک کسک ہے جو جسم کو جھنجوڑ دیتی ہے آپ کی جدائی سے دل غم سے نڈھال ہے ذہن رنج والم سے رنجور ہے جسم ساکت و بے بس ہے اس عظیم نقصان کے تلافی کی کوئی سبیل نہیں کوئی راستہ نہیں سوائے صبر کے' صبر ہی ہے جو رنجور دلوں کا مرہم ہے ارشاد خداوندی ہے: "انما يوفّى الصابرون أجرهم بغير حساب".

فرمان نبویؐ ہے:" الصبر عند الصدمة الأولى"، صبر پر اللہ تعالیٰ کے عظیم وعدے ہیں یہی صبر انسان کے ایمان ویقین کو مہمیز کرتا ہے اور ترقی درجات کا باعث ہوتا ہے۔

ماموں جی کی شخصیت بے شمار خوبیوں اور نیک خصائل سے مرصع تھی آپ ایک طرف مخلص بلند پائے کے عالم دین تھے تو دوسری طرف باکمال ادیب ومصنف عظیم دانشور اور فکر اسلامی کے نقیب و ترجمان تھے دارالعلوم ندوہ العلماء لکھنؤ کے علیا درجات کے دروس اس کے شاہد ہیں اور ان دروس میں طلباء کا ہجوم اس کا گواہ ہے کہ آپ اپنی مثال آپ تھے۔ فکر اسلامی میں ورثہ بوالحسن کے امین بنے اور ادب وانشاء میں والد گرامی کے سچے وارث ہوئے، فکر اسلامی میں آپ نے عرب مفکرین سے بھی بڑا استفادہ کیا، کثرت سے ان مفکرین کو سنتے اور بہترین تجزیہ کرتے تھے، آپ کی مجلسیں علمی و فکری موضوعات سے لبریز ہوا کرتی تھیں۔

تفسیر میں آپ کو بڑی دلچسپی تھی، مصری عالم شیخ شعراوی کو سنتے اور کہتے تھے کہ ان کے تفسیری نکات بڑے الگ اور منفرد ہوتے ہیں، قرآن مجید بہت ہی عمدہ پڑھتے، بیسیوں سال آپ نے تکیہ کی مسجد میں تراویح میں قرآن سنایا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو آپ کا حدر میں قرآن پڑھنا بہت پسند تھا، حضرت مولاناؒ فرماتے تھے: جعفر اتنا عمدہ پڑھتے ہیں کہ بیس رکعت کب پوری ہوگئیں محسوس ہی نہیں ہوتا، آپ شیریں کلام خوش مزاج تھے، جس سے ملتے خوب ملتے، بات کرتے تو مسکرا کر کرتے، سوال سنتے تو توجہ سے سنتے اور پورا جواب دیتے، میں نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا کوئی بھی طالب علم آسانی سے آپ سے مل لیتا، آپ اس کی بات بہت توجہ سے سنتے اور اسکو مفید مشوروں سے نوازتے، طلبہ آپ سے مانوس تھے، جا بجا آپ سے رہنمائی حاصل کرتے رہتے تھے۔

ماموں جی کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، وہ ہر میدان کے شہسوار تھے: لیکن انہوں نے اسکا کبھی اظہار نہیں کیا، بڑی خاموشی سے درس وتدریس سے وابستہ رہے، ان کا درس بڑا مقبول ہوتا تھا، وہ درس کا حق ادا کردیتے تھے، طلبہ کے اشکالات بڑی آسانی سے حل کرتے، مشکل سے مشکل الفاظ کو اس طرح واضح کرتے کہ کوئی تشنگی نہ رہ جائے، یہ بات ان کو اپنے محبوب چچا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے حاصل ہوئی تھی۔

ہم نے بارہا آپ کو حضرت مولانا سے استفادہ کرتے دیکھا تھا، آپ کو فکر وادب کی بلندی اپنے چچا اور والد رحمہما اللہ سے ہی حاصل ہوئی تھی آپ ان کے سچے جانشین اور حقیقی وارث اور علمی ورثے کے امین ہوئے، آپ نے ان حضرات کی خوب خدمت کی اور ان کو آرام پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، عرفانیہ سے پڑھا کر آپ ندوے جاتے، دیر رات تک ان حضرات کی خدمت میں رہتے، یہ سلسلہ سالوں چلتا رہا، یہاں تک کہ اپنے والد رحمہ اللہ کے انتقال کے وقت جو فجر کی اذان کا وقت تھا، وہیں ندوے میں ان کے ساتھ موجود تھے، آپ فرمارہے تھے کہ جب والد صاحب وضو کر کے نکلے تو پیٹ کی تکلیف کا اظہار کیا اور بستر پر لیٹتے ہی ہم سے سورۂ یاسین پڑھنے کو کہا، ہم نے سورہ یاسین شروع کی، اسی اثناء اذان فجر کے دوران آپ کی روح پرواز کرگئی، اپنے والد رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد بھی اپنے چچا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کی خدمت میں جانے کا وہی معمول رہا ہے، آپ سے ان کو بڑی تقویت ہوتی، بعض حالات میں آپ ان کے لیے سینہ سپر ہوگئے، اپنے کو شریعت کے تقاضے پر ڈھال دیا، شریعت کے معاملہ میں کسی کی بھی پرواہ نہ کی، شریعت پر عمل پیرا ہو کر اس حدیث شریف کے عامل ہوئے: من أحب لله، وأبغض لله، وأعطى لله، ومنع لله، فقد استكمل الإيمان.

آپ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حب صحابہ رضی اللہ عنہم سے سرشار تھے اور اسی رنگ میں رنگ کر اس

☆ استاد دارالمبلغین، لکھنؤ

آیت صبغة الله ومن أحسن من الله صبغة ونحن له عابدون کی گویا تفسیر ہوں، حضرت مولاناؒ آپ کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ آپ ہر وقت ان کی نگاہ کے سامنے رہیں، آپ اگر کہیں چلے جاتے تو حضرت مولاناؒ کو آپ کے آنے کا شدت سے انتظار رہتا، آپ نے ہر لحاظ سے ان کو آرام پہنچایا، تکیہ کے قیام کے دوران حضرت مولانا کے مہمانوں کا خوب خیال رکھتے، ضیافت میں بچھ بچھ جاتے اور اچھی سی اچھی ضیافت کی کوشش کرتے اور دسترخوان کا برابر جائزہ لیتے تاکہ کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہو، تکیہ ہو یا خاتون منزل دونوں جگہ ماموں جی دعوت کرنے میں پیش پیش رہتے، جب بھی آپ کے دوست احباب میں سے کوئی آتا دعوت ضرور کرتے، آپ کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، بڑی بے تکلف دوستانہ مجلسیں ہوا کرتیں، ماموں جی اپنی اسی بے تکلفی کی وجہ سے تمام قدیم ندویوں میں جعفر بھائی سے معروف تھے۔

آپ ہم سب کے مربی اور سرپرست تھے، آپ نے بڑوں کی کمی پوری کر دی تھی، آپ سے بڑی ڈھارس تھی، آپ کا رعب و دبدبہ تھا، آپ کا وقار تھا جس سے خاندان کا اقبال بلند تھا، آپ اپنے اسلاف کے سچے وارث تھے اور شہید ہو کر اپنے جد امجد شہید السادات حضرت سید احمد شہید سے جا ملے، بھائی صاحب مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کہتے تھے کہ ماموں جی سے بڑوں کو بہت آرام ملا اور آپ نے اپنے بڑوں کی خوب دعائیں لیں، حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ آپ سے پناہ محبت کرتے تھے، حضرت کے ساتھ آپ کا عالم عربی کا سفر بھی ہوا تھا، آپ نے حضرت کی بعض کتابیں سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ ''کاروان زندگی'' کی ایک جلد اور حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمہ اللہ کی سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کیا جس کو حضرتؒ نے بہت پسند فرمایا، اس کے علاوہ حضرت مولاناؒ کی دینی، دعوتی و اصلاحی تقاریر کی کیسٹ تیار کر کے ان کو عام کیا۔

آپ نے بعض موقعوں پر عالم اسلام کے حالات پر حضرت کے موقف کی تائید میں بہترین مقالات و مضامین تحریر کر کے حضرت کی خوب دعائیں حاصل کیں، انہیں دعاؤں اور لوگوں کی خدمت نے آپ کو اپنے بڑوں کی صفت میں کھڑا کر دیا۔

آپ نے اپنی والدہ کی ایسی مثالی خدمت کی جو ضرب المثل بن گئی، باقاعدہ لوگ یہ بات کہتے تھے کہ خدمت ہو تو جعفر بھیا جیسی، ہر روز آپ دوپہر میں عرفانیہ سے سیدھے تکیہ جاتے تھے اور دوسرے دن فجر بعد سیدھے عرفانیہ آکر پڑھا کر واپس جاتے، تقریباً ایک دو سال مسلسل آپ کا یہ معمول رہا۔

اس کے علاوہ اپنے چچازاد بھائی مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی علیہ الرحمہ جو آپ کے سگے بھائی کی طرح تھے، آپ دونوں میں مثالی محبت تھی، علاج کے سلسلہ میں بہت فکرمند رہے، ہر بڑے ڈاکٹر سے مشورہ اور علاج کے لیے جو بھی ممکن ہو سکا، اس کی کوشش کی۔

آپ ہر جمعرات کو تکیہ جاتے، گھر کے تمام معاملات، اولاد کی تربیت بہترین انداز میں کی، کھانے پینے اوڑھنے پہننے پر نگاہ رکھتے، بے تکا بے ڈھنگا لباس آپ کو ناپسند تھا، لباس کا جوڑ صحیح ہو، ٹوپی سیدھی ہو، جوتا موزے کے ساتھ ہو، یہ وہ باتیں جن پر آدمی عام طور سے توجہ نہیں کرتا ہے، اس کے علاوہ زمینوں کے تمام معاملات دیکھتے، کھیتوں میں جوتائی کروانا، بیج ڈلوانا، درخت لگوانا، سب کام آپ نے اپنے ذمے لے رکھے تھے، ماموں جان مولانا حمزہ حسنی کہتے تھے کہ جعفر پڑھانے کے ساتھ یہ سب کام کرتے ہیں، انہوں نے ہم سب کو فارغ کر رکھا ہے، ابھی چند سالوں سے یہ ذمہ داری آپ نے اپنے فرزند مولوی امین حسنی ندوی اور مولانا حمزہ صاحب کے بیٹے مولوی سعید حسنی ندوی کے سپرد کر دی تھی۔

اپنے بیٹوں کو ہر نیک کام میں آگے رکھتے، جیسی ضرورت ہوتی وہاں پیش پیش رہتے، بھائی صاحب محمود جب علاج کی غرض سے چندی گڑھ میں مقیم تھے تو ماموں جی نے اپنے فرزند اکبر مولوی خلیل حسنی ندوی کو بھائی صاحب کی تیمارداری کے لئے چندی گڑھ بھیجا، ساتھ میں مولوی عبدالعلی حسنی بھی تھے، دیگر اعزہ، اقرباء اور متعلقین کی مزاج پرسی کرتے، مریضوں کی عیادت کرتے، کوئی بھی بیمار ہوتا تو اسپتال اس کو دیکھنے ضرور جاتے، لکھنؤ کی قیام گاہ خاتون منزل کے ایک پڑوسی شدید بیمار تھے، منگل کے دن انتقال سے ایک دن پہلے ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے، ان کا کہنا تھا حضرت مولانا جعفر صاحب آئے اور انہوں نے ہم کو بڑی تسلی دی اور کہا ابھی تو ہم تکیہ جا رہے ہیں، پھر آئیں گے، کیا پتا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، رائے بریلی کے ایک صاحب نے بتایا کہ ہم بلرام پور اسپتال تقریباً پندرہ دن ایڈمٹ رہے اور مولانا جعفر صاحب اکثر دیکھنے آتے، مزاج پرسی کرتے اور ہر طرح کا تعاون کرتے، غریبوں اور ضرورت مندوں کا خیال کرتے اور ان کی مدد کرتے جیسی ضرورت ان کو ہوتی وہ پوری کرتے۔

اسی طرح اپنے اور اپنے بڑوں کے متعلقین سے رابطے میں رہتے، گاہے بگاہے فون کرتے، ملنے کے لئے بھی جاتے، جو بھی آجاتا اس کا بے حد خیال

کرتے اور اس حدیث شریف کے تحت لاتحقرنّ من المعروف شیئاً ولو أن تلقی أخاك بوجه طلق بڑے ہی تپاک سے ملتے اور اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے کہ ایک مرتبہ ملنے والا آپ کے اخلاق کا اسیر ہوجاتا، سلام کرنے میں خود پہل کرتے، بڑے مسکرا کے ملتے، مصافحہ بڑی گرم جوشی سے کرتے، مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ اپنا ہاتھ خود نہ ہٹالے، دیر تک گفتگو کرتے، متکلم کی بات بہت توجہ سے سنتے، مشورہ کرنے والے کو بہترین مشورہ دیتے، گفتگو بڑی صاف کرتے، الفاظ بڑے واضح ہوتے، ابھی جلدی ہی آپ نے یوٹیوب پر ”کام کی بات“ کا سلسلہ شروع کیا، جو بڑے مقبول ہوئے، کئی سالوں سے آپ لکھنؤ میں اپنی رہائش گاہ کی مسجد قبر ماموں میں درس قرآن عوامی ذہن کو سامنے رکھ کر دے رہے تھے جس کو وہاں کے لوگ بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنتے تھے اور دور سے بھی لوگ آ کر شریک ہوتے تھے، درس قرآن کے متمنی رہتے تھے، بارہا ایسا ہوا کہ سنیچر کے روز لوگ پوچھتے کہ مولانا آج تو درس دیں گے۔

آپ تقریر نہیں کرتے تھے لیکن جب لوگ کثرت سے بلانے لگے تو آپ دین سمجھ کر جاتے تھے، آپ کی تقریریں بڑی زود اثر ہوتی تھیں، ایک موضوع پر کئی تقریریں ہوتیں؛ لیکن مضامین سب کے الگ ہوتے، ان میں آپ امتیازی شان رکھتے تھے، یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر خاص فضل رہا کہ آپ آخری دن تک دینی کام کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے، اللہ تعالیٰ آپ کو غریق رحمت کرے، آپ کے کاموں کا آپ کو بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اس حادثہ فاجعہ پر سب کو صبر جمیل نصیب فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

ایک متواضع عالم دین

ڈاکٹر محمد عزیر (ایم ڈی) ☆

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں جو بھی جاندار ہے، اسے ایک دن اس فانی دنیا سے جانا ہے، اس کائنات کا نظام اسی طرح چل رہا ہے، جو شخص جتنا بلند اخلاق اور نرم مزاج ہوتا ہے، اتنا ہی لوگ اسے دنیا سے جانے کے بعد بھی ہمیشہ یاد رکھتے ہیں، اور وہ شخص ہمیشہ یادوں کا حصہ بنا رہتا ہے۔

اس سال ایک بڑا حادثہ پیش آیا کہ حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک سڑک حادثے میں اس فانی دنیا سے انتقال کر گئے۔ مولانا مرحوم حسنی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور آپ حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند تھے۔ آپ ندوۃ العلماء کے ناظرِ عام اور کئی کتابوں اور رسالوں کے مؤلف تھے۔ آپ عربی جریدہ ”الرائد“ کے مدیر اعلیٰ تھے۔ آپ کی ولادت ۱۳ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو تکیہ رائے بریلی اتر پردیش میں ہوئی۔

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے حفظِ قرآن اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن رائے بریلی میں حاصل کی۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا اور علوم شرعیہ کے ساتھ عربی زبان وادب میں بھی مہارت حاصل کی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عالمیت اور فضیلت مکمل کی اور اپنی تدریسی زندگی کا آغاز لکھنؤ میں واقع ندوۃ العلماء کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے کیا، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے نکلنے والے پندرہ روزہ عربی جریدہ الرائد کے ۲۰۱۹ء سے مدیرِ اعلیٰ (رئیس التحریر) رہے، اور حالیہ دنوں میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظرِ عام مقرر ہوئے تھے۔

ان تمام اوصافِ حمیدہ کے ساتھ آپ ایک بلند اخلاق شخص تھے۔ آپ کی شخصیت سراپا تواضع تھی۔ مولانا مرحوم سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں، جن میں سے ایک ملاقات قابلِ ذکر ہے۔ گزشتہ رمضان تراویح کی نماز کے بعد مولانا مرحوم مجھے اپنے رائے بریلی والے گھر لے کر گئے اور میرے ساتھ نہایت تواضع اور اخلاق کا معاملہ کیا۔ مولانا کا تواضع دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ندوۃ العلماء جیسی عظیم الشان درسگاہ کے ناظرِ عام ہیں۔ مزاج میں اتنی سادگی تھی کہ گھر کے افراد عمرے کے لیے گئے ہوئے تھے، مولانا نے خود ہی طعام کا انتظام کیا اور اپنے ہاتھ سے نکال کر ہمیں دسترخوان پر دیا اور ہماری مہمان نوازی کی۔

اسی طرح ندوۃ العلماء میں مہمان خانے کے باہر جب بھی مولانا مرحوم سے ملاقات ہوتی، ہمیشہ مسکراتے ہوئے ملتے، میری خیریت دریافت کرتے اور نہایت اخلاق سے پیش آتے۔ آپ واقعی ایک حقیقی مربی، بلند اخلاق شخص اور بڑے عالمِ دین تھے۔

مولانا کو جب بھی یاد کرتے ہیں تو دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ کریم مولانا کے درجات بلند فرمائے، آنے والی نسلوں کو مولانا کے چھوڑے ہوئے علمی ذخیرے سے خوب فائدہ پہنچائے اور قیامت کے دن اپنے فضل سے ہمیں مولانا مرحوم کے ساتھ جنت میں جمع کرے، آمین۔

☆☆☆☆☆

☆ راجاجی پورم لکھنؤ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

محمد قمر عالم ندوی☆

جو بادہ کش تھے پرانے اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقاء دوام لے ساقی

ندوۃ العلماء کے ناظر عام، ندوہ کے عظیم فرزند نامور صحافی وادیب، مترجم وانشاء پرداز، تفسیر وحدیث وادب عربی کے استاد حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ سڑک حادثہ میں ۱۵ جنوری ۲۰۲۵ء مطابق ۱۴ رجب المرجب ۱۴۴۶ھ کو بدھ کی شام رات کے ساڑھے آٹھ بجے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی، انا لله وانااليه راجعون، للّٰه ما أخذ وله ما أعطى و كل شيء عنده بأجل مسمى، وان القلب ليحزن والعين لتدمع ولانقول الامايرضى وانالفراقه لمحزونون۔

مولانا کے انتقال کی خبر واٹس ایپ گروپ میں آگ کی طرح پھیل گئی ، یہ خبر بہت اندوہناک اورالمناک حادثہ تھی، ہر طرف یہ خبر سن کر لوگ مایوس اور غمگین ہوگئے دل کو بالکل ہی یقین نہیں ہو رہا تھا پھر بھی بار بار معتبر ذرائع سے خبر کی تصدیق بھی کرتا رہا کہ کہیں غلط ثابت ہو لیکن بالآخر خبر کی بھی صحیح تصدیق ہوگئی: كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذو الجلال والاكرام روئے زمین پر جو بھی ہے سب فانی ہے صرف اللہ رب العزت کی ذات باقی وابدی ہے اور جائے حادثہ کا ویڈیو اور فوٹو بھی خوب وائرل ہونے لگا، دل کو منانے پر مجبور ہوا، حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ رائے بریلی میں کہیں جا رہے تھے کہ الہ آباد ہائی وے پر سڑک کنارے روک کر سردی سے بچنے کے لیے گلے میں مفلر باندھ رہے تھے کہ پیچھے سے نشہ میں دھت تیز رفتار کار نے ٹھوکر ماردی اور موقع پر ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، جبکہ دوسرے مصاحب بری طرح سے زخمی ہوگئے ہیں اور نزدیک کے اسپتال میں علاج چل رہا تھا اور کچھ دنوں کے بعد وہ بھی راہی سفر ہوگئے ہیں۔

حضرت مولانا سید جعفر حسنی ندویؒ حسنی خاندان کے چشم وچراغ تھے، مرحوم کے اندر وہ ساری خوبیاں اور اوصاف حمیدہ بدرجہ اتم موجود تھیں ، جو حسنی خاندان کا طرہ امتیاز رہا ہے، تواضع وانکساری اور اخلاق وکرادر میں اپنی مثال آپ تھے، ہر چھوٹے بڑوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملنا ایک دوسرے کی باتوں کو سنتے اور غور وفکر کے بعد اپنی بات رکھتے تھے، حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ، صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی ہند، مدیر پندرہ روزہ عربی جریدہ ''الرائد'' اور سکریٹری مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ اور اساتذہ کرام ،علماء عظام ، ارباب حل وعقد کے نزدیک ایک باوقار قابل قدر شخصیت تھے، مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مادر علمی کی تعمیر وترقی کے فکر میں آرام کو حرام کردیا تھا، ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے کہ مادر علمی کی ضرورت کے خاطر کویت اور سعودی عرب کی زیارت سے واپس لوٹے تھے ،حضرت موصوف نے ندوہ کے لئے خود کو وقف کردیا تھا، مولانا بہت ہی محنتی اور ندوہ کے لئے ہمیشہ فکرمند رہا کرتے تھے، مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کی زندگی زیادہ وفا نہیں کی نہیں تو مولانا کی ذات سے ندوہ اور ابناء ندوہ کو بہت ساری امیدیں وتوقعات وابستہ تھیں۔

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سابق صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے داماد اور سابق معتمد تعلیم، ادیب العصر وصحافی، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کے فرزند ارجمند تھے اور ان کے تربیت یافتہ اور سچے جانشیں تھے، سنجیدگی ومتانت بھی والد ماجد کی طرح پائی اور فیما قل ودل کی طرح بات چیت بھی کیا کرتے تھے، تقریر وتحریر، گفتار وکردار میں والد ماجد کے عکس جمیل تھے، حضرت مولانا حمزہ حسنی ندویؒ کے انتقال کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظر عام بنے تھے اور ۲۰۱۹ سے عربی جریدہ الرائد کے چیف اڈیٹر تھے، پندرہ روزہ عربی جریدہ الرائد میں ۲۵ سالوں سے براعم الایمان اخی العزیز کے موضوع پر مختصر لیکن بہت جامع لکھتے تھے، طلباء واساتذہ ذوق وشوق کے ساتھ پابندی سے پڑھتے تھے، سید جعفر مسعود حسنی ندوی کو عربی زبان میں بڑی قدرت حاصل تھی ،عربی زبان میں مضمون نگاری کے ساتھ کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا، آپ کی طرز زندگی بہت سادہ ، قلم توانا طرز نگارش صاف ،شستہ اور شگفتہ ہے، فکر اسلامی کی تشریح وتوضیح اور غیر اسلامی افکار کے ابطال وتردید میں آپ کا خامہ آبدار شمشیر جوہر دار بن جاتا ہے، طلباء کو درس وتدریس بھی دے رہے تھے، مولانا کا لیکچر خاص وعام تھا،............

................بقیہ صفحہ ۱۲۹ / پر

☆ دربھنگہ، بہار

ابی - امتیازات وخصوصیات

خلیل احمد حسنی ندوی ☆

باپ: اور تم کیا جانو کہ باپ کیا ہوتا ہے؟ باپ تیز دھوپ میں گھنے سایہ کی طرح ہوتا ہے، باپ ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جس کا احساس اس کے کھو جانے کے بعد شدت سے ہوتا ہے۔ باپ ایک ایسا آہنی قلعہ ہے جو زندگی کے نشیب وفراز میں ہماری پناہ گاہ ہوتا ہے۔ باپ زندگی کے ہنگاموں میں سراپا امید اور بھروسے کا نام ہے۔ باپ کا وجود پریشانیوں اور کلفتوں سے حفاظت کا ضامن ہے، باپ ایک ایسی شمع ہے جو تاریک راتوں میں ہماری راہیں روشن کرتا ہے اور آفتوں اور مصیبتوں سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ انسان کو نعمت کا احساس تب تک نہیں ہوتا جب تک وہ نعمت اس کے پاس ہوتی ہے، اور اگر وہ نعمت اس کے گھر کی ہو تو وہ اس سے بے نیاز ہی رہتا ہے؛ لیکن جب وہ اس نعمت سے محروم ہو جاتا ہے تو اسے اپنی اس محرومی کا شدت سے احساس ہوتا ہے پھر اسے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو اس نعمت کی سب سے بڑھ کر ضرورت تھی، بالکل اسی طرح جیسے ہم خود اپنے ابی کی کمی آج سب سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں، جنہیں ہم نے بدھ کی شام اس وقت کھو دیا جب وہ شہر رائے بریلی ایک کام سے گئے تھے۔ انہوں نے مغرب کی نماز جماعت سے ادا کی، ابی کا معمول تھا کہ سنتوں سے فراغت کے بعد کچھ وقت مسجد میں گزارتے تھے، مسجد کے کسی خالی حصہ میں سر جھکا کر بیٹھ جاتے، آپ کی وہ کیفیت مراقبہ کی معلوم ہوتی تھی، اور اکثر ہم لوگوں کو بھی سنتوں کے بعد کچھ وقت مسجد میں گزارنے کی تاکید فرماتے تھے اور جلدی نکلنے پر سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے، حضرت عمر کا قول اکثر نقل فرماتے تھے کہ ایک دور آئے گا جو فتنوں کا ہوگا اس میں کامیاب وہی ہوگا جو مسجد سے وابستہ ہوگا اور قرآن کریم سے وابستہ ہوگا، مسجد میں تھوڑی دیر تنہائی میں وقت گزارنے کے بعد گھر تشریف لائے، تھوڑی دیر گھر میں رک کر اپنے ایک عزیز دوست سے ملاقات کی غرض سے شہر تشریف لے گئے، ابی کا یہ معمول تھا کہ وہ جب بھی لکھنؤ سے تشریف لاتے تو ان سے ضرور ملنے جاتے، انہیں ان کا بہت خیال رہتا تھا، کیونکہ وہ مدرسہ فلاح المسلمین کے سابق مہتمم مولانا عبدالباری ندویؒ کے فرزند تھے اور مولانا عبدالباری صاحب ہمارے میاں اور ابا (حضرت مولانا ثانی صاحبؒ اور حضرت مولانا واضح صاحبؒ) سے گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے، یہی وہ تعلق تھا جو ہمیشہ ابی کے پیش نظر بھی رہتا تھا۔

بے شک آج ابی ہمارے درمیان نہیں رہے اور ہم نے انہیں سپرد خاک کر دیا لیکن! ان کی یادوں کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے جو رہ رہ کر ذہن ودماغ میں ٹیس مارتا ہے۔ اب تو بس ہمارے سامنے ان کی شخصیت کے امتیازی پہلو ہیں، ان کی نیکیاں اور ان کے اخلاق حسنہ ہیں جن کے تذکرہ سے قلب وروح کو تسکین حاصل ہوتی ہے اور زندگی گذارنے کا سبق ملتا ہے۔ میری کوشش ہے کہ میں اس مختصر مضمون میں ابی کی شخصیت کے چند امتیازی پہلوؤں کا ذکر کروں:

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابی کی نشو ونما ایک ایسی نیک، دین دار اور شفیق ماں کے زیر سایہ ہوئی جن کے یہاں دین وشریعت کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہ تھا، دین کے مسئلہ میں نہ وہ مراعات سے کام لیتی تھیں اور نہ ہی کسی کو خاطر میں لاتی تھیں، اگر وہ خلاف شرع کوئی کام دیکھ لیتیں تو ان کی آخری درجہ کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور اس کی اصلاح کریں۔ خاص طور پر ہماری دادی کو غیبت سے سخت نفرت تھی، اگر ان کے سامنے کسی کی غیبت کا ایک لفظ بھی آجاتا تو وہ چراغ پا ہو جاتیں اور سخت تنبیہ کرتیں۔ ہماری دادی انتہائی اللہ والی خاتون تھیں، وہ ہمیشہ گریہ وزاری اور توبہ وانابت الی اللہ میں مشغول رہتی تھیں۔ انہیں نماز سے بہت سکون حاصل ہوتا تھا، ان کا معمول تھا کہ وہ مغرب اور عشاء کی نماز ایسے کمرے میں ادا کرتی تھیں جہاں عام طور پر گھر کا کوئی فرد نہ آتا جاتا ہوتا کہ بچوں کی آوازیں ان کی نماز اور ذکر وغیرہ میں خلل انداز نہ ہوں۔ ان کی عادت تھی کہ وہ روزانہ گوشہ تنہائی میں معتکف ہو جاتیں اور دیر تک نوافل اور الحاح وزاری میں منہمک رہتیں۔ بعض مرتبہ دعاؤں میں ان پر اس قدر گریہ طاری ہو جاتا کہ چیخیں نکل جاتیں اور اگر کوئی سن لیتا تو وہ ڈر جاتا، کئی بار ایسا ہوا کہ ان کے رونے کی آواز سن کر گھر والے خوف و دہشت میں ان کے پاس دوڑے ہوئے آئے مگر جب دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ محو دعا ہیں۔ ابی کی نشو ونما ایسی رابعہ صفت نیک وپارسا خاتون کی

☆ دائرۂ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں، رائے بریلی

گود میں ہوئی جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے اچھے اوصاف اور حسن اخلاق ابی کو ورثے میں ملے۔

ابا (حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) بتاتے تھے کہ جب ابی بچپن میں دہلی میں قرآن کریم حفظ کر رہے تھے تو اس وقت ابا وہاں ریڈیو کے شعبے میں اپنی خدمات پیش کر رہے تھے، ایک مرتبہ ابی اپنے ایک دوست کے گھر میں کھیلتے ہوئے چھت سے گر گئے، جب یہ خبر دادی نے سنی تو وہ فوراً مصلّٰی پر کھڑی ہوگئیں اور نماز ودعا وغیرہ میں مشغول ہوگئیں، لیکن اللہ کا فضل ہوا کہ جب ابا وہاں پہنچے تو انہوں نے ابی کو صحت وعافیت سے بخیر پایا۔

اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد ابا نے اپنے استاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے حکم کی تعمیل میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد ان کا تقرر ہوگیا۔ ابی بھی ان کے ساتھ آگئے اور ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے لگے، ابی نے ندوہ سے ہی اپنی تعلیم مکمل کی۔ ندوہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ابی لکھنؤ میں واقع مدرسہ عالیہ عرفانیہ کے استاد بن گئے، لیکن ان دنوں ہماری دادی تکیہ پر ہی مقیم تھیں، اس لیے کہ ان پر فالج کا اٹیک پڑ چکا تھا اور وہ صاحبِ فراش تھیں، ان کے لیے از خود نقل وحرکت بھی دشوار تھا۔ اسی لیے ابی نے اپنا یہ معمول بنالیا کہ وہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد مدرسہ میں پڑھانے کے لیے تکیہ سے لکھنؤ جاتے اور وہاں سے فارغ ہوکر سیدھے تکیہ آجاتے تھے اور پورا وقت اپنی والدہ کی خدمت ہی میں گزارتے، وہ خود ان کی خدمت کرتے، انہیں دوائیں کھلاتے اور خود ہی انہیں کھانا کھلاتے، بعض اوقات دادی کو کھانے کی بالکل خواہش نہ ہوتی، یہاں تک کہ وہ اپنا منھ بند کرلیتی تھیں لیکن اس کے باوجود ابی بھرپور کوشش کرکے کسی بھی طرح دادی کو کھانا ضرور کھلاتے، مگر آپ کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ کسی صورت بھی والدہ کی دل آزاری نہ ہو، بسا اوقات انہیں کھانا کھلانے میں کئی گھنٹے لگ جاتے، لیکن ابی کی یہ سعادت مندی تھی کہ وہ کبھی بھی پریشان نہ ہوتے اور نہ ہی ذرا بھی اکتاہٹ محسوس کرتے بلکہ وہ اس خدمت کا موقع کسی دوسرے کو دینا بھی پسند نہ فرماتے چاہے کوئی کتنا بھی اصرار کرتا۔ دادی تقریباً دو سال یا اس سے کچھ زیادہ مدت تک صاحبِ فراش رہیں لیکن اس پوری مدت میں ابی نے ان کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور نہ ہی ذرا بھی لاپرواہی برتی بلکہ وہ روزانہ اسی خاطر تقریباً اسّی کلومیٹر کا سفر طے کرکے لکھنؤ کا اپ ڈاؤن کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سردی کی شدت ہو یا گرمی کی تمازت ہو، ابی نے ہر موسم میں اپنا یہ معمول برقرار رکھا اور وہ اپنی والدہ کی ایسی مثالی خدمت کرتے رہے جس کی نظیر کم از کم اس دور میں ملنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دادی کی وفات ہوئی تو ہر جاننے والا ابی کے اس عمل کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور کہنے والوں نے یہ بات کہی کہ ہم نے ان سے زیادہ اپنی ماں کی اس طرح خدمت کرتے ہوئے کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ کو کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔ فرمایا: پھر کون سا عمل؟ آپ نے فرمایا: اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کون سا عمل محبوب ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: راہِ خدا میں جہاد۔

واقعہ یہ ہے کہ ابی نے اپنے والدین کے ساتھ ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد بھی سلوک کا حق ادا کردیا۔ وہ عمر بھر ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ برابر سلوک کرتے رہے، وہ ان کے لیے مسلسل دعائیں کرتے اور ان کے نام سے فقراء ومساکین میں خوب صدقہ وخیرات کا اہتمام کرتے، خاص طور پر انہوں نے اپنی والدہ کے نام سے ایک زمین بھی خریدی اور اس پر مسجد تعمیر کرائی تاکہ انہیں ثواب پہنچتا رہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص دنیا میں اللہ کے لیے گھر بنائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

دادی کی وفات کے بعد ابی پورے ہفتے لکھنؤ ہی میں رہنے لگے، بس جمعرات کو تکیہ تشریف لاتے اور وہ اپنا زیادہ تر وقت ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ابا (حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندوی) اور اچھے ابا (حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں گذارنے لگے۔ پھر جب ابا کا انتقال ہوگیا، تو ان کے بعد ابی نے اچھے ابا (حضرت مولانا رابع صاحب) کی ایسی مثالی خدمت کی کہ گویا انہوں نے حق ادا کردیا، اچھے ابا کو ابی سے اس قدر انس ومحبت ہوگئی تھی کہ ابی کا ندوہ میں ہونا ہی ان کے لیے باعث اطمینان ہوتا تھا، ہم خود اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ اچھے ابا کو ابی کی موجودگی سے کس قدر فرحت ومسرت ہوتی تھی۔ اللہ کا فضل ہے کہ اچھے ابا اس دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ ان کا دل اپنے سعادت مند بھتیجے کی جانب سے بے حد شاداں وفرحاں تھا۔

اسی طرح جب ابی کے چچا زاد بڑے بھائی مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی سخت بیمار ہوئے تو ابی نے ان کی بھی بہت خدمت کی، وہ ہمیشہ اسپتال میں ان کے ساتھ رہتے اور ان کی صحت سے متعلق تمام سہولیات کا انتظام خود ہی کرنے کی کوشش کرتے۔

حاصل یہ کہ ابی نے تمام عمر اپنے والدین، اپنے قریبی رشتہ داروں اور اپنے متعلقین کی خدمت میں گذاری۔ یہاں تک کہ وہ خود ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ظاہر ہے اللہ کا فیصلہ تھا جو نافذ ہو کر رہا، انا للہ و انا الیہ راجعون!

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابی نے عمر بھر اپنے خاندان کے بڑوں، چھوٹوں اور عوام الناس کی بے لوث خدمت کی، یہی وجہ ہے کہ ابی کی یہ خدمات ضرب المثل بن گئیں جو آج زبان زد خاص وعام ہیں۔ابی کے دل کو اپنے خاندانی اعزاء کی وفات سے گہرا صدمہ پہنچا تھا، اسی لیے ابی کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے والد، اپنے چچا اور اپنے بھائی کے تعلق والے احباب کا خصوصی لحاظ کرتے تھے، وہ ان کے ساتھ سلوک کرتے، ان کا خیال کرتے اور موقع بہ موقع انہیں ہدایا بھی بھیجتے تھے۔

نبی کریمؐ کا ارشاد ہے: سب سے بڑھ کر حسن سلوک یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے متعلقین کے ساتھ سلوک کرے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے ابی کی شخصیت میں اس حدیث کی عملی مثال پائی ہے۔ان کے اہل تعلق میں جن کو ان کے بڑے بھائی سے بڑا تعلق تھا، انہوں نے خود ہمیں یہ بتایا کہ تمہارے ابی اکثر ہمارے پاس آتے تھے، ہمارے پاس بیٹھتے تھے اور انہیں یہ خیال ہوتا تھا کہ کہیں ہم یہ محسوس نہ کریں کہ ان کے بڑے بھائی کی وفات کے بعد اب تعلقات ختم ہوگئے۔

ابی کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ان تمام حضرات سے گہری محبت اور اکرام کا تعلق رکھتے تھے جن کا ان کے والد، ان کے چچا اور ان کے بھائیوں کے ساتھ تعلق رہا ہو، وہ صحیح معنی میں صلہ رحمی کرتے تھے جس کی گواہی ہر فرد خاندان دیتا ہے۔ دراصل یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب سنت کا اتباع تھا۔حضرت خدیجہؓ نے آپ کی وصف بیانی میں فرمایا تھا کہ بلاشبہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں اور خود رسولؐ کا ارشاد ہے کہ رحم عرش سے معلق ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ جس نے مجھے جوڑا اس کو خدا جوڑے گا اور جو مجھے توڑے گا تو خدا اس کو توڑ کر رکھ دے گا۔

ابی اپنے رشتے داروں کا خصوصی لحاظ رکھتے تھے، خاص طور پر جو لوگ تنگ دستی کا شکار ہوتے تو وہ خفیہ طریقہ پر ان کی مالی امداد کرتے، مگر یہ سب ان کے اہل خانہ سے پوشیدہ رہتا، تاہم ابی جن لوگوں کے ساتھ بھی سلوک کرتے تھے، انہوں نے وفات کے بعد جب بتایا' تب اس کا علم ہوا، ورنہ خود ہم گھر والے بھی ان کے اس نیک عمل سے واقف نہ تھے۔

ابی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ غریبوں اور مسکینوں پر بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے تھے۔ان کی یہ خصوصیت ان کی وفات کے بعد مزید کھل کر ظاہر ہوئی، نہ جانے کتنے لوگوں نے آکر یہ بتایا کہ ان کے زیادہ تر اخراجات کا بار خوشی خوشی ابی ہی اٹھاتے تھے۔اگر کبھی ابی سے کوئی کہتا کہ سائل کو دیکھ لینا چاہیے کہ وہ ضرورت مند ہے بھی یا نہیں؟ تو وہ فرماتے کہ میں ان کا تعاون کرنے کا مکلّف ہوں، رہی یہ بات کہ وہ محتاج ہیں یا نہیں تو یہ اللہ ہی بہتر جانے۔ دراصل یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبوب سنت بھی ہے، آپ کا ارشاد ہے کہ مجھے کمزوروں میں تلاش کرو۔ خود اللہ کے نبی کے متعلق ان کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ہے کہ آپ بے روزگار کو کمانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

ابی ہمیں ہمیشہ یہ نصیحت فرماتے تھے کہ غریبوں اور مجبوروں کی مدد ضرور کرو، یہاں تک کہ جس روز ان کی وفات ہوئی اس دن بھی انہوں نے برادر عزیز مولوی محمد امین حسنی سلمہ سے کہا کہ یہ رقم فلاں کو دے دو، ان سے رابطہ کرو اور ان کو یہاں بلا کر کہو کہ تمہیں جتنی ضرورت ہو اتنا لے لو، برادرم امین نے جواب دیا کہ میں آپ کی یاد دہانی سے قبل ہی ان سے رابطہ کر چکا ہوں۔ یہ سن کر ابی کہنے لگے: اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے تمہیں یہ توفیق بخشی، یاد رکھو! غریبوں کا تعاون کرنے میں کبھی بھی پیچھے مت رہنا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابی کی وفات سے تھوڑی ہی دیر پہلے میں خود ان کے پاس بیٹھا تھا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا: اگر تم اپنے اوپر خرچ کرتے ہو تو تم یہ بھی معمول بنالو کہ اسی طرح تمہیں ضرورت مندوں پر بھی خرچ کرنا ہے۔

ابی کی ایک نمایاں خوبی ان کی مہمان نوازی کا ذوق بھی تھا، اللہ کے نبیؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ اور آخرت کے دن پر جو ایمان رکھتا ہو تو وہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ اگر دیکھا جائے تو ابی کی زندگی میں یہ وصف بہت نمایاں تھا، وہ جس کسی سے بھی ملتے تو اسے باصرار کھانے پر گھر آنے کی دعوت دیتے، کبھی ایسا ہوتا کہ وہ لکھنؤ میں ہوتے اور انہیں کسی مہمان کے متعلق علم ہوجاتا کہ وہ تکیہ جا رہا ہے تو ابی ہمیں فون کرکے تاکید سے کہتے کہ تم ان سے ضرور ملنا اور گھر لے جا کر کھانا بھی کھلانا۔ وہ کسی بھی مہمان کی آمد سے غیر معمولی خوش ہوتے تھے اور اس خوشی کے آثار ان کے چہرے سے صاف طور پر عیاں ہوتے تھے، بعض اوقات جلدی

میں ایسا بھی ہوتا کہ گھر کے اندر جو کھانا ماحضر ہوتا وہی پیش کردیتے مگر بڑی شرمندگی کے ساتھ، دیکھا جائے تو یہ بھی نبی اکرمؐ کی ایک محبوب سنت ہے۔ حدیث میں حضرت خدیجہ کی شہادت ہے کہ آپ مہمان نوازی خوب کرتے ہیں۔

ابی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ انتہائی متواضع تھے، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی اور پوری بشاشت کے ساتھ پیش آتے، یہ ان کی وہ عادت تھی جس سے وہ محبوب ومقبول بارگاہ انام بن گئے تھے، اللہ کے رسولؐ کا ارشاد بھی ہے کہ جو کوئی بھی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے گا تو اللہ اس کو رفعت و پرواز عطا فرمائے گا۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی اس محبوبیت ومقبولیت کا اندازہ ان کے جنازہ میں ایک جم غفیر کی شرکت سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ بات کہی کہ ہم نے آج تک کسی جنازے میں ایسی بھیڑ نہیں دیکھی۔ ابی نامور مفکر حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندوی کے اکلوتے فرزند اور مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے بھتیجے وداماد تھے پھر وہ ان کی وفات کے بعد ندوہ کے ناظر عام بھی منتخب کیے گئے مگر اس کے باوجود وہ بڑے متواضع تھے اور ہمیشہ ہر ایک سے انتہائی فرحت وانبساط کے ساتھ ملاقات کرتے تھے، یہاں تک کہ ندوہ کے خادمین وملازمین سے بھی وہ اس قدر بے تکلف تھے کہ ان کو ابی سے ملنے میں نہ کوئی جھجک محسوس ہوتی اور نہ کوئی ڈر بلکہ وہ بے خوف وخطر ان سے ملتے، ان کے سامنے اپنی ضروریات کا اظہار کرتے اور ابی ہمہ تن گوش ہوکر ان کی درخواست سنتے، انہیں تسلی دیتے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ اس سلسلہ میں نہ انہیں عہدہ ومنصب مانع ہوتا اور نہ ہی ان کی عالی نسبی حائل ہوتی۔ سچ یہ ہے کہ ابی کے دل میں ذرہ برابر انانیت کا شائبہ بھی نہ تھا، وہ ندوہ کے ایک بڑے منصب پر فائز تھے مگر اس کے باوجود وہ لکھنؤ رائے بریلی عموماً بس سے جانا پسند کرتے نہ کہ کار سے۔ وہ جب بھی تکیہ آتے تو پابندی سے ضرورت مندوں کی مدد کرتے، انہیں بازار لے جاتے اور ان کی ضروریات کے سامان خرید کر انہیں دیتے۔ حقیقت میں ابی اخلاق عالیہ اور تواضع کی انتہائی بلندیوں پر فائز تھے۔ اللہ کے نبیؐ کا ارشاد ہے کہ اہل ایمان میں سب سے کامل ترین مؤمن وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ سب سے کامل ترین ایمان والا وہ شخص ہے جو خوش اخلاق ہو، لوگوں کے لیے اپنے کاندھے بچھا کر رکھتا ہو، وہ لوگوں سے محبت کرتا ہو اور اس سے محبت کی جاتی ہو۔ یہ بھی آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب ومقرب وہ شخص ہے جو حسن اخلاق کا حامل ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ابی نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور سے روشنی حاصل کی اور ان کے اخلاق کو اپنی زندگی میں اپنایا اور انہوں نے یہ حقیقت جان لی کہ اللہ کی خوشنودی اور اس کے رسول کی محبت اخلاقِ عالیہ سے لیس ہوکر ہی مل سکتی ہے، حقیقت میں اللہ کے نبیؐ نے مکارم اخلاق کو بعثت کا ایک بنیادی مقصد بتایا ہے، اسی لیے ابی نے خود اسلام کے رنگ میں اپنے اخلاق کو ڈھالا تھا اور اخلاقِ نبوی سے آراستہ کیا تھا۔ بعض طلبہ نے اپنے مضامین میں لکھا ہے کہ ہم ان سے ایسا کوئی سوال کرتے جو ہمارے ذہن میں ہوتا تو وہ بغیر تردد کے جواب عنایت فرماتے، چاہے ہم درجہ میں سوال کرتے یا راستے میں، مگر مولانا نہ ہمیں ڈانٹتے اور نہ ہی ناگواری کا اظہار فرماتے بلکہ انتہائی پرسکون اور نرم لہجے میں جواب مرحمت فرماتے۔ ابی کے مضامین ومقالات سلیس اسلوب میں ایک امتیاز رکھتے ہیں اور ان کے دروس بھی ان کی فکر سلیم اور اصابت رائے کے شاہد عدل ہیں۔ اسی طرح ان کے انٹرویوز بھی ان کی گہری بصیرت کے غماز ہیں جو ان کو اپنے والد وچچا اور مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی صحبت میں رہ کر حاصل ہوئی تھی۔

ابی کی ایک نمایاں صفت لباس اور کھانے پینے میں ان کی غیر معمولی سادگی تھی۔ انہیں بہت زیادہ مرغن کھانوں کا کوئی شوق نہ تھا، ان کی عادت تھی کہ دستر خوان پر جو آجاتا وہ کھالیتے اور کبھی بھی کھانے میں عیب نہ نکالتے، جب انہیں شوگر ہوئی تب سے وہ کھانے پینے میں بہت زیادہ محتاط ہوگئے تھے اور قوت لایموت گویا ان کی عادت ہوگئی تھی۔

ابی کو بہت زیادہ عمدہ لباس زیب تن کرنے کا بھی کوئی شوق نہ تھا، عام طور پر وہ بس عیدین کے موقع پر ہی نئے کپڑے خریدتے بلکہ ابا اور اچھے ابا کی وفات کے بعد زیادہ تر ان ہی کے کپڑے پہن لیتے تھے۔ میں نے ہمیشہ ابی کو یتیموں، مسکینوں، پریشان حال لوگوں اور ضرورت مندوں کے سلسلہ میں حد درجہ فکرمند پایا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی فکر میں وہ اس حد تک گھل رہے ہیں کہ گویا بستر ان کو کاٹ رہا ہو اور وہ ایسے پریشان رہتے تھے کہ کسی کروٹ چین نہ آتا تھا۔ ان کا حال یہ ہوگیا تھا کہ نہ انہیں کھانا اچھا لگتا تھا اور نہ پینے میں کوئی مزا آتا تھا۔

ابی اپنے والد کے ہاتھ کی گھڑی پہنا کرتے تھے، ایک دن مجھے خیال ہوا، تو میں نے ابی کے لیے ایک نئی گھڑی خرید کر پیش کی اور میں نے ابی سے عرض کیا کہ اگر آپ یہ نئی گھڑی پہن لیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ ابی نے مجھ سے وہ گھڑی لے لی اور دو دن تک

پہنے رہے، پھر تیسرے دن انتہائی شفقت ومحبت آمیز لہجے میں کہنے لگے کہ یہ لو! اب میں تمہیں یہ گھڑی ہدیہ کرتا ہوں۔اس لیے کہ میرے پاس ابا کی گھڑی موجود ہے، میں اسے استعمال کرتا آیا ہوں اور مجھے اس کے بدلنے کی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی، حالانکہ اس گھڑی کے ڈائل میں پانی بھی جاچکا تھا مگر اس کے باوجود وہ اسی کو بار بار ٹھیک کروا کر پہنے رہتے تھے اور اس کو بدلنا پسند نہ کرتے تھے۔

سلام میں پہل بھی ابی کی خاص عادت تھی، ان کے سامنے جو آجاتا وہ اس کے سلام کرنے سے پہلے ہی سلام کرنے کی کوشش کرتے، ایسا کئی بار اتفاق ہوا کہ ہم ان کے ساتھ موٹر سائیکل پر کہیں جارہے ہیں اور ہم کو کسی نے سلام کیا، تو ابی اس کو بلند آواز میں اور اس سے بڑھ کر الفاظ میں جواب دیتے اور اگر میں آہستہ آواز میں جواب دیتا تو تنبیہ فرماتے اور یہ نصیحت کرتے کہ ہمیں اس قدر بلند آواز میں سلام کا جواب دینا چاہیے جو سامنے والا بہ آسانی سن سکے بلکہ زیادہ تر وہ یہی تاکید کرتے کہ ہمیں سلام میں پہل کرنا چاہیے، وہ خود بھی بلند آواز میں سلام کرتے تھے، مجھے یاد نہیں کہ کسی نے انہیں سلام کیا ہو اور انہوں نے اس کا جواب نہ دیا ہو، صرف یہ نہیں بلکہ وہ اس سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ بھی کرتے اور اس کے حال احوال دریافت کرکے ہی آگے بڑھتے۔

جب بھی ابی میرے ساتھ بائک پر پیچھے بیٹھتے تو وہ مجھ سے فوراً یہ ضرور پوچھتے کہ تم نے سفر کی دعا پڑھی یا نہیں؟ ان کی توجہ کے بعد میں دعا پڑھ لیتا، مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی مجھے دعا پڑھنے کے لیے ٹوکا نہ ہو، وہ مجھ سے کہتے تھے: جب کبھی بھی تم موٹر سائیکل یا بس اور کار وغیرہ پر سوار ہو تو دعا پڑھنے کا اہتمام ضرور کرو۔

یہ بھی ابی کی ایک امتیازی خصوصیت تھی کہ وہ بلا تفریق ہر بیمار کی عیادت کرتے تھے، چاہے وہ ان کا قریبی رشتے دار ہو یا اس سے کوئی تعلق بھی نہ ہو۔ برادر عزیز مولوی محمد میاں سلمہ فرزند خالو میاں (مولانا عبد اللہ حسنی ندویؒ) لکھنؤ میں ہی رہتے ہیں، انہوں نے مجھے بتایا کہ ابی ہر بیمار کی عیادت کا اہتمام کرتے تھے اور اگر محلّہ میں کسی کی وفات ہوجاتی تو اس کے جنازہ میں ضرور شرکت کرتے، اس سلسلہ میں ان کے یہاں شناسا اور غیر شناسا افراد کے مابین کوئی تمیز نہ تھی، جس دن رائے بریلی تشریف لائے اسی دن محلّہ میں ایک مسلمان الیکٹریشین جل گیا تھا اور اسپتال میں ایڈمٹ تھا، آنے سے پہلے ابی اس کی عیادت کے لیے گئے، اس کی مزاج پرسی کی، اور تعاون کیا اور وہاں سے رائے بریلی تشریف لائے، ہم سب بھائیوں کو بھی ابی یہی تاکید کرتے تھے کہ ہم بیماروں کی مزاج پرسی ضرور کریں اور جنازوں میں جایا کریں۔ایک مرتبہ میدان پور میں کسی کا انتقال ہوا جن کے فرزند کسی زمانہ میں ابی کے بھائی کے ڈرائیور تھے، جب ان کے والد کی وفات کا علم ابی کو ہوا تو وہ لکھنؤ سے تکیہ اسی جنازہ میں شرکت کی نیت سے آئے اور تدفین سے فارغ ہوکر اسی وقت لکھنؤ واپس چلے گئے۔

ابی کو قرآن مجید سے غیر معمولی تعلق وشغف تھا، اللہ نے ابی کو انتہائی خوبصورت ودل کش آواز سے بھی نوازا تھا، وہ تکیہ کی مسجد میں نماز تراویح پڑھاتے تھے، تو لوگ دور دراز سے ان کی اقتداء میں تراویح پڑھنے آتے تھے۔ابی کہتے تھے کہ مجھے شیخ عبد الباسط عبد الصمد کی قراءت بے حد پسند ہے اور مجھے ان سے اتنا تعلق ہے کہ میں نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! ان کی زیارت سے پہلے مجھے موت نہ دینا۔اللہ نے ان کی یہ دعا قبول کی، ایک موقع پر شیخ عبد الباسط عبد الصمد ندوہ تشریف لائے تو ابی کہتے ہیں کہ میں نے ان کی براہِ راست تلاوت سنی، گویا وہ دن ان کے لیے عید کے دن سے کم نہ تھا۔ابی ہم بھائیوں کو مخارج کی تصحیح کرنے پر بڑا زور دیتے تھے، ہماری تلاوت سنتے تھے اور غلطیوں پر نشان دہی کرتے تھے اور اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ ہم لوگ مصری قراء کی قرأت سنا کریں۔

قرآن مجید پر ابی کی گہری نظر تھی اور اچھا مطالعہ تھا، وہ قرآن کی آیات سے ایسے استدلالات کرتے تھے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: "الرَّحْمَن، عَلَّمَ الْقُرْآنَ" (رحمٰن نے قرآن سکھایا) فرمایا کہ اس آیت میں اللہ نے تعلیم القرآن سے پہلے اپنی صفت رحمت کا ذکر کیا ہے جس سے حفظ اور قرآن وعلوم قرآن کے اساتذہ کو ایک سبق ملتا ہے کہ انہیں بھی اسی صفت رحمت سے متصف ہونا چاہیے۔

ابی نے اپنی وفات سے ایک دن پہلے ہی مجھ سے کہا کہ اس زمانہ میں مذہبی علماء اور عصری دانشوران کے درمیان ایک بڑی خلیج نظر آتی ہے اور اس کا بنیادی سبب دونوں طرف سے عدم برداشت کا مرض ہے۔علمائے دین عصری علوم کی اہمیت وافادیت کے معترف نہیں ہیں، حالانکہ اس میں شبہ نہیں کہ دیگر اقوام تک اسلامی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت میں وہ علوم بھی ایک اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔اسی طرح عصری دانشوران بھی مذہبی علوم کی اہمیت کے سختی سے منکر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دن بدن ان دونوں طبقوں کے درمیان خلیج بڑھتی جارہی ہے اور یہ خلیج دشمنان

اسلام کے لیے غنیمت ثابت ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ان دونوں طبقوں کے درمیان کی خلیج کو زیادہ سے زیادہ پاٹنے کی کوشش کریں۔

ابی کا امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کی بہترین تربیت کی، انہوں نے دین کی بنیاد پر اپنے بچوں کی تربیت کی اور وہ تعلیم دی جو دنیا وآخرت میں ان کے کام آئے، مجھے یاد ہے میں بہت چھوٹا تھا، میری عمر تقریبا پندرہ سال تھی، عید کا دن تھا عیدی ملی تھی، میں نے اپنے ایک جاننے والے سے گھڑی منگوالی، ابی نے گھڑی دیکھی، پوچھا کہاں سے آئی، میں نے کہا عیدی ملی تھی اس سے منگوائی ہے، ابی نے گھڑی لی اور میری نگاہوں کے سامنے اس کو اینٹے سے توڑ دیا اور یہ سبق دیا کہ ہر پسند آنے والی چیز کے پیچھے بھاگا نہیں جاتا، اسی طرح ایک مرتبہ میں نے فیروز بھائی سے کشمیری گرم کپڑا جو وہ ٹھنڈ سے حفاظت کے لیے پہنتے ہیں منگوالیا ابی کو معلوم ہوا تو سخت ناراض ہوئے اور اس کے استعمال پر پابندی لگادی، ان دو واقعات نے میرے اوپر لگام لگادی، وہ عام طور پر دسترخوان پر بیٹھے ہوتے اور ہمیں آداب زندگی وآداب معاشرت کی تعلیم دیتے، فرماتے: علم اور عمل ایک ہی سائیکل کے دو پہیے ہیں جن کے بغیر سائیکل نہیں چل سکتی، اس لیے انسان کو علم اور عمل دونوں زیور سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ گھر کے بچوں کو ان کے مفوضہ کاموں سے روگردانی کرتے ہوئے دیکھ لیتے تو ان کے سرپرستوں کو مخاطب کر کے فرماتے کہ نیکی کے کاموں میں مسابقت اس وقت زیادہ آسان ہوجاتی ہے جب ہمارے ذہن میں اس کے اجر وثواب کا خیال ہو اور اگر یہ خیال نہ ہو تو بڑی دشواری پیدا ہوجاتی ہے، تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ نیک کاموں کا اجر وثواب دوسرے لے جائیں؟ ان کی اس نصیحت سے خیر کے کاموں پر عمل کرنا بڑا آسان ہوجاتا تھا۔

تکیہ میں ہمارے گھر آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، ہمارے یہاں عام طور پر یہ معمول ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے ہیں، لیکن ابی اس سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔ اسی طرح فجر بعد سونے پر بھی ابی بہت غصہ ہوتے تھے، رات میں بےضرورت جاگنے، گپ شپ کرنے اور لہو ولعب میں لگنے سے ان کو سخت نفرت تھی۔ ابی کو دوپہر کے وقت میں بچوں کا باہر کھیلنا بھی بالکل پسند نہ تھا، وہ اکثر یہ کہتے تھے کہ یا تو بچے اپنے گھروں میں آرام کریں یا وہ گھر میں ہی کھیلیں مگر باہر نہ نکلیں۔

جب ندوہ میں ابا (مولانا واضح صاحب) معتمد تعلیم تھے اور ابی مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں استاد تھے، اس وقت میں ندوہ میں زیر تعلیم تھا، ایک دن میں ابا کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ابی نے مجھے دیکھ لیا تو فرمایا: خالی گھنٹے میں تم ابا کے پاس مت آیا کرو، اس لیے کہ وہ ندوہ میں معتمد تعلیم ہیں، اس دوران اگر گھنٹے میں استاد نے آکر تمہارے متعلق معلوم کیا تو ممکن ہے کہ ان کو کچھ محسوس ہو اور ان کا یہ محسوس کرنا تمہارے لیے نقصان کا سبب نہ بن جائے۔

ابی کی ایک سب سے بڑی خوبی ان کی کفایت شعاری تھی، اکثر وبیشتر نصیحت کرتے تھے کہ ہم لوگ تعیش پسند نہ بن جائیں اور بےضرورت آرائش وزیبائش نہ اختیار کریں اور نہ ہی بلاضرورت ہر شوق کی چیز خریدیں، انتقال سے کچھ دن قبل جب کہ ٹھنڈ اپنے شباب پر تھی ابی کو جیکٹ کی ضرورت تھی، میرا بھائی امین اپنے لیے جیکٹ لایا تھا اس کی جیکٹ دیکھ کر پوچھا جیکٹ اچھی ہے مجھے بھی ضرورت ہے، کتنے کی خریدی، اس نے قیمت دو ہزار بتائی تو فرمایا، بہت مہنگی ہے، اور اگلی جمعرات کو ابی نے لکھنؤ سے اس سے آدھی قیمت پر جیکٹ خریدی، ابی خرید سکتے تھے، مگر اپنے اوپر خرچ کرنا ابی نے سیکھا ہی نہیں تھا، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر تم کوئی چیز خریدو تو اس کی قیمت کسی کے سامنے نہ بتاؤ، ہوسکتا ہے کہ جس کے سامنے تم بیان کرو، شاید وہ اس کو خریدنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور تمہارے بتانے سے اس کی دل شکنی ہو، میرے دادا مولانا واضح رشید حسنی ندوی ہم کو پیسے دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ کسی مستحق کو اپنے فرزند کے ہاتھ سے دلوانا کیوں کہ اس سے بچپن سے دینے کی عادت بنتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ دینے اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کی عادت ابی کی بچپن سے ہی بنی تھی۔ وفات سے ایک دن پہلے کی بات ہے، مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارے پاس کتنے گرم کپڑے ہیں؟ میں نے کہا: دو جوڑی ہیں۔ فرمایا: اگر یہ ضرورت سے زائد ہوں تو کسی غریب کو دے دو پھر مزید زور دے کر یہی ہدایت دوبارہ فرمائی۔

ابی کی ایک نمایاں خوبی بچوں کے ساتھ ان کی شفقت تھی، بچے ان سے بڑے مانوس تھے اور وہ بھی بچوں کو بہت مانوس رکھتے تھے، ابی جب بھی گھر سے مسجد جاتے اور کسی بچے کو دیکھ لیتے تو اس سے مسکرا کر بات کرنا شروع کر دیتے، اس کو سلام کرتے اور شفقت سے پیش آتے

ابی خوشی کے مواقع پر اللہ کے ایک شکر گزار بندے تھے اور مصیبت کے مواقع پر ایک صابر بندے، میں نے ان کے صبر کی انتہا اور توکل علی اللہ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، گھر میں بیٹی کی ولادت ہوئی اور دو دن بعد اس کا انتقال ہوگیا، اس موقع پر ابی نے جس صبر جمیل کا مظاہرہ کیا وہ ایک مثال ہے۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ غم

گساری کرتے اورانہیں صبر کی تلقین کرتے تھے۔
واقعہ یہ ہے کہ ابی کی یادوں کو اس مختصر مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ایک مثالی انسان، مثالی باپ، مثالی شوہر، مثالی معلم، مثالی مربی، مثالی مصنف اور مثالی و متواضع بندہ کھودیا ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ سلوک کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، دوستوں کے ساتھ سلوک میں اپنی مثال آپ تھے، بچوں کے ساتھ شفقت برتنے میں اپنی مثال آپ تھے، بڑوں کا ادب کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، سادگی و تواضع میں اپنی مثال آپ تھے، اصحابِ منصب وثروت سے دوری بنانے میں اپنی مثال آپ تھے، دنیا کی چمک دمک اور اس کی زرق برق سے دوری بنائے رکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ گواہی دی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلہ رحمی کرتے تھے، ناتواں کا بوجھ اٹھاتے تھے، مہمان نوازی کرتے تھے، حق کے مواقع پر مدد فرماتے تھے۔ میں بھی اپنے تجربہ کی روشنی میں یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ میرے ابی مذکورہ صفات سے حسب امکان پوری طرح متصف تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگوں میں انتہائی مقبول تھے۔
اللہ ابی کو کروٹ کروٹ چین نصیب فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہمیں صبر جمیل کی دولت سے نوازے۔
سچ تو یہ ہے کہ جب ابی اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ گویا پوری دنیا ہماری نگاہوں میں تاریک ہوگئی ہو اور زمین ہمارے پیروں کے نیچے سے کھسک گئی ہو، لیکن ہمیں تو بس وہی بات اپنی زبان سے نکالنا ہے جس کا ہمارے رب نے ہمیں حکم دیا ہے اور جس کی تربیت ہمارے ابی نے تا عمر کی ہے اور ہمارا مزاج بنایا ہے کہ بلاشبہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی جانب ہم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسا خسارہ ہے جس کی تلافی مشکل ہے۔ ہمیں اللہ سے امید ہے کہ وہ ابی کو اپنی رضا و مغفرت کا پروانہ نصیب کرے گا، اللہ تعالیٰ جانے والوں کی مغفرت فرمائے اور جو زندہ ہیں ان کو صحت وعافیت کے ساتھ باقی رکھے۔ قارئین کرام سے بھی پرخلوص دعاؤں کی گذارش ہے۔

☆☆☆☆☆

..........بقیہ صفحہ ۱۲۲ کا

سیرت پر گہری گرفت تھی، تقریر وتحریر کے شہسوار تھے، حالات حاضرہ پر اچھی پکڑ تھی، ان کی تحریر علمی و ادبی حلقوں میں شوق سے پڑھی جاتی تھی، لکھنے کے دھنی تھے، جس موضوع پر بھی لکھتے تھے، اس کا پوری طرح سے حق ادا کر دیا کرتے تھے۔
حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ عربی زبان وادب کے ماہر تجربہ کار استاد اور انشاء پرداز تھے، حضرت مولانا کو عربی اردو اور انگلش پر عبور حاصل تھا، مولانا نے کئی سالوں تک دار العلوم ندوۃ العلماء کی شاخ نخاس اکبری گیٹ پر واقع مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں چالیس سال تک درس و تدریس سے وابستہ رہے، تفسیر وحدیث وادب عربی اور فکر اسلامی موضوع تھا، حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے سبکدوش ہوکر مادر علمی کے تعمیر وترقی میں اہم خدمات انجام دے رہے تھے، حضرت کے شاگردوں کی تعداد لاکھوں میں ہے، جو ملک و بیرون ملک میں پھیلی ہوئی ہے، حضرت کے انتقال سے مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء ایک بہتر ناظر عام اور دورس نگاہ کے مالک شخصیت سے ہمیشہ ہمیش کے لیے محروم ہوگئی، ندوہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے آمین۔
حضرت مولانا کی ولادت ۱۳؍ ستمبر ۱۹۶۵ء رائے بریلی کے تکیہ گاؤں اتر پردیش میں ہوئی اور وہیں مدرسہ ضیاء العلوم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور حفظ قرآن کریم مکمل کیا، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا، عالمیت ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت کی سند سے سرفراز ہوئے، عصری تعلیم کے لیے ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان وادب میں ایم اے عربی مکمل کیا، اس کے بعد ۱۹۹۰ء جامعہ الملک سعود یونیورسٹی سے ریاض سے درس وتدریس میں ٹریننگ کی، اس کے بعد وطن عزیز لوٹ گئے۔
حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین صاحبزادے خلیل حسنی ندوی، امین حسنی ندوی، عبدالحی حسنی ندوی اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہے، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا بلال حسنی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی، مولانا کی تدفین جمعرات کے دن ظہر کی نماز کے بعد تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہزاروں فرزدان توحید کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا، اللہ عزوجل سے دعاء ہے کہ پسماندگان اور ندوہ کے طلباء واساتذہ کو صبر جمیل دے اور محبین و متعلقین کو دین اسلام پر ثابت قدم رکھے اور مادر علمی کو ان کا نعم البدل عطا کرے حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ کی بال بال مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے اور شہادت کا درجہ نصیب کرے، آمین۔

☆☆☆☆☆

ہمارے استاذ محترم کی باتیں

محمد معین الدین ندوی قاسمی ☆

ہمارے ملک میں تین مرکزی ادارے ہیں، بحمد اللہ راقم الحروف کو دو مرکزی ادارے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور پھر دارالعلوم دیوبند میں کسب فیض کا شرف حاصل ہوا۔

مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنے سے قبل پارک نگری کے مشہور ومرکزی ادارہ مدرسہ عالیہ عرفانیہ (مخزن العلوم) چوک میں تین سال وہاں کے اہل فضل وکمال اساتذہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔

مدرسہ ہذا میں دو تین ایسے اساتذہ تھے جن سے تینوں سال درسی کُتب متعلق رہیں، انہیں میں ایک خانوادہ علم اللہی کے چشم وچراغ استاذ محترم حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ بھی تھے۔

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ مدرسہ ہذا کے اساتذہ کرام میں سے ایک باکمال اور اہل فضل وکمال علماء گر استاذ تھے، اسی کے ساتھ ساتھ مشہور بزرگ عارف باللہ حضرت مولانا احمد پرتاپ گڑھی رحمہ اللہ کے لخت جگر حضرت قاری مشتاق صاحب رحمہ اللہ کے نورِ نظر تھے۔

حضرت قاری مشتاق صاحب رحمہ اللہ کی نرالی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، آپ رحمۃ اللہ علیہ شاید وباید ہی کسی کو خاطر میں لاتے تھے، سوائے معدودے چند اہی چند معزز شخصیات میں ایک حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ بھی تھے۔

حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کی نگاہ میں حضرت مولانا حسنی ندویؒ کی بڑی قدر ومنزلت تھی جب بھی مولانا رحمہ اللہ کو یاد کرتے تو فرماتے ”مولوی جعفر صاحب“ کو بلاؤ! یہ سابقہ صرف مولانا حسنی ندویؒ کے نام کے ساتھ لگتا تھا ورنہ قاری صاحب رحمہ اللہ کی زبان پر سابقہ ولاحقہ کچھ نہیں تھا، ہمارے سبھی ابنائے عالیہ عرفانیہ اس سے واقف ہیں۔

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ سے راقم الحروف کو تین اہم کتابیں: ۱-”منثورات“ (حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ)، ۲-”مختارات ثانی“ (مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قدس سرہٗ) اور ۳-تیسری کتاب ”مشکوٰۃ المصابیح“ پڑھنے کا موقع ملا۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کم گو انسان تھے، وقت کے مکمل پابند تھے، گھنٹہ شروع ہوتا تشریف لاتے اور گھنٹہ مکمل ہونے کے بعد تشریف لے جاتے، دوران درس کبھی یہاں وہاں کی باتیں نہیں کرتے تھے، صرف اسباق سے متعلق گفتگو کرتے، مشکوٰۃ شریف کے درس میں احادیث نبویہ کو حالات حاضرہ سے بھی تطبیق کرتے، اور پھر احادیث نبویہ پر عمل کے لیے بھی خوبصورت انداز میں ہم طلبہ کو ابھارتے تھے، سادہ اور سہل وفہم زبان استعمال کرتے تھے، پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ درس دیتے تھے چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتے تھے ایسا معلوم ہوتا کہ لبوں سے پھول جھڑ رہا ہے، ملک سے معروف ومشہور خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن کبھی نسب وحسب کی باتیں زبان پر نہیں لاتے تھے، تعلّی اور خودستائی سے کوسوں دور تھے، عاجزی اور انکساری کے سراپا تھے۔

حضرت مولانا حسنی ندویؒ سے ہم طلبہ عالیہ عرفانیہ درسگاہ کے علاوہ بھی استفادہ کرتے تھے اور مولانا بھی خندہ پیشانی کے ساتھ ہم طلبہ کو جدید عربی تعبیرات کی رہنمائی کرتے تھے، راقم الحروف عالیہ اولیٰ وعالیہ ثانیہ دونوں سال مولانا رحمہ اللہ سے آزاد انشاء وتعبیرات میں خوب استفادہ کیا، ہمارے کچھ ساتھی عصر بعد ”خاتون منزل“ جہاں مولانا رحمہ اللہ کا قیام تھا وہاں جا کر جدید تعبیرات سیکھتے تھے۔

مولانا رحمہ اللہ پاکباز وپاک طینت اور ہنس مکھ انسان تھے ہم لوگ پڑھنے لکھنے سے متعلق جو کچھ بھی دریافت کرتے بڑے خوش اسلوبی سے جواب دیتے تھے، ایک مرتبہ فدوی نے دریافت کیا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو کعبہ شریف کی چابی دی گئی تھی: مولانا مسکرائے (آج بھی مسکراہٹ آنکھوں کے سامنے ہے) اور فرمایا: ہاں مولانا رحمہ اللہ کو کعبہ کی چابی دی گئی تھی اور وہ اپنے مالک کے گھر گئے تم لوگ کچھ بنو، تم لوگ مولانا رحمہ اللہ جیسی محنت کرو، صرف ان کے نام لینے سے کچھ نہیں ہوگا، ان کے جیسے بننے کی کوشش کرو، تم بھی کلید کعبہ بردار بن سکتے ہو۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کو مدرسہ عالیہ عرفانیہ، اس کی در ودیوار اور اس کے طلبہ سے اٹوٹ محبت تھی، مجھے نہیں لگتا تھا کہ مولانا عالیہ عرفانیہ کو الوداع کہیں گے؛ لیکن پے در پے حسنی خانوادہ کے کئی مقتدر شخصیتیں رخصت ہوگئیں اسی وجہ سے چار وناچار آپ عالیہ عرفانیہ چوک سے رخصت ہوئے۔........

..............بقیہ صفحہ ۱۳۷ پر

☆ حیدرآباد

ابی - کچھ یادیں کچھ باتیں

محمد امین حسنی ندوی ☆

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اپنی سادگی، متانت، خلوص، تواضع اور خدمت کے جذبہ سے لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتی ہیں اور اگر اسی کے ساتھ ان کے اندر علم کی گہرائی، فکر کی وسعت، زبان کی شیرینی اور بیان کی قدرت اور فکر و نظر کی بلندی بھی شامل ہو تو وہ شخصیات لوگوں کے دلوں میں بس جاتی ہیں۔ انہی شخصیات میں ایک بڑی اور ہر دل عزیز شخصیت ہمارے ابی مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ کی بھی تھی۔

ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے بلکہ اس پر ایمان ہے کہ قضاوقدر اللہ کی طرف سے ہے۔ کب جانا ہے؟ کیسے جانا ہے؟ اس کا علم صرف اللہ رب العزت کو ہے۔ انسان کو بس اتنا معلوم ہے کہ ہر نفس کو اس دنیائے فانی سے دار بقاء کا سفر طے کرنا ہے، ارشاد خداوندی ہے، کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام، اس دنیائے فانی میں جو بھی آیا اس کو موت کا جام پینا ہے، بقاء صرف ذات خداوندی کو ہے، اور آپؐ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں یاد دلایا ہے، کن فی الدنیا کأنک غریب او عابر سبیل، دنیا میں اس طرح رہو جیسے ایک اجنبی، یا ایک مسافر رہتا ہے، دوسری حدیث میں آپؐ نے دنیائے فانی کو آخرت کی کھیتی قرار دے کر یہ یاد دلایا کہ جو یہاں بوگے آخرت میں کاٹو گے، خوش بخت ہیں وہ لوگ جو دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتے ہیں اور اس احساس کے ساتھ دنیا میں جیتے ہیں کہ یہاں کے اعمال کا احساب ان کو آخرت میں خداوند قدوس کے سامنے دینا ہے، یہاں کی کھیتی وہاں کاٹنا ہے، ان کی نگاہوں کے سامنے یہ حدیث نبوی رہتی ہے، اکثروا ذکر ھادم اللذات یعنی الموت، لذتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کرو، کیوں کہ یہ دنیا ایک عارضی قیام گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابی کا جو وقت طے کیا تھا اس وقت پر وہ اس فانی دنیا سے ابدی دنیا کی طرف منتقل ہوگئے: إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، إن للہ ما أخذ ولہ ما أعطی و کل شئ عندہ بأجل مسمی.

ابی کی حیات مستعار تعلیم وتعلم، اخلاق، تواضع، للّٰہیت، خلوص اور خدمت خلق سے عبارت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے ماں باپ عطا فرمائے جن کی دعائے نیم شبی نے ان کی شخصیت سازی میں بڑا کردار ادا کیا۔ اسی کے ساتھ ان کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا قرب ملا، ان کی محبتیں اور ان کی توجہات ملیں، اور ان کی دعائیں ملیں۔ پھر آخری دور میں ان کے چچا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ایسی توجہات وعنایات ملیں جن کے نتیجہ میں ابی کے اندر وہ تواضع اور اخلاق کی بلندی پیدا ہوئی جس نے ہر خاص وعام کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس بنیادی صفت کا ذکر ملتا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

"وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ". [القلم: ٤] (اور یقیناً آپ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ" [آل عمران: ۱۵۹] (بس اللہ ہی کی رحمت تھی کہ آپ نے ان کے ساتھ نرمی فرمائی اور اگر آپ تند خو سخت دل ہوتے تو وہ آپ کے پاس سے کب کے منتشر ہوگئے ہوتے)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپؐ کے اخلاق کیسے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"کان خلقہ القرآن" (یعنی قرآن مجید آپ کے اخلاق کی منہ بولتی تصویر ہے)۔

انسان کے اندر حسن اخلاق کی صفت اگر موجود ہے تو کم علمی اور کم حیثیت کے باوجود لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالیتا ہے اور اگر اخلاق کی بلندی اور اور تواضع کی صفت نہ ہو تو جتنا بڑا عالم ہو وہ لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ نہیں بنا پاتا، آپؐ سے یہ دعا منقول ہے، اللھم اجعلنی فی اعینی صغیراً وفی أعین الناس کبیراً (اے اللہ مجھے میری نگاہوں میں چھوٹا اور دوسروں کی نگاہوں میں بڑا بنادے)۔ ابی کی جو سب سے بڑی صفت تھی وہ ان کے اعلیٰ اخلاق تھے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابی نے حضور اکرمؐ کی سیرت پاک کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ ادھر چند برسوں سے ابی شمائل ترمذی کا درس بھی دے رہے تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ابی کا یہ مزاج دیکھا، وہ احادیث کو یاد کرتے تھے اور ان کی روشنی میں اپنی زندگی کا جائزہ

☆ دائرۂ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں، رائے بریلی

لیتے تھے۔ وہ کوشش کرتے تھے بلکہ گھر میں ہم لوگوں سے متعدد مرتبہ یہ کہتے کہ اپنے اندر اخلاق کی صفت پیدا کرو۔ ان کے ہاں امیر وغریب، چھوٹا بڑا، صاحب منصب اور عام انسان کے درمیان کوئی تفریق اور امتیاز نہیں تھا، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، اس کی باتوں کو توجہ سے سنتے، اور حتی المقدور اس کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتے اس کو عزت دیتے، ارشاد نبوی ہے: ابغونی فی الضعفاء، مجھے معاشرہ کے کمزور طبقہ میں تلاش کرو، کتنے ایسے ستم رسیدہ، بدحال اور معاشرہ میں اعتناء اور توجہ کے قابل نہ سمجھے جانے والے تھے جن سے عام طور پر لوگ ملنے سے کتراتے ہیں، سامنا ہونے پر پہلوتہی کرتے ہیں، مخاطب کرنے پر رسمی جواب دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں، ابی ان سے ملتے، ان کو عزت دیتے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے، ان کی پریشانی کا مداوا کرتے اور ان کے ساتھ اسلامی اخوت ومحبت کا معاملہ کرتے۔ ان کے پیش نظر یہ دعا تھی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی تھی: "اللّٰھم أحینی مسکیناً وتوفنی مسکیناً واحشرنی فی زمرۃ المساکین." [أخرجہ الطبراني في الدعاء] (اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ اور مجھے مسکین بنا کر ہی موت دے اور مجھے مسکینوں ہی کے زمرے میں اٹھا)۔

ابی کا مزاج جد محترم حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت قریب تھا۔ ابی پہلے تقریر نہیں کرتے تھے، پروگراموں سے دور رہتے تھے، دیکھا جائے تو ابی کی زندگی گھریلو تھی کیوں کہ ان کو جس بات کی سب سے زیادہ فکر تھی وہ یہ کہ اپنی اولاد کی تربیت میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ ہو۔ اسی لیے جس قدر فکر ابی کے ہاں اپنی اولاد کی تھی میری نظر میں کم لوگ اپنی اولاد کے لیے اس قدر حساس ہوتے ہیں۔ جب ہم لوگ تعلیم حاصل کر رہے تھے تو اگر کسی نے ذرا سا بھی آکر ابی سے کوئی بات کہی تو وہ فوراً ہم لوگوں سے باز پرس کرتے اور تنبیہ کرتے کہ ایسی غلطیاں بالکل نہیں ہونی چاہیے، ابی بار بار کہتے کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم لوگ ایسے بنو کہ کسی کو بھی تم لوگوں سے تکلیف نہ پہنچے، اپنے اندر علم کی وسعت، فکر کی گہرائی، عمل کی طاقت اور اخلاق کی تاثیر پیدا کرو، اپنے نانا، دادا (حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی وحضرت مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی علیہما الرحمہ) کو اپنا آئیڈیل بناؤ، ان کی زندگیوں کو اپنے لیے نمونہ بناؤ۔

ایک زندگی خارجی ہوتی ہے اور ایک زندگی داخلی لیکن دونوں کو سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ کے مطابق گذارنا بہت مشکل ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے غیر بھی خوش ہوں اور خاندان وگھر والے بھی خوش ہوں، جن کی زندگی میں علم بھی ہو اور عمل بھی، اخلاق بھی ہوں اور تواضع بھی، خدمت کا جذبہ بھی ہو اور فکر کی وسعت بھی۔ ابی کی زندگی ان صفات حمیدہ سے متصف تھی۔ ان کو جس قدر خیال اپنے والدین کی عزت واحترام کا تھا، اس سے کہیں بڑھ کر اسلامی تعلیمات کا پاس ولحاظ تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم عبادات میں چاہے جتنے بڑھ جائیں لیکن دعوت کا جو فریضہ اپنے اخلاق وکردار سے پیش کر سکتے ہیں وہ عبادات سے نہیں۔ اسی کے ساتھ ابی کو اپنی تحریر وتقریر کا بھی بہت احساس تھا، وہ اپنی تقریر نشر کرنے سے پہلے سنتے تھے کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جو مختلف فیہ ہو۔

ہر انسان کے لیے اس کے والدین ہی سب کچھ ہوتے ہیں، ان کی موجودگی جسم میں جان ڈالتی ہے، ان کا ساتھ بے پناہ خوشی کا احساس دیتا ہے، ان کا قرب دلوں میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے اور اگر باپ ایسا ہو جو اپنے علم کی وسعت اور اخلاق کی بلندی میں ہزاروں سے ممتاز ہو، تواضع اور دل داری میں فوقیت رکھتا ہو تو اس کے ساتھ کس قدر محبت اور اپنا پن محسوس ہوتا ہے اور اس کی اولاد کس قدر جذباتی طور پر وابستہ ہوتی ہے، یہ بات ہر اولاد جانتی ہے۔ ابی نے جس قدر اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا اور ان کی خدمت کی وہ بھی ایک مثال ہے۔ ہماری دادی کو فالج کا حملہ ہوا، ان کا قیام رائے بریلی میں تھا، ابی کئی سال روزانہ اپنی والدہ کی دیکھ بھال اور ان کی تیمارداری کے لیے لکھنؤ سے شدید گرمی میں آتے، ان کی فکر کرتے، ان کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتے، دوا کھلاتے، ان کی دیکھ بھال کرتے، یہ سب کام خود کرتے اور بڑی خوش اسلوبی سے کرتے، اسی کے ساتھ اپنے گھر والوں کا بھی حد درجہ خیال رکھتے۔ وہ روزانہ فجر کی نماز پڑھ کے فوراً بس کے ذریعہ رائے بریلی سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو جاتے، کئی بار تو ایسا ہوا کہ اتنی صبح پوری بس پر وہ اکیلے ہوتے، ابی کو امانت کا کتنا زیادہ خیال تھا کہ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں برسوں پڑھایا لیکن کسی ایک دن بھی اپنے وقت یا اپنی تدریس میں ذرا بھی خیانت نہیں کی۔ ہم لوگوں کو بھی متنبہ کرتے کہ جو کام ملے وقت پر کرو، کوتاہی نہ کرو اور کوتاہی کرنے پر سخت ناراض ہوتے۔

حضور اکرمؐ کی سیرت کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں اور آپ کی صفات حسنہ سے واقف ہوتے ہیں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ سے جو ایک بار ملتا وہ آپ کا ہو جاتا۔ کچھ یہی حال ابی

کا بھی تھا۔ ابی کا عالم عربی کا دورہ ہوا، جو لوگ ان کے مخالف تھے ابی نے ان سے جس طرح اخلاق کا معاملہ کیا اس کی مثال کم ملتی ہے، جبکہ وہ سب جانتے تھے، ان کے سامنے ساری تحریریں تھیں، ساری تقریریں موجود تھیں لیکن ان کے سامنے سیرت کا عملی نمونہ بھی تھا اور اس کا اثر یہ پڑا کہ آج انہی لوگوں پر ابی کے انتقال کا بہت اثر ہوا۔

ابی کی شخصیت مقناطیسی تھی، ان کی محبت، سادگی، خلوص، بڑوں کے ساتھ احترام، چھوٹوں پر شفقت ومحبت، تواضع، دوسروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا، چھوٹی چھوٹی چیزوں کا لحاظ کرنا، اپنے متعلقین کا خیال کرنا، ان کی فکر کرنا، ان سے ملاقات کرنا، عہدے پر رہتے ہوئے برابری سے بات کرنا، اس کے علاوہ کتنی ایسی صفات ہیں جو ابی کے اندر مکمل نظر آتی ہیں۔

ابی پر جس چیز کا سب سے زیادہ غلبہ تھا وہ نبوی مزاج تھا۔ ان کی تربیت کا انداز اپنے اندر بڑی محبوبیت رکھتا تھا، وہ اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ جہاں ایک طرف محبت، شفقت اور نرمی میں بے مثال تھے، وہیں دوسری طرف تعلیم وتربیت کی فکر میں بھی بہت نمایاں تھے، کبھی انسان اپنی اولاد کی محبت میں غلط باتوں پر تنبیہ کرنا بھول جاتا ہے، لیکن والد محترم چھوٹی چھوٹی باتوں کی فکر کرتے تھے۔

ابی نے جس طرح خاندانی قرابت داری کا احساس رکھا کم ہی لوگ رکھ پاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کا عکس جمیل تھا، ان کو نیت کا استحضار بہت رہتا تھا، وہ اکثر اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ کسی بھی شخصیت کو تمہارے ذریعہ تکلیف نہ پہنچے۔ وہ اس حدیث کا نمونہ تھے کہ:

"من أحب لله وأبغض لله وأعطى لله ومنع لله فقد استكمل الإيمان" (جس شخص نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے نفرت کی، اللہ کے لیے دیا اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے منع کیا تو اس نے ایمان کی تکمیل کی)۔

وہ کسی سے تعلق رکھتے تو اللہ کے لیے رکھنا چاہتے، خاندانی تعلقات کا بڑا لحاظ رکھتے۔ اپنے بڑوں کے ساتھ وہ چھوٹے بن جاتے اور چھوٹوں کے ساتھ ایک دوست اور ساتھی بن جاتے۔ ابی سے کسی کو تکلف نہیں تھا، کم عمر بلکہ کوئی چھوٹا بھی جتنی دیر چاہتا ان سے بات کر لیتا۔ ارشاد نبوی ہے:

"من لم يرحم صغيرنا ولم يوقر كبيرنا فليس منا" (جس شخص نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کی تو اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں)۔

ابی نرمی اور محبت کا معاملہ رکھتے، ضرورت کو سمجھتے اور اس کے مطابق جو مدد ممکن ہوتی وہ کرتے۔ وہ خدمت میں ضرب المثل تھے، کسی کو تکلیف ہوتی تو وہ تڑپ جاتے، بے چین ہو جاتے اور اس کو دور کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے۔

ابی کی زندگی ایک خاص مقصد کے تحت گذری جس میں کسی کے تعلق سے دل میں کینہ نہیں، نفرت نہیں، عداوت نہیں، کسی کو نقصان پہنچانا نہیں، ابی کو بس فکر تھی آخرت کی، اللہ کے سامنے حساب دینے کی، روز قیامت کی، ان کی زندگی سنت نبوی سے قریب تر تھی جس میں کسی سے انتقام نہیں تھا، کسی کی توہین نہ تھی، کسی کی بے عزتی نہیں تھی، مزاج میں سختی نہیں تھی، دل میں بے پناہ نرمی تھی۔

جب ہم حافظ ہوئے اس وقت مجھے قرآن مجید کچھ اچھا یاد نہ تھا، ابی خود حافظ تھے وہ جانتے تھے کہ کیسے یاد کیا جاتا ہے اور کیسے یاد رکھا جاتا ہے، اس کی اہمیت ان کے سامنے تھی، انہوں نے لکھنؤ میں گھر پر یاد کرایا، تقریباً کئی ماہ ان کی نگرانی میں یاد کیا، وہ خود سنتے تھے، ابی کے ہاں مخارج کا لحاظ بہت تھا بلکہ آخر تک جب ہم جمعہ کی نماز پڑھا کر واپس ہوتے تو ابی بلاتے اور کہتے کہ ابھی اور مشق کرو، شیخ صدیق منشاوی کو مزید سنتے رہو، یہاں تک حسن کے بارے میں کہتے کہ اس کو بھی صدیق منشاوی کا سنایا کرو، ابھی سے مشق ہو، ابی کو قرآن مجید پڑھنے کی دھن تھی، چلتے پھرتے ہر وقت یا تو سنتے یا پڑھتے، ان کا سننا اور یاد کرانا اور اس کی فکر کرنا بہت یاد آتا ہے اور صرف قرآن مجید کے تعلق سے نہیں بلکہ ابی کو ہر چیز کی فکر ہوتی، دینی ودنیاوی بلکہ ہر چیز کی معلومات ان کو رہتی، ہم لوگوں کی آخر تک وہ اس طرح فکر کرتے رہے جیسے کوئی اپنے چھوٹے بچوں کی کرتا ہے، کپڑے خود لاتے، سامان خود خریدتے، ہر چیز کا خیال، ہر چیز کی فکر۔

ابی کہتے تھے کہ کسی کے محتاج نہ بنو، اپنا ہر کام خود کرو، نہ معلوم ہو تو کسی سے معلوم کرو بلکہ سیکھو، اس کی فکر کرو، وہ کہتے تھے ہندوستان میں دعوت کا کام کرنا ہے تو ہندی اور انگریزی میں مہارت ہونی چاہیے، تقریر کرو تو نرمی اور محبت سے بات سمجھاؤ، ان کو ایسی تقریریں بہت ناپسند ہوتی تھیں جن میں صرف چیخنا اور ڈرانا ہو، ان کے مزاج میں سادگی اور متانت تھی، شروع میں جب کسی پروگرام میں تقریر کے لیے بلایا جاتا تو اپنے خرچ پر چلے جاتے بلکہ ہم لوگوں سے کہتے کہ دیہاتوں میں جاؤ وہاں دعوت کا کام کرو، اس کا پورا خرچ ہم دیں گے، وہ کہتے کہ یہ نہ سوچو کہ کیا ہوگا بلکہ نیت صحیح کرو اور اپنا کام کرو۔

ابی کو لایعنی باتوں سے سخت نفرت تھی، کہتے کہ

اکثر بگاڑ اور خرابی لایعنی باتوں اور بے کار کی مجلسوں سے ہوتا ہے، انسان اس میں بیٹھتا ہے، کبھی کسی پر منفی تبصرہ کر دیا، کبھی غیبت کر دی، بے کار کے تبصروں میں اپنا وقت برباد کرتا ہے، وہ اسی لیے مجلسوں سے بہت دور رہتے، اکثر اچھے قراء حضرات خاص کر شیخ خلیل الحصری، شیخ صدیق المنشاوی اور شیخ عبدالباسط عبدالصمد کی تلاوت سننے میں، خود کہتے تھے کہ مجھے اس کا اتنا شوق تھا کہ میں چلتے پھرتے ہر وقت اسی طرح قرآن مجید پڑھتا رہتا، عالم عربی کے چیدہ علماء و مفکرین کو سنتے تھے اور عربی کی عبارتوں کو یاد کرتے تھے، چلتے پھرتے دہرایا کرتے تھے اور اسی کا نتیجہ اور اپنے بڑوں کی دعائیں تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے وہ علم دیا اور اسی کے ساتھ فکر کی بلندی اور وسعت نظر سے نوازا تھا، ان کے ہاں تعصب نہیں تھا، کسی سے ذاتی اختلاف نہیں رکھتے، آخر میں ایک مرتبہ کہا کہ ذاتی اختلاف نہیں ہونا چاہیے، اگر کوئی دین کی غلط ترجمانی کر رہا ہو یا اس کے بارے میں غلط بات کہہ رہا ہو تو ایسے لوگوں سے امت کو بیدار کرنا چاہیے، چاہے وہ آپ سے کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو۔

اس بات کا مشاہدہ اکثر ہوتا کہ ان لوگوں کے تعلق سے جو معاشرہ میں وہ مقام نہیں رکھتے تھے جو مقام لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا باعث بنتا ہے، ان لوگوں کو مجلسوں میں جگہ ملتی ہے لیکن کچھ دور، لوگوں کی توجہ تو ان کی طرف کی جاتی ہے لیکن ذرا کچھ فاصلہ سے، کیوں کہ ان کے پاس نہ تو دولت ہوتی ہے نہ وجاہت، نہ نسبت ہوتی ہے اور نہ ہی ظاہری شان وشوکت، لیکن ایسے حضرات کو میں نے ابی کی مجلسوں میں بہت قریب پایا، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ایسے کسی شخص کو انہوں نے ناشتے یا کھانے کے موقع پر یہ احساس دلایا ہو کہ وہ کوئی غریب ہے یا کمزور، ناشتے یا کھانے کا اہتمام اسی طرح کرتے جیسے کسی اہم آدمی کے لیے کرتے ہیں، خود اس کے ساتھ شریک ہوتے، یہ نہیں کہ کھانا یا چائے وغیرہ بھجوا کر خود گھر میں گھر والوں کے ساتھ کھایا ہو، یا دسترخوان پر ان کی توجہ اس کے مقابلہ میں دوسروں پر زیادہ رہی ہو، یا گفتگو میں اس کو نظر انداز کیا ہو، یا اس کے سوال کا جواب بے اعتنائی سے دیا ہو، وہ بے وقت آئے، آرام کے موقع پر آئے، ضرورت سے آئے یا بے ضرورت آئے، لگتا تھا کہ وہ استقبال کے لیے پہلے سے تیار بیٹھے ہیں۔

ابی کی ایک اہم خصوصیت جو نایاب ہے جو ابی کی محبت دلوں میں بیٹھا دیتی ہے وہ یہ کہ اس طبقہ کے لوگوں بلکہ لڑکوں تک کو بنا کسی ضرورت کے اپنے ساتھ بائک پر بیٹھا کر شہر لے جاتے، وہاں اس کو جس چیز کی ضرورت ہوتی دلاتے تاکہ اس کو خوشی ہو، انسان خیرات کے کام کرتا ہے، علمی و دینی کام کرتا ہے، محنت کرتا ہے اور کبھی کبھی اس میں اس کو مزہ آنے لگتا ہے، سفر کر رہا ہے، لوگوں کی طرف سے وہ اکرام دیکھتا ہے، یہ چیز اس کو عجب میں ڈال دیتی ہے، ایک مرتبہ راقم سے کہا کہ تقریر کرنے والوں سے خود پسندی کا نکل جانا بہت مشکل کام ہے اور اس کا سب سے آسان طریقہ جو ابی نے خود اختیار کیا بلکہ ہم سب کو نصیحت کی کہ کبھی بھی کسی کو اپنی چپل اٹھانے مت دینا، اس سے تکبر اور خود پسندی آتی ہے، خود اٹھانا، خود اپنا کام کرنا، اپنے نفس کو مارنا ورنہ اگر ذرا بھی اس کا احساس ہوا کہ تم کچھ ہو تو تمہارا عمل اکارت چلا جائے گا، اپنی تقریر پر کبھی ناز نہ کرنا۔

ابی بچوں کے مغرب بعد باہر نکلنے پر سخت متنبہ کرتے، کتنی بار ایسا ہوا کہ بچوں کو ڈانٹا کہ اس طرح باہر نکلنا نہیں چاہیے، اسی طرح ان کو اس کا بہت خیال تھا کہ ماں باپ بچوں کی باتوں کو توجہ نہ دیں، ابی اس کی طرف توجہ دلاتے کہ بچوں کی تربیت بچپن سے ہونی چاہیے، یہ نہیں کہ جیسے آج کل کا ماحول ہے کہ ابھی بچہ ہے بعد میں دیکھا جائے گا، ابی کہتے تھے کہ بعد میں پختگی آجاتی ہے۔

اسی طرح ابی کو اس کی بہت فکر ہوتی کہ کسی کے دل میں کوئی برائی نہ آجائے، چاہے وہ علمی شخصیت ہو یا غیر علمی اور اگر استاذ ہے تب تو سخت نقصان کی بات ہے، اس کا ایک واقعہ ہمارے بڑے بھائی کا ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیمی اوقات میں کسی استاذ کے درجہ نہ آنے پر وہ (ابا) حضرت مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے دفتر میں تھے، ابی اس موقع پر پہنچے، انہوں نے ان سے کہا کہ تعلیمی اوقات میں دفتر میں جانا مناسب نہیں کیوں کہ وہ ذمہ دار ہیں، انہوں نے اگر اس استاذ سے پوچھ لیا اور اس کے دل میں تمہارے تعلق سے کچھ آگیا تو نقصان تمہارا ہے۔

ابی کو جہاں اپنی اولاد جان سے پیاری تھی، وہیں دینی معاملات اور تعلیم و تربیت کے معاملہ میں کوئی نرمی نہیں تھی، ابی کو سب سے زیادہ اس کی فکر تھی کہ دینی معاملات میں ہم سے کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہو رہی ہو، وہ بار بار تاکید کرتے خاص کر فجر کی نماز کے لیے توجہ رکھتے اور خود فکر کرتے، نماز بعد دیر تک مسجد میں بیٹھنے کا اہتمام کرتے، صبح دیر تک سونے پر سرزنش کرتے چاہے وہ بچے ہوں یا بڑے۔

ابی زبان حال سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے:

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

حقیقت یہ ہے کہ:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

☆☆☆☆☆

جب میں نہ رہوں گا مرا افسانہ رہے گا

محمد سلمان بجنوری ندوی☆

یاد داری کہ وقت زادنِ تو
ہمہ خنداں بدند تو گریاں
آنچناں زی کہ وقت مردنِ تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں

(تمہیں یاد ہے! کہ جب تم پیدا ہوئے تھے، سب لوگ خوشیاں منارہے تھے اور تم رو رہے تھے، اب اس طرح زندگی گزارنا کہ جب تم دنیا سے رخصت ہو تو تم ہنس رہے ہو، باقی سارا عالم رو رہا ہو)۔

کسی عارف نے مذکورہ بالا شعر میں زندگی کی حقیقت کو بیان کر دیا ہے، مختصر اور دل پذیر انداز میں بہترین نسخہ تجویز کر دیا ہے کہ زندگی ایسے گزار کر جاؤ کہ تم خوش وخرم اور شاداں وفرحاں ہو اور تمام عالم ماتم کناں، تمھاری جدائی میں رو رہا ہو، بارہا اس کا مشاہدہ ہوا ہے کہ جب اللہ کے نیک بندے اور دین اسلام کے بے لوث خادم، اعلیٰ و عمدہ اوصاف وخصوصیات کے حامل دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، تو لوگوں کے دلوں پر ان کے جانے کا فطرتاً ایک غم اور اثر ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ یہ اللہ کے برگزیدہ بندے کچھ وقت اور ہمارے درمیان رہتے اور ہم ان سے استفادہ کرتے، تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی بندۂ خدا کا جنازہ اٹھا تو پورا شہر ہی جنازے میں شرکت کے لیے نکل آیا، چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے روایات میں ہے کہ پورا شہران کے جنازے میں شامل ہوگیا، ایسا کہ جامع مسجد میں جماعت تک نہ ہوسکی، لوگوں کی زبانی سنا کہ کچھ ایسا ہی منظر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے جنازے کا تھا کہ شہر کیا، ملک و بیرون ملک تک کے لوگ جنازے میں شامل ہوئے اور راقم نے اپنی آنکھوں سے کچھ ایسا ہی منظر داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے جنازے میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے وسیع میدان اور تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں دیکھا اور پھر مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور دیگر بزرگوں کے جنازے میں شرکت کرنے والوں کا بھی یہی عالم تھا، اب اخیر میں حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ کی رحلت ہوئی اور طالبانِ علوم نبوت اور مختلف شہروں سے لوگ پروانہ وار جنازے میں شرکت کے لیے تکیہ رائے بریلی کا قصد کرتے نظر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مجمع کثیر وہاں اکھٹا ہوگیا:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا علیہ الرحمہ ایسے خانوادہ کے فرد فرید تھے، جس کی علمی ودینی خدمات کی ایک درخشاں و تاباں تاریخ ہے، خانوادۂ شاہ علم اللہ کی شخصیات ایمان و یقین، علم وحکمت، تقوی وللّٰہیت، صبر و استقامت، اخلاق وکردار اور زہد واستغناء جیسی عظیم صفات سے آراستہ رہی ہیں، یہاں سے ایسے دین کے دعاۃ اور مجاہدین پیدا ہوئے کہ جنھوں نے ہندوستان میں ایمانی فضاء قائم کی اور دین اسلام کی ہوائیں چلائیں اور ایسے مخلصین پیدا ہوئے کہ جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے اسلام کے درخت کو سینچا اور اسلامی روایات کی پاسبانی کی، انہیں مخلصین اور مجاہدین میں ہمارے مشفق و مہرباں حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ بھی تھے، جو بیشمار اعلی اوصاف وکمالات کے حامل تھے، جنھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح علم دین اور اسلام کی نشر واشاعت کی خاطر وقف کر دیا تھا، یہ وہ مسافر تھا جو تھکنے کا نام نہیں لیتا تھا، دنیا سے بیگانہ ایسا کہ دنیا اس کو ایک آنکھ نہ بھاتی: "كن في الدنيا كأنك غريب أو عابر سبيل" کی جیتی جاگتی تصویر تھا، اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ایسا چست و پھرتیلا گویا معلوم ہوگیا ہو کہ میرے پاس وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ ہے، لہٰذا سرعت کے ساتھ کام کیا جائے، منزل کی جستجو ایسی کہ منزل پر پہنچے بغیر چین ہی نہ ملتا ہو:

مسافر اپنی منزل پر پہنچ کر چین پاتے ہیں
وہ موجیں سر پٹکتی ہیں جنھیں ساحل نہیں ملتا

حضرت مولاناؒ خدمت گزاری، غمگساری و ہمدردی میں اپنی مثال آپ تھے، آپ نے اپنے والدین کی خدمت کرنے ان کی دیکھ بھال اور بیماری میں ان کے لئے قربانی دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، تن ومن اور جان ومال سے ان کی خدمت بجا لائے اور ان کی دعاؤں سے اپنے دامن مراد کو بھر لیا تھا، انہیں بزرگ والدین کی دعاؤں کا فیض تھا، جس سے آپ فیضیاب ہوئے اور دوسروں کو فیض پہنچانے والے بنے۔

☆استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

آپ علم وادب کی چوٹی پر فائز تھے، جہاں آپ کو عربی زبان و ادب پر کمال کا ملکہ تھا، وہیں اردو زبان و ادب کے بھی شہسوار تھے اور پھر صحیفہ "الـرائـد" کی ادارت، ناظر عام کا ایک باوقار عہدہ، رابطہ ادب اسلامی کی صدارت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی رکنیت جیسے عظیم مناصب پر فائز ہونے کے باوجود آپ کی تواضع و انکسار، زہد واستغناء اور اعلیٰ اخلاق وکردار میں ذرہ برابر کمی نہیں دیکھی گئی، بلکہ ان صفات حسنہ میں مزید اضافہ ہی ہوا، آپ خدمتِ خلق اور مخلوق کو فائدہ پہنچانے کے جذبہ سے لبریز تھے، کسی کی تکلیف اور درد کا برداشت کرنا ان کے لئے مشکل ہوتا تھا، دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لئے وہ جو کر سکتے، کر گزرتے تھے، اس میں نہ اپنے مال کی پرواہ کرتے نہ اپنی جان کی، یہی جذبہ تھا کہ اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ ضرورت مندوں اور محتاجوں پر خرچ کر ڈالتے تھے، بقول حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کہ مولانا جعفر صاحب تنخواہ کا دسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے قائل تھے اور گھر والوں کو اسی کی تاکید کرتے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض طلبہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ مولانا نے دفتر مالیات میں ہماری فیس جمع کرائی، ایک طالب علم نے راقم سے بتایا کہ ہمارے بعض ساتھیوں نے مولانا مرحوم سے اپنے گھر کی پریشانی بتائی اور درمیان سال میں غیر مستطیع ہونا چاہا، مولانا نے فرمایا کہ جو ضابطہ ہے، اسی کے مطابق چلنا ہوگا، اب تک کی فیس جمع کرنا ہوگی، آئندہ فیس معاف ہوجائے گی اور اگر اب تک کی فیس جمع نہیں کر سکتے، تو ہم جمع کر دیں گے، پھر مولانا نے ان کی فیس جمع کرائی۔ مولانا کی دلی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگوں کو میری ذات سے نفع پہنچ جائے، مجھ سے کسی کو ضرر نہ لاحق ہو، آپ اپنے والد گرامی قدر ولی کامل حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) کی طرح ایک بے ضرر انسان تھے اور لوگوں کو نفع پہنچانے میں اس حدیث کے مصداق تھے جس میں کہا گیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر انسان وہ ہے جو لوگوں کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو، فرمایا: "أحبُّ الناسِ إلى اللهِ أنفعُهم للناسِ"۔

بزرگی بفضل است نہ بسال

مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم تکیہ رائے بریلی میں ہوئی، آپ اپنے خاندان کی علمی و دینی اور روحانی فضا اور بڑے بزرگوں کی آغوش میں پروان چڑھے اور بہترین تربیت پائی، آپ نے حفظِ قرآن مکمل کیا، آپ ایک اچھے حافظِ قرآن تھے، یاد بھی خوب تھا اور پڑھتے بھی خوب تھے، تکیہ پر کئی سال تراویح بھی سنائی، مولانا نے اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا اور یہاں چوٹی کے علماء کرام سے علوم شرعیہ کے ساتھ عربی زبان وادب میں مہارت پیدا کی، آپ کے والد گرامی نے آپ کی عربی زبان وادب پر خاص توجہ دی اور آپ کو عربی مضامین ومقالات کی مشق کرائی اور آپ ایک اچھے ادیب و قلمکار بن کر میدان عمل میں آئے، اردو زبان وادب میں بھی آپ کو خاصی مہارت حاصل تھی، آپ نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو خوب پڑھا تھا اور ان کے اسلوب کو جذب کر لیا تھا، آپ کی تحریریں مثبت، تعمیری اور فکر اسلامی کا رنگ لیے ہوتی تھیں اور اسلوب نگارش بڑا ہی پرکشش، نتیجہ خیز، دل کو موہ لینے اور اپیل کرنے والا ہوتا، آپ نے ندوے کی تعلیم (۱۹۸۱ء میں عالمیت اور ۱۹۸۳ء میں فضیلت) مکمل کرنے کے بعد ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی زبان وادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب کی مشہور ومعروف یونیورسٹی "جامعة الملك سعود" کے زیر اہتمام ٹیچرس ٹریننگ کا کورس بھی کیا۔

آپ نے تدریسی زندگی کا آغاز دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ نخاس لکھنؤ سے کیا، جہاں عربی زبان وادب کی کتابیں آپ کے زیرِ درس رہیں، آپ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں چالیس سال سے زائد عرصے تک کامیاب تدریسی زندگی گزار کر ۲۰۲۳ء میں ریٹائر ہوئے اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں خدمت انجام دینے لگے، مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد آپ ندوۃ العلماء کی مجلسِ شوریٰ کے متفقہ فیصلے سے ناظر عام منتخب کیے گئے اور اس کے بعد سے برابر ندوہ ہی میں مختلف دینی ودعوتی خدمات انجام دینے لگے، آپ پندرہ روزہ "الرائد" کے مدیر اعلیٰ، عربی زبان وادب کے صاحب طرز اور کہنہ مشق ادیب تھے، آپ کی تحریریں دلوں کو اپیل کرنے والی ہوتی تھیں، آپ درجنوں دینی اداروں، مدرسوں اور مراکز کی سرپرستی فرما رہے تھے، آپ ایک اچھے خطیب بھی تھے، جس کے ذریعہ آپ قوم وملت کی رہبری کا عظیم کام انجام دے رہے تھے، نیز آپ کی خدمات کا دائرہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

آپ کی شخصیت بہت سے پہلوؤں سے ممتاز تھی، آپ بہت سی خوبیوں اور صفات سے مزین و آراستہ تھے، ان میں سے بعض قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں، آپ کی پوری زندگی سادگی اور سادہ مزاجی سے تعبیر تھی، لباس میں سادگی، کھانے پینے

میں سادگی، طبیعت میں سادگی، بول چال اور گفتار میں سادگی، عادات واطوار اور ملاقات میں سادگی، کوئی کروفر اور ہٹو بچو نہیں، کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ کب آئے اور کب چلے گئے، نہ کوئی تصنع نہ بناوٹ، تکلفات سے کوسوں دور، حیاء و پاکدامنی، شرافت ونجابت تو آپ کو خاندانی ورثہ میں ملی تھی، آپ اپنے والد گرامی کا عکس جمیل تھے، آپ سادہ مزاج اور شریف طبیعت اور بڑے کم آمیز تھے، بے نفسی، صاف گوئی، فکری اعتدال اور قدروں، نسبتوں کا احترام کرنا آپ کی فطرت میں رچا بسا تھا، آپ نگاہ بھر کر کم ہی دیکھتے، اکثر نگاہیں جھکی ہوتیں، راستہ چلتے بھی اتنی ہی نظر اٹھاتے، جتنی ضرورت ہوتی، آپ راحت پسند بالکل نہ تھے، بلکہ دوسروں کی راحت کا سامان فراہم کرتے تھے، آسائشیں اور سہولیات آپ کی ترجیحات میں شامل نہیں تھیں، اپنے اوپر تو بالکل خرچ کرنا پسند نہیں کرتے تھے، باصرار ہی کسی چیز کو قبول کرتے، اگر ایک چیز سے کام چل رہا ہے، تو اس کو تبدیل کرنے یا اس کی جگہ کوئی نئی چیز لانے پر راضی نہ ہوتے، آپ حقوق العباد کا بڑا خیال کرتے، رشتہ داروں، عزیزوں اور پڑوسیوں سے صلہ رحمی کرنے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی بذات خود کوشش کرتے، جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ اپنی تنخواہ کا اکثر حصہ دوسروں پر خرچ کر دیتے، ایسی صفات وخصوصیات آج کے مادی دور میں کہاں ملیں گے، لوگ ڈھونڈتے رہ جائیں گے، لیکن کسی کو نہیں پائیں گے:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

یقیناً آپ نبوی اخلاق ومزاج کے حامل تھے، ملاقات کرتے تو تواضع وانکسار اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے، احقر کو ندوۃ العلماء کی طرف سے رہائشی مکان ملا، کچھ دن بعد احقر نے مولانا مرحوم کو غریب خانہ پر آنے کی دعوت پیش کی، تو مولانا نے بڑی خوشی ومسرت کا اظہار فرمایا اور بخوشی بلا کسی تکلف کے تشریف لائے اور کھانا بھی تناول فرمایا، یہ مجھ جیسے ناکارہ پر مولانا کی شفقت ومحبت تھی، مولانا کا اپنے رفقاء کے ساتھ تو بڑا ہی بے تکلفانہ اور محبت واپنائیت کا معاملہ تھا، اس سلسلے میں آپ تکلیفیں بھی برداشت کرتے، لیکن کسی ناگواری کا اظہار نہ کرتے، کسی بھی ایسے عمل کا اظہار نہ ہونے دیتے، جس سے پتہ چلتا ہو کہ مولانا عہدے اور منصب والے ہیں یا اونچے خاندان اور مقام ومرتبے والے ہیں، ہمیشہ اپنے آپ کو جھکا کر رکھتے تھے، مولانا فرماتے کہ مرشد الامت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ زندگی اسوۂ نبویؐ کا مکمل آئینہ دار ہے، میں اسی کو اختیار کروں گا اور مولانا نے یہ کر کے دکھایا، اپنے آپ کو صبر و برداشت اور تکلیفوں کے اٹھانے کا عادی بنایا، آپ عزیمت پر عمل کرنے کو ترجیح دیتے۔ میں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مولانا مرحوم کی شخصیت کے چند اوصاف ذکر کرنے کی کوشش کی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا کی زندگی جامع الکمالات تھی، آپ کی علمی، دینی، تصنیفی، تالیفی، تدریسی اور سماجی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے، امید ہے کہ مولانا کی زندگی پر مستقل کام کیا جائے گا اور سوانح عمری مرتب کر کے امت مسلمہ کے سامنے پیش کی جائے گی تا کہ امت کے افراد مولانا کی زندگی سے مستفید ہوں، اللہ تعالیٰ توفیق سے نوازے آمین۔

مٹ جاؤں گا لکھتے ہوئے رودادِ شب وروز
جب میں نہ رہوں گا مرا افسانہ رہے گا

☆☆☆☆☆

..................بقیہ صفحہ ۱۳۰ کا

حضرت مولانا رحمہ اللہ کو خلاق عالم نے ان گنت خوبیوں سے نوازا تھے، آپ ایک بہترین عربی ادیب، اور کامیاب مدرس تھے، ہم طلبہ عالیہ عرفانیہ عام طور پر انہیں دو خوبیوں سے واقف تھے پھر جب آپ کی ایک اردو کتاب ''دعوت فکر وعمل'' منظر عام پر آئی نیز ''دارالرشید'' سے اردو کتابوں کے عرض ناشر سے آپ کی اردو تحریریں سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ آپ صرف عربی کے ہی ادیب نہیں؛ بلکہ اردو کے بھی ادیب کامل ہیں۔

اور پھر وہ وقت بھی آیا جب مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بحیثیت ناظر عام تشریف لائے تو مزید ایک اور خوبی سامنے آئی اور وہ ''خطابت'' ہے، مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں کبھی بھی آپ اسٹیج سے خطاب نہیں فرمایا؛ بلکہ ہم طلبہ کے ابتدائی یا اختتامی پروگرام میں بھی خطاب نہیں فرمایا؛ لیکن جب ندوۃ العلماء تشریف لائے تو ایسا معلوم ہوا کہ یکایک وہبی طور پر بیان وخطابت کے تمام اسرار ورموز سے بہرہ ور ہو گئے اور پھر جہاں اور جس موضوع پر خطاب فرمایا، اس کا حق ادا کر دیا۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ جب ندوۃ العلماء آئے تو ہر کسی کو مولانا رحمہ اللہ کی خوبیوں سے بڑی امیدیں تھیں کہ رب کریم حضرت مولانا رحمہ اللہ سے اب عالمی طور پر دینی علمی اور فکری خدمات لیں گے اور آپ رحمۃ اللہ علیہ کا علمی فیض چہار دانگ عالم میں عام وتام ہوگا کہ اچانک آپؒ اپنے رب کے حضور تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ آپؒ کی کامل مغفرت فرما کر فردوس بریں بنائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

زندگی کی بے ثباتی آشکارا کرگئی

محمد اعظم شرقی ندوی☆

کس سے کب آخری ملاقات ہے کوئی نہیں جانتا۔زندگی کی بے ثباتی بار بار اپنا ثبوت پیش کردیتی ہے، یاد دلاتی دیتی ہے مگر انسان کی غفلت پر کوئی قدغن نہیں لگ پاتا،ظاہر ہے یہ خسارہ کا سودا ہے:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ کی موت کا کیونکر یقین ہو،حیات کی موجوں میں جوش وخروش تھا،زندگی حرکت حرارت سے لبریز تھی،متحرک اور چلتی پھرتی زندگی تھی،اس میں اور بھی حرکیت پیدا ہوگئی تھی جب سے ان پر ندوۃ العلماء کی ذمہ داری ڈالی گئی،وہ اس کے لیے کوشاں،خوب سے خوب تر کی تلاش میں اور اس کی ترقی اور استحکام میں دل وجان سے، باہمی مشاورت ومعاونت سے سرگرم عمل تھے اور شبانہ روز کی محنتوں کی وجہ سے بہت حد تک استحکام ہوچکا تھا، تنظیمی اور انتظامی لحاظ سے مضبوط ہوچکا تھا،اور ادارہ اپنے خطوط پر پوری طرح گامزن تھا کہ اچانک پیغام اجل آپہونچا اور ندوۃ العلماء اپنے ایک مخلص ذمہ دار اور خادم دین وملت سے محروم ہوگیا:

کل اس کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گماں تک نہ ہوا وہ بچھڑ نے والا ہے

اس اچانک حادثہ نے بہت رنجیدہ خاطر کیا، ابھی تو سنبھالا دیا تھا،ابھی خاکوں میں رنگ بھرا جارہا تھا،قوت واستحکام حاصل ہورہا تھا،مخلصانہ عمل، فکر اور جذبہ یہ بتا رہا تھا کہ ان کی موجوگی سے چمن میں مزید بہار آئے گی،ندوے میں ہماری صبح اسی احساس کے ساتھ بیدار ہوتی جو ہمیں قوت وفکر وعمل میں جوش بھر دیا کرتی تھی۔ ہوتا ہے جادہ پیماں پھر کارواں ہمارا منزل کی طرف رواں تھا لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا، پندرہ جنوری کی شام ہوئی،سورج غروب ہوا لیکن اسی کے ساتھ ایک صاحب علم، معلم ومربی،عربی و اردو کے ممتاز صحافی ،ندوۃ العلماء کے ناظر عام کی اچانک حادثاتی موت نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا،ندوہ پر اک سوگواری کی فضا چھا گئی،آن واحد میں سوشل میڈیا پر خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی،غم کے اس ابلتے سیلاب میں تعزیت وتسلی ،صبر وشکیبائی اور پیغامات کا سلسلہ رات بھر چلتا رہا، ہر طرف فکر وغم کی تصویریں اور رنج والم میں ڈوبی ہوئی تحریریں تھیں۔ یہ حادثہ ندوہ کے لیے تو تھا مگر خاندان حسنی کے لیے بہت المناک اور صبر آزما تھا جہاں آٹھ سے دس سالوں میں ایک کے بعد ایک کئی مقتدر ہستیاں اٹھ گئیں:

اٹھ گئیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لئے کس کس کا ماتم کیجیے

ہم تمام ندوی برادری کا غم اس لئے بھی بڑھ جاتا ہے کہ ہم مسلسل اس طرح کے سانحہ کو ادھر کم وقفوں کی مدت سے جھیل رہے ہیں۔ایک غم خشک نہیں ہو پاتا کہ دوسرا غم چھا جاتا ہے،ایک مسند لگتی اور بزم سجتی ہے کہ دوسرا چراغ گل ہوجاتا ہے۔مولانا علی میاں رحمہ اللہ کی وفات ۱۹۹۹ء کے بعد سے ندوۃ العلماء اپنے محسنین،مخلصین اور علم وفضل کی آباد کہکشاں سے خالی ہوگیا۔ذیل میں ان باکمال ہستیوں،ارباب فضل کمال،جید اساتذہ کرام،مخلص منتظمین کے نام پڑھیئے اور عہد ماضی کی زریں صفحات پر ان دمکتے ستاروں کو تھوڑی دیر کے لیے یاد کیجیے کہ کیسے کیسے علم ودانش کے مینار پچیس سال کے عرصہ میں یکے بعد دیگرے گوشۂ لحد میں اتر گئے۔مولانا عارف سنبھلی ندوی،مولانا حبیب الرحمٰن سلطانپوری، مولانا برجیس صاحب،مولانا شہباز اصلاحی،مولانا شفیق الرحمٰن ندوی، مولانا عبد اللہ عباس ندوی،مولانا معین اللہ ندوی، مولانا ناصر علی ندوی،مولانا محمود الازہار ندوی،مولانا مفتی محمد ظہور ندوی،مولانا مفتی محمد طارق ندوی،مولانا ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی ندوی، مولانا ابراہیم رودولوی ندوی،مولانا عبد اللہ حسنی ندوی،مولانا سید محمد واضح رشید ندوی،مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی،مولانا سید حمزہ حسنی ندوی،مولانا نذر الحفیظ ندوی،مولانا ہارون اندوری ندوی، پروفیسر اطہر حسین صاحب، مولانا محمود حسنی ندوی، مولانا امین الدین شجاع الدین ندوی، پروفیسر وصی احمد صدیقی،مولانا عظیم خان ندوی بہرائچی، حافظ حشمت اللہ صاحب رحمہ اللہ،حافظ جمیل صاحب رحمہ اللہ، حافظ عبد التواب صاحب رحمہ اللہ،مولانا عزیز الرحمٰن سیوانی،مولانا غفران باندوی، ماسٹر عبد اللطیف صاحب،ماسٹر داؤد صاحب وغیرہ رحمہم اللہ جمیعا واسکنہم فسیح جناتہ النعیم!

اب آنکھیں ایسے محبین ومخلصین ،وجانثار کے لیے ترستی ہیں یہ سب بلند انسانی کمالات اور خوبیوں کے حامل اور مثل شہاب ثاقب تھے۔

اب سوائے صبر وشکیبائی کے کوئی چارہ نہیں ہے ،یہ سب قضا وقدر کے فیصلے ہیں ہمیں اس پر راضی رہنے کا حکم ہے۔یوں تو سب کو ایک دن جانا ہے،لیکن ایک اچھے مخلص ،نیک دل وپاک

☆ استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

پاز، خاموش طبیعت اور پاکیزہ طینت انسان کا بچھڑنا بہت دکھ دیتا ہے۔ یہ بے قدر نگاہیں تلاش کرتی ہیں مگر ہائے افسوس! بس زندگی ایک امانت تھی جو اللہ نے لے لی۔ اس پر گلہ شکوہ کا ہمیں کیا حق!

اس دور قحط الرجال میں ہم اس لئے بھی سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ ہم انسانوں کی بھیڑ میں حقیقی انسان کو تلاش کرتے ہیں، مادیت کی چمک میں اور اخلاقی پستی کے دور میں حسن اخلاق اور شریفانہ اطوار کو ڈھونتے ہیں، ہم غیبت کی محفلوں اور بری صحبتوں کے تعفن سے بچنے کے لیے صالحین کی مجلسوں کا انتظار کرتے اور انسانی کمالات کو کسب کرنے کے لئے خوشگوار ہوا کے جھونکے کے منتظر رہتے ہیں، ہر طرف زبانوں کے گھاؤ اور تیر نشتر سے بچتے ہوئے، ہم شیریں زباں، خاموش طبیعت انسان کو تلاش کرتے ہیں، غرور و تمکنت، انا کے برعکس تواضع وخاکساری کے پیکر خاکی کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں، اس دور تکثیر وتکاثر میں اور جذبہ تنافس کے شکار لوگوں سے نفور ہونے لگتی ہے تو شکر وسپاس و جذبہ امتنان سے معمور، قدروں سے آشنا انسانوں کو دیکھ کر راحت ملتی ہے۔ خودنمائی، خودستائی کے مرض عام میں جب طبیعت مکدر ہوتی ہے تو مستور محاسن وخوبیوں والے انسانوں اور اپنی ذات کو مٹادینے والے اہل اللہ کی کتابوں اور مجلسوں سے قلب کو جلا ملتی ہے جہاں وما الحیاۃ الدنیا الا متاع الاغرور سے دنیا کے بے وقعت اور بے ثبات ہونے کا مردہ احساس جاگ اٹھتا ہے اور والآخرۃ خیر لك من الاولی سے ابدی اور دائمی زندگی کا یقین بڑھتا ہے۔ غرض ہم ایک ایسے دور میں ہیں جہاں اعلی انسانی خوبیوں اور کمالات سے متصف انسان کا عنقا ہے۔

مولانا رحمہ اللہ سے میرا تعلق شروع میں صرف سلام اور خیریت تک تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا رمضان المبارک میں تکیہ کی مسجد میں تراویح پڑھاتے تھے، آواز میں رقت، روانی آبشار کی مانند تراوٹ کا احساس دلاتی تھی۔ مولانا سے ملاقات اور گفتگو اس وقت شروع ہوئی جب میرے والد صاحب کا سن ۲۰۲۱ میں انتقال ہوا، انتقال سے ایک گھنٹہ قبل بات ہوئی، انتقال کے بعد آپ بعد مغرب تشریف لائے تعزیت کی اور اس سانحہ کو ذاتی اور خاندانی حادثہ بتایا۔ اس کے بعد میں مولانا رحمہ اللہ سے مسلسل رابطہ میں رہا۔ مولانا ہمیشہ بہت محبت اور تپاک سے ملتے اور بچھ جاتے۔ رائے بریلی میرا جانا ہوتا تو باصرار کھانے پر بلاتے اور میں حاضر ہوتا، مجھ جیسے چھوٹوں پر محبت اور شفقت اس طرح کرتے کہ میں شرمندہ ہوجاتا، مولانا بے تکلف گفتگو فرماتے اور اسطرح التفات اور اپنائیت کا اظہار کہ برسوں سے شناسائی ہو۔ رائے بریلی جانے میں تاخیر ہوتی تو فرماتے کہ آپ نے آنا چھوڑ دیا، یہ مجھ چھوٹے پر وہ محبت وتعلق وشفقت کا پہلو ہے، جس میں اعلی درجہ پر وہ فائز تھے۔

مولانا رحمہ اللہ علیہ کی نمایاں خوبی یا پیغمبرانہ صفت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ شگفتہ جبیں اور خندہ پیشانی سے ملتے، لا تحقرن من المعروف شیئاً ولو ان تلقی اخاك بوجه طلق کا مصداق تھے، ایک بار حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ سے بعد مغرب ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا، مولانا ممدوح تشریف رکھتے تھے مولانا نے مجھے اپنے پاس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، دیر تک گفتگو ہوتی رہی، باتوں میں نہ کبر نخوت کا شائبہ نہ اظہار تعلی، سراپا عجز و نیاز تھے۔ وہ خوش کلامی اور وسیع القلبی رکھتے تھے۔ دار العلوم میں جب ہوتے تو راہ چلتے اسی انداز سے خیریت دریافت کرتے، والد صاحب مرحوم پر مضامین کو جمع کرنے کے سلسلے میں پوچھتے تھے۔

میری کوتاہی کہ میں مولانا سے ملاقات یہ سوچ کر نہیں کر پاتا کہ کثرت کارنے اور ذمہ داریوں نے گھیر رکھا ہے، لیکن جب بھی حاضری ہوتی تو ہر حاضری قریب سے قریب تر کرتی اور دل میں محبت کا تعلق ابھارتی۔ گزشتہ برس شعبان کی کسی تاریخ میں شہر لکھنؤ کے ایک مدرسہ میں سالانہ ثقافتی پروگرام اور جلسہ دستار بندی کے لئے مولانا سے وقت لینا تھا، مدرسہ کے ذمہ دار اور میرے عزیز دوست مفتی مولانا ارشد ندوی نے مجھ سے اس بارے میں رابطہ کیا، اور میں ان کو لے کر مولانا کے دفتر پہونچ گیا، پروگرام میں بحیثیت صدر شرکت کی درخواست کی، مولانا نے قبول کیا اور جلسہ میں تشریف لائے، مولانا نے نہ صرف اس مدرسہ کی کاوشوں کو سراہا بلکہ دین کی حفاظت اور نسلوں میں دین کو باقی رکھنے کے سلسلہ میں ایمانی غیرت وحمیت سے بھرپور پر مغز خطاب فرمایا۔ مولانا کی تقریر مثل تحریر ہوتی تھی، سادہ، پرکار، الفاظ باہم ایک دوسرے سے پیوست، نہ الفاظ کی گھن گھرج نہ بھاری اور ادق الفاظ، سنجیدہ اسلوب میں بات کرتے جو موثر و دل موہ لینے والا ہوتا، عام فہم اور آسان زبان اختیار کرتے، خطاب اسناد وتحقیق کے دائرہ میں ہوتی۔ خطابت سے گرچہ مولانا دور تھے لیکن جب سے ندوۃ العلماء کی ذمہ داری سپرد کی گئی تو اس کے بعد مختلف جلسوں اور پروگراموں میں جاتے اور تقریر کرتے اس طرح ایک بہترین مقرر کی حیثیت سے مولانا سامنے آئے۔

مولانا رحمہ اللہ کی زندگی کا دائرہ تین خطوط پر مشتمل ہے۔ تدریسی، صحافتی اور تصنیفی، دعوتی و اصلاحی۔ مولانا حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کی اور پھر ندوۃ العلماء سے علوم شرعیہ اور عربی زبان اودب میں مہارت پیدا کی۔ آپ نے سن

۸۱ میں عالمیت اور فضیلت سن ۸۳ میں مکمل کی، سن ۸۶ میں لکھنؤ یونیوسٹی سے ایم اے اور سن ۹۰ میں جامعۃ الامام الملک سعود کے زیر اہتمام ٹیچرس ٹریننگ کورس کی مکمل کی مولانا کی تدریسی زندگی کا آغاز ندوۃ العلماء کی معروف شاخ مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے شروع ہوئی جہاں آپ نے تقریبا تین دہائیوں تک اپنی خدمات انجام دی، اور ہزاروں شاگردوں نے آپ سے فیض اٹھایا۔ بعد ادھر تین چار سال سے ندوہ میں بھی تدریس سے وابستگی رہی۔ آپ کا اصل موضوع تفسیر وحدیث اور فکر اسلامی تھا۔

مولانا نے صحافت کے ذریعہ بھی اپنے قلم کو دعوت واصلاح کے لئے وقف کردیا ،آپ ایک اچھے قلمکار تھے ،آپ کی تحریر شستہ وشگفتہ ہوتی ، آپ کی تحریر ماجدی اسلوب کا رنگ لئے ہوئی تھی، لفظ پر لفظ جماتے گویا انگوٹھی میں نگینہ بٹھاتے۔ مولانا ماہنامہ بانگ حرا سے بھی وابستہ رہے۔ ملک کے مختلف مجلّہ میں آپ کے مضامین حالات حاضرہ اور عالم اسلام سے متعلق علمی وفکری ہوا کرتے تھے، پندرہ روزہ عربی جریدہ الرائد سن ۲۰۱۹ء میں اس کے مدیر اعلی رہے اس کا افتتاحیہ لکھتے رہے جو اب خواطر کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

دعوت واصلاحی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے مولانا درس قرآن ایک مدت سے امین آباد کی مسجد میں دے رہے تھے، رمضان میں تکیہ کی مسجد میں درس قرآن جو آخری سورتوں کا انتخاب تھا جاری رہتا، اور بڑی قیمتی معلومات سلیقہ سے اپنے درس میں دیا کرتے تھے۔ ''کام کی بات'' کے عنوان سے سوشل میڈیا پر ایک مفید اور کارآمد اصلاحی چیزیں پیش کرتے جو ماقل ودل کے مصداق ہوتا تھا۔ ادھر جب ندوۃ العلماء کے ناظر عام ہوئے تو دعوتی واصلاحی جلسوں میں شرکت کرتے اور پر مغز خطاب کرتے جو طلباء کے لئے پندونصائح کا مرقع ہوتا تھا۔

مولانا رحمہ اللہ کی زیست کا ہر لمحہ دین کی خدمت کے لئے وقف تھا، ایک طرف تدریس سے علم کی شمع کو جلائے رکھا، دوسری طرف تالیف وتصنیف سے پرورش لوح وقلم کرتے رہے، تیسرا پہلو دعوتی اصلاحی بیانات کا تھا جس سے ایک صالح معاشرہ کی تعمیر کررہے تھے۔ انسان کی خوبیاں پس مرگ زیادہ واضح شکل میں نمایاں ہوکر آتی ہیں۔ ایک روشن اور نمایاں پہلو سخاوت وفیاض کا تھا، اگر ایک طرف وہ اہل وعیال کے لئے ایک سائبان کی طرح تھے تو دوسری طرف مفلوک الحال اور غریبوں اور مالی اعتبار سے پریشان خلق خدا کی خاموش خدمت کیا کرتے تھے۔ وہ لاچار ومجبور بندوں کے لئے امید کی کرن تھے، زندگی کے آخری لمحات کا اختتام بھی اسی خدمت کو انجام دیتے ہوئے وہ دنیا سے چلے گئے۔

مولانا جس خانوادہ کے فرد تھے اس خاندان میں یہ ستودہ صفات تو روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ علم وحکمت ، دعوت وتبلیغ، انسایت کی مسیحائی، صبر وشکر فقر وغنا، ایثار وقربانی جیسی دولت سے یہ خاندان متصف رہا۔ اس خاندان سے آبروئے دین برحق امت مسلمہ ہندیہ کو ملتے رہے، جس نے ہر دور میں امت کی قیادت کے ساتھ دینی اداروں، انجمنوں کی قیادت کی ،اسی خاندان کے افراد نے احیاء دین، تحفظ دین، اسرار مقاصد شریعت کی حفاظت کی، جن کی ضمیر میں اسلام کا جوہر چمکتا اور دلوں میں درد انسانیت کا دریا بہتا رہا۔ اللہ شاد وآباد رکھے!!

مولانا کی مقبولیت کا اندازہ ان کے جنازہ میں خلقت کے ہجوم سے لگایا جاسکتا ہے، انسانی سیلاب امنڈ آیا۔ لوگ دور سے بھی آئے قریب سے بھی، خاص بھی اور عام بھی، طلباء بھی اساتذہ بھی، تعلق والے بھی غیر تعلق والے بھی، چھوٹے بھی اور بڑے بھی یہ عند اللہ مقبولیت کی دلیل ہے۔

اے جانے والے! کتنی سادہ تھی تری زندگی، تو کتنا خوش کلام وخوشخصال تھا، اپنے خاندان کا تو نیک نام تھا، ترے اندر آداب اسماعیلی تھی، والدین کے لئے ترے باز و اخفض لهما جناح الذل کی عملی تفسیر تھی، دوست واحباب اپنوں اور غیروں کے لئے ترا انداز لقاء وجہ طلق تھا، کسقدر تری تحریریں ملت کے زوال او ر امت کی نکبت پر روئیں، تو اسلام کے غلبہ کی تمنا وحسرت لے کر لحد کے گوشہ میں اتر گیا، لیکن تو نے اپنی آنکھوں سے شام کی فتح مبین کے پرچم کو لہراتا ہوا دیکھ لیا، لقائے رب سے قبل ترے کانوں نے فلسطین کی فتح وظفر مندی کی گونج کو سنا، اور تری زندگی کی آخری تحریر نے انبیاء کی سرزمین پر اسلام کے غلبہ اور انصار کی مبارک بادی اور خوشخبری سنائی دی تھی، تری خدمت خلق داد دہش کا باب تو ترے اٹھ جانے کے بعد کھلا، تو اپنے عیال کی لئے اگر مثل سائبان تھا ،تو حاجت مندوں کی مدد سے تو نے اپنی روح کی راحت وآسودگی کا سامان کیا۔ ترے جانے کے بعد فلسطین کی سرزمین پر مظلمین غزہ کے کیمپوں میں بطور ایصال وثواب پانی کی تقسیم عند اللہ تری مقبولیت کی دلیل ہے اور یہ حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی میں شہادت ہے کہ تو نے اس میں زرہ برابر کوتاہی نہیں کی۔ بس تجھے اب کیا لکھوں، ہر لمحہ تری یادوں کا تاباں ودرخشاں، ترا جسم خاکی درمیان میں نہیں، مگر تری شرافت ومروت، نقوش وفکر وعمل مدتوں ذہن میں مرتسم رہیں گے:

خدا رحمت کنند ایں عاشقانِ پاک طینت را

☆☆☆☆☆

ملنسار اور خورد نواز چچا کی رحلت

سید شعیب حسینی ندوی☆

ہر خاندان اپنی تاریخ رکھتا ہے اور اسے ہمیشہ یاد بھی رکھتا ہے، خاندانی روایات اور خصوصیات نسلوں میں منتقل ہوتی ہیں، لیکن طبیعتیں اور مزاج سب کے جدا جدا ہوتے ہیں، ایک چھت کے نیچے رہنے والے ایک دوسرے سے جداگانہ شخصیت کے مالک ہوتے ہیں، علمی لیاقت، ہنرمندی اور صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، لیکن خاندانی شرافت اور روایات کی پاسداری بالعموم افرادِ خاندان کا شیوہ ہوتی ہے۔

مولانا جعفر مسعود حسنی رحمہ اللہ جن کو ہم 'چچاجی' کہہ کر بلایا کرتے تھے خاندانی شرافت و وجاہت کے امین تو تھے ہی اور علم وادب کے شہسوار بھی تھے لیکن نجی اور گھریلو زندگی میں آپ کی نمایاں خصوصیت دلداری اور ملنساری تھی، چھوٹوں پر شفقت اور محبت بھرا برتاؤ آپ کا امتیازی وصف تھا، لہجہ میں شگفتگی لیکن تنبیہ کی حدت، پیار بھرا انداز لیکن تربیتی نظر، طنز ومزاح کی باتیں لیکن محنت پر ابھارنے اور فکرمندی دلانے کی نصیحتیں، سادہ زندگی لیکن دوسروں کی خدمت ومدارات میں سب نچھاور کرنے کا جذبہ، خود موٹے جھوٹے پر گزارا کرنا لیکن مہمان کے لیے تمام ممکنہ سہولیات مہیا کرنا، ضیافت واکرام میں سبقت لے جانا لیکن تکلف وتصنع سے ہمیشہ گریز کرنا اور نہ جانے کتنے ہی گوناگوں کمالات کا مجموعہ آپ کی شخصیت میں موجود تھا۔

وہ میرے والد کے خالہ زاد بھائی تھے؛ لیکن حقیقی چچا جیسا معاملہ کرتے، ہمارا اور ان کا گھر ملا ہوا تھا تو صبح وشام آنا جانا لگا رہتا، ان کے فرزندگان ہمارے بھائی اور قریبی دوست ہیں جن سے بے تکلف مجلسیں خوب لگا کرتی تھیں تو ان کے گھر میں جب ہم ہوتے تو کبھی ایسا نہیں لگتا کہ ہم دوسرے گھر میں ہیں بلکہ اپنا ہی گھر معلوم ہوتا، چچاجی بچوں سے خوب دل لگی کیا کرتے ان کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگاتے اور انعامات دیتے، گھر کی صفائی ستھرائی اور چیزوں کو قرینے سے رکھنے کا خاص اہتمام کرتے اور بچوں کو بھی اس میں لگاتے، بچوں میں بیٹھتے تو ان جیسا بن کر ان سے ہنسی مذاق کرتے، تفریح کی باتوں میں ادبی رنگ ہوا کرتا، کھانے پینے کی چیز یا حلوا کمرے میں رکھا ہوتا تو سب میں بانٹتے اور اپنے بیٹوں سے کہتے کہ بھئی وہ چیز لا کر اپنے ان بھائیوں کو کھلاؤ۔

ایک اہم بڑی گھریلو خصوصیت اولاد کی اور چھوٹوں کی تربیت کا ذوق، بلکہ ملکہ آپ میں تھا، مجھے خوب یاد ہے آپ کے دوسرے بیٹے سید امین حسنی جو ہمارے ہم عمر ہیں، ان کا حفظ چل رہا تھا اور گرمی کی چھٹیوں میں وہ رائے بریلی سے لکھنو آئے ہوئے تھے تو کس اہتمام کے ساتھ ان کو قرآن پڑھنے کے لیے بٹھاتے اور خود نگرانی کرتے اور سبق مکمل کرنے کی شرط پر ہی کھیل کود کی اجازت دیتے اور خود بیٹھ کر سنا کرتے اور پورا وقت اولاد کے لیے فارغ کر لیتے تھے۔

آپ کا عربی ادب کا خاص ذوق تھا، عرب ادباء کو خوب پڑھا کرتے تھے، اپنے گھر میں جب کمپیوٹر خریدا اور انٹرنیٹ لگایا تو اہتمام سے عرب اخبارات اور عربی میگزین پڑھنے کا معمول تھا، پھر ہم لوگ کے ساتھ بیٹھتے تو اس پر تبصرے کرتے اور عالمی حالات پر اپنی رائے پیش کرتے اور تنقیدی جائزہ لیتے، خاص بات جس طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ اپنے بچوں کو عربی پڑھنے اور لکھنے کی مشق کرانا ہے، آپ پوری توجہ سے عربی انشاء پردازی کی مشق کراتے اور عربی پرچے پڑھنے کا حکم دیتے اور عربی میں بول چال کی ترغیب دلاتے، اور اپنے لڑکوں کی کام مکمل نہ کرنے پر سخت سرزنش بھی کرتے۔ عربی کے ساتھ انگریزی زبان پر مہارت پیدا کرنے کی بہت تاکید کرتے، اور کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے کہ انگریزی سیکھی اور پڑھی جائے، مجھے یاد ہے آپ کی ہی توجہ اور فکر سے انگریزی کوچنگ سنٹر اور ماہرین زبان سے سیکھنے اور پڑھنے کا خاندان کے لڑکوں میں رواج ہوا، اور خود ان کے بیٹوں کے علاوہ اور بھی لڑکوں نے اس میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔

فکری موضوعات اور بین الاقوامی معاملات پر آپ خوب نظر رکھتے تھے اور کھل کر گفتگو کیا کرتے تھے، مجھے یاد ہے بارہا مشرق وسطی کے مسائل اور مختلف تحریکات پر طویل طویل مباحثے ہم ان سے کرتے اور وہ بڑے شرح وبسط سے اپنے تجزیے پیش کرتے اور ہمارے سوالات کے جوابات دیتے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ ہماری رائے کو بھی اہمیت سے سنتے اور درست لگتی تو نہ صرف قبول کرتے بلکہ اس کی ستائش کرتے۔

چچاجی کی رحلت علمی خسارہ تو ہے ہی؛ لیکن بڑا خاندانی نقصان بھی ہے، ایک شفیق چچا اور مہربان بڑا گھر سے رخصت ہو گیا، اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور کروٹ کروٹ چین نصیب کرے۔

☆☆☆☆☆

☆ منگلورو، کرناٹک

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

محمد سعد خاں ندوی☆

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی حادثاتی موت پر یقین کرنا تو مشکل ہو رہا تھا؛ لیکن حقیقت تھی جس کو تسلیم کرنا ہی پڑا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ خاندان حسنی کے مجاہدانہ وراثت کے امین اور اسی کڑی کے ایک عظیم شخص تھے جو خوش خلقی، ملنساری، سادگی اور خاندانی شرافت کی وجہ سے بہت ممتاز تھے پورے ملک میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں یہ خاندان اپنی سادگی اور تواضع کے لیے پہچانا جاتا ہے شاید اسی وجہ سے ملک کا اکثر طبقہ ان سے محبت کرتا ہے، ہمارا تعلق ندوی ہونے کی وجہ سے اہل ندوہ سے عموماً اور اس خاندان کی شرافت ونجابت کی وجہ سے خصوصاً رہا ہے جو بھی ندوے سے کانپور آتا ہے اس سے ملاقات ضرور ہوتی ہے

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی سے کانپور اور لکھنؤ میں حالیہ ملاقاتیں رہیں اور کانپور میں ہونے والی تحفظ اوقاف کانفرنس کے موقع پر تو عصر سے لے کر دیر رات لکھنو واپسی تک ساتھ رہے، ناشتہ اور کھانا بھی ساتھ کھایا، ایسا لگتا تھا کہ جو لوگ مولانا کو لکھتے ہیں ماہر انشاء پرداز یا معروف صاحب طرز ادیب تو وہ صرف لکھتے ہی نہیں ہیں بلکہ مولانا جو کچھ بولتے ہیں وہ ادبی شہ پاروں کی لڑی ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے جڑی ہو، اور ان کے الفاظ اس کی حقیقی نمائندگی کرتے ہیں، اور جب لکھتے تھے تو بھی اسی طرح کہ قاری تسلسل اور روانی کے ساتھ پڑھتا چلا جائے۔

آپ کی ایک اہم صفت غیر ضروری باتوں سے اجتناب، کم بولنا یہ اپ کی ایسی صفت تھی جو آپ کے والد ماجد عالم اسلام کی مشہور شخصیت حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ میں پنہاں تھی جو جدید عربی زبان وادب کے ماہر، ناقد، صحافی اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس صفت نے اچھے اچھوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اور یہ بہت ہی زبردست تھی جبکہ دیگر کو اگر موقع مل جائے تو غیر ضروری چیزیں تقریر میں بھی بولتے رہتے ہیں اور اپنی واہ واہی میں پتہ نہیں کیا کیا بول جاتے ہیں۔

کانپور کے اس پروگرام کے بعد آپ کو لوگوں نے ایک بہترین مقرر کی حیثیت سے بھی جانا، ملک کے مشہور کئی علمائے کرام نے تقریریں کیں لیکن بعد میں اگر کسی کی تقریر کی تعریف ہوی تو صرف آپ کی اور آپ ہی کی ویڈیوز زیادہ نشر ہوئی کیونکہ اس میں آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اوقاف کے خلاف بل تو آج پیش ہوا ہے، لیکن اصل مجرم ہم اور آپ ہیں، حضرت مولانا نے سوال کیا کہ اوقاف کو بیچنے، ناجائز قبضہ کرنے، کم کرایہ دینے، کرایہ بڑھانے کی بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہونے، مساجد، مدارس کے مکانات اور قبرستانوں کی زمینوں پر پلاٹنگ کرکے مکانات کی تعمیر اور درگاہوں کی زمینوں کو بیچنے والے کون ہیں؟ ان تمام کاموں میں ہم اور آپ ہی شامل ہیں۔

فرمایا تھا کہ حضورؐ کا فرمان ہے لوگوں کو ظلم کرنے سے روکو، اس لئے ہماری ذمہ داری ہے کہ اگر ہمارے کسی بھائی، باپ، بیٹے، رشتہ دار، دوست، ساتھی، پڑوسی نے وقف کی املاک پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے یا کم کرایہ دیتا ہے تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو سمجھائیں، یہاں پر ہم دین وشریعت کو سمجھیں، یہ نہ دیکھیں کہ کس سے ہمارا کیا رشتہ اور تعلق ہے۔

سادہ مزاجی شہرت اور ناموری سے بہت دور، آپ اپنے آپ کو اس سے بہت بچاتے اور اس وقت کے موجودہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کو بھی اس چیز سے بالکل پاک صاف پایا، بہت دور بھی ان کی کوئی تعریف کرے، غیر ضروری بڑھا چڑھا کر آداب والقاب سے پکارے تو مناسب نہ سمجھتے تھے اور نہ ہی اپنی تعریف کراتے، کانپور کے مشہور سینئر صحافی جناب عثمان قریشی نے تحفظ اوقاف کانفرنس کے دوسرے دن ہمارے دواخانہ پر آکر یہ بتایا کہ ندوہ کے ایک بڑے مولانا آئے تھے پروگرام میں، میں نے ان جیسا سادہ مزاج بہت کم علماء کو دیکھا ہے لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ اتنے بڑے ادارے کے ذمہ دار ہیں اور رات کھانے کے موقع پر جب دیر ہونے لگی تو مولانا نے ہم سب سے کہا جو کچھ موجود ہے کھا لو تاکہ ہم لوگ لکھنؤ کے لیے جلدی نکل جائیں اور بغیر کھانا کھائے، کھانے سے قبل جو چیزیں موجود تھیں وہ کھا کر لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے تھے، اس موقع پر مولانا عاشق الٰہی ندوی اور ندوے میں مہمان خانے کے ذمہ دار حافظ مصباح صاحب بھی موجود تھے۔..................

..................بقیہ صفحہ ۱۴۸ پر

☆ کنوینر حلقہ پیام انسانیت، ضلع کانپور یوپی

مولانا جعفر مسعود ندویؒ کا اسلوبِ نگارش

محمد فہیم عبدالخالق ندوی☆

مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ سابق ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۳ر ستمبر ۱۹۶۵ء - ۱۵ر جنوری ۲۰۲۵ء)، ایک ممتاز ادیب، کہنہ مشق خطیب، تجزیہ نگار، نقاد اور مترجم تھے، تدریسی تجربہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان وادب اور صحافت کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، فکر اسلامی آپ کا خاص موضوع تھا، فکر اسلامی کی تشریح وتوضیح اور غیر اسلامی افکار کے ابطال وتردید میں آپ کا خامہ آبدار شمشیر جوہر دار بن جاتا تھا۔

آپ اعتدال ووسطیت کی صفت سے متصف تھے، ندوۃ العلماء میں منعقد ہونے والی تعزیتی نشست میں آپ کے اوصاف جمیلہ کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا: ”ان کی شخصیت مقناطیسی شخصیت بنتی جارہی تھی، مقناطیس میں لوہے کے ذرات کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اللہ کے بندے اس نیک بندہ کی باتوں اور اس کی طرف اسی طرح جذب ہوتے ہیں جس طرح مقناطیس کی صلاحیت ہوتی ہے، آپ نے مزید فرمایا: ”مولانا نے عالم میں دعوت کا اور علم کا پرچم لہرایا، آپ کی کتابیں بڑی وقیع ہیں، کم ہیں؛ لیکن وہ اپنی حیثیت آپ ہیں، آپ ولد الامین کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوئے، انسان کوشش کرتا ہے کہ اس کو ایسا صالح خاندان ملے جہاں اس کی تربیت اعلی طریقہ سے ہوسکے، اور آپ نے ایسے ہی خانوادہ (حسنی خانوادہ) میں تربیت پائی تھی“۔

آپ عربی جریدے الرائد کے چیف ایڈیٹر، ادب اطفال کے خصوصی ایڈیٹر اور ندوۃ العلماء کے ناظر عام تھے، عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے جنرل سکریٹری اور بعد میں صدر کی حیثیت سے آپ نے خدمات انجام دیں۔

آپ کے بیان میں بے باکی اور تجزیہ نگاری کا عکس دکھائی دیتا ہے، اور تحریر میں سلاست و وضاحت کے ساتھ ساتھ شگفتگی پائی جاتی ہے، آپ کے اسلوب نگارش کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے آپ کے والد گرامی حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنیؒ ندوی (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) لکھتے ہیں: ”ان کے اسلوبِ نگارش اور مضامین کی دو خصوصیتیں ہیں، ایک لطافت ومعلومات اور دوسرے حالات حاضرہ سے ان کا تعلق“۔ آپ کے اسلوبِ نگارش میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا عکس جمیل نظر آتا ہے، آپ کے والد گرامی لکھتے ہیں: ”مولوی جعفر مسعود حسنی ندوی نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو بہت پڑھا ہے اور ان کے اسلوبِ نگارش سے متاثر ہیں، اس کی جھلک ان کے مضامین میں آجاتی ہے“۔ آپ کی تحریر میں تنقید وطنزیہ اسلوب کا بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اور چونکہ طنزیہ اسلوب اس عہد کے لیے موزوں اور اس کے لیے تاثیر بخش بھی ہے، آپ کے والد گرامی لکھتے ہیں: ”جبر وقہر کے ماحول میں رمزیت وجود میں آتی ہے، اور اس کی مثالیں تاریخ ادب میں ملتی ہیں، اس لیے طنزیہ اسلوب اس عہد کے لیے مناسب اور مؤثر معلوم ہوتا ہے“، اور مولانا محمد علاء الدین ندوی فرماتے ہیں: ”جس معاشرہ میں تنقید وطنز پر پابندی عائد کردی جاتی ہے تو اس معاشرہ کی ترقی رک جاتی ہے، پھر وہ معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا“۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) آپ کے طرزِ تحریر وادبیت اور اسلوب تجزیہ نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں: ”وہ طرزِ تحریر میں جداگانہ رنگ رکھتے ہیں، واقعات کے تجزیہ اور اس سے مثبت ومنفی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرنا، اور اس کے لیے نہایت مؤثر اور عبرت انگیز نتائج نکالنا، ان کی خاص پہچان ہے، میں جہاں تک سمجھتا ہوں ان کے منفرد اسلوب بیان کی یہی دراصل امتیازی شان ہے، ان کے اسلوب تحریر میں میں نے محسوس کیا کہ اس ملک کے صاحب طرز ادیب مولانا دریابادی کا رنگ بھی کسی حد تک شامل ہے“۔

آپ کی تحریر تکلفات سے پرے سادہ سانچے میں ڈھلے الفاظ کا بہترین مرقع ہوتی ہے، چنانچہ آپ اپنی کتاب ”دعوت فکر ونظر“ کے بارے میں لکھتے ہیں: ”یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس میں کوئی خوبی ہو نہ ہو اتنا ضرور ہے کہ طبی اصطلاح میں اس کا کوئی سائڈ ایفیکٹ نہیں، پڑھنے میں نہ کسی طرح کا اندیشہ، اور نہ دینے میں کسی طرح کا کوئی خطرہ“۔ اس کے بعد لکھتے ہیں: ”لکھنے والے نے جو لکھا دل کے یقین کے ساتھ لکھا، کسی واقعہ یا خبر سے متاثر ہوکر لکھا، سماج کو سامنے رکھ کر لکھا، اپنی نادانیوں اور دوسروں کی عیاریوں کو سامنے رکھ کر لکھا، ہلکے پھلکے انداز اور ہلکی پھلکی زبان میں لکھا ہے، اور جو بھی

☆ شعبۂ تدریب علمی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

لکھا ہے ایک آئینہ کے طور پر اس کو آپ کے ہاتھ میں دینے کی کوشش کی، یہ کتاب نہیں ایک آئینہ ہے، اور ہم میں سے ہر شخص اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے، لکھنے والا بھی، پڑھنے والا بھی، موافق بھی مخالف بھی، دوست بھی، دشمن بھی، فرد بھی، جماعت بھی منتظم بھی اور منتظم کا ماتحت بھی، خدا کرے یہ آئینہ اپنا کام کرے، اور ہم سب کو سنورنے کا موقع فراہم کرے''۔

آپ کسی واقعہ کی منظر کشی کرتے تو اس انداز سے منظر و پس منظر کو الفاظ و تعبیرات کا جامہ پہناتے کہ قاری کو پڑھنے میں اکتاہٹ ہوتی اور نہ واقعہ کی طوالت کا خوف ہوتا، یوں کہہ لیجیے کہ سمندر کو کوزہ میں پیش کرنے کا ہنر آپ کو خوب آتا تھا، یوم خواتین کی ڈھلتی شام اور آخری ترجمان خواتین کی پرفارمنس کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جب دن ڈھلا اور خواتین کے سلسلہ کا یہ پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا، تو ڈنمارک کی ایک خاتون نے دنیا کی تمام خواتین کی نمائندگی کرتے ہوئے اسٹیج پر آکر پروگرام کا آخری آئیٹم پیش کیا، پوری دنیا کی نظریں اس پروگرام پر لگی ہوئی تھیں، پریس رپورٹس اس کی منظر کشی کے لیے قلم تھامے بیٹھے تھے، فوٹو گرافرس اس کی فلم بندی کے لیے پوری طرح تیار تھے، اور مغربی دنیا کے تمام بڑے چینلس اس کو نشر کرنے کے لیے بے قرار تھے، آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور مہذب دنیا کی ایک خاتون برقع کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوئی، برقع اترا، ہوا میں لہرایا، لائٹر سے ایک شعلہ نکلا، اور مہذب دنیا کی اس مہذب عورت نے اپنی عزت و ناموس کے محافظ برقع کو آگ لگا کر اسلامی تہذیب پر مغربی تہذیب کی فتحیابی کا اعلان کیا، تالیاں بجیں، نعرے لگے، جام چلے، جسم لڑھکے اور یوم خواتین دھیرے دھیرے جشن فتح میں تبدیل ہوتا گیا''۔

جملہ بندی اور ترتیب زمانی کا خیال رکھتے ہوئے جب آپ کسی کے اوصاف و کمالات بیان کرتے تو اسلوب سادہ مگر دلچسپ ہوتا، ثقیل الفاظ کو صیقل کرکے اس انداز سے موتیوں کو لڑی میں پروتے کہ پڑھنے میں بھلے اور سننے میں شائستہ معلوم ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال: ''میرے ایک دوست محمد انکشاف گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لیے دبئی سے ہندوستان آئے، ملاقات ہوئی، باتیں ہوئیں، اور باتوں ہی باتوں میں ذکر چھڑ گیا گوری چمڑی والوں کا، ان کی تہذیب وتمدن کا، نظم وضبط کا، اخلاق وادب کا، ڈسپلن وشائستگی کا، محنت ولگن کا، پلاننگ اور طویل منصوبہ بندی کا، یہ الگ بات ہے کہ یہ سفید فام اپنی ذات میں کتنے ہی مہذب، متمدن، منصف مزاج اور با اخلاق کیوں نہ ہوں، مقصد ان کے سامنے ایک ہی ہوتا ہے، وہ یہ کہ ہر حال میں، ہر طرح سے، ہر معاملہ میں، ہر سطح پر اپنی بالادستی قائم رکھی جائے''۔

آپ کے کلام میں تفہیم واحتساب کا پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے سامنے ایک مجمع بیٹھا ہو اور مجمع کا محاسبہ کرکے انہیں تعلیم سے آراستہ کر رہے ہوں، چنانچہ آپ اپنی ایک تحریر میں پہلے یورپ کی نفس پرستی، مادہ پرستی، دولت پرستی، مطلب پرستی، عیش پرستی، انانیت پرستی اور ہوس پرستی کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد مسلم معاشرہ کا تجزیہ اس انداز سے کرتے ہیں جیسے کوئی خطیب منبر سے عوام الناس کو سمجھانے کی پیہم کوششیں کر رہا ہو: ''مسلم معاشرہ کی زبوں حالی دیکھ اور اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت، اسلامی آداب، اسلامی اخلاق، اسلامی سیرت، اور اسلامی شریعت سے ان کی دوری دیکھ کر امیدوں کے ان چراغوں کی لو دھیمی ہونے لگتی ہے، اور دل میں یہ سوچ کر مایوسی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے کہ اگر یورپ کی تباہی و بربادی کے راستہ پر پڑ جانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی معاشرت دین مسیح کی تعلیمات کے تابع نہیں، وہاں کا طرزِ زندگی شریعت عیسوی کے مطابق نہیں، اس کے معاملات، طور طریق، رہن سہن، خدائی قانون کے موافق نہیں، تو کیا اسلامی دنیا کا موجودہ معاشرہ قرن اول کے مدنی معاشرہ سے کوئی میل رکھتا ہے؟ کیا عقیدہ کی ضمانت لی جاسکتی ہے؟ کیا معاملات کے سلسلہ میں اطمینان کا اظہار کیا جاسکتا ہے؟ کیا موجودہ اخلاق کو اسلامی اخلاق کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا طرز زندگی کو سنت وشریعت کے مطابق مانا جاسکتا ہے؟ کیا ہماری تجارت اسلامی اصول پر پوری اترتی ہے؟ کیا ہماری زراعت اسلامی شرائط کو پورا کرتی ہے؟ کیا وراثت وترکہ کی تقسیم اسلامی فقہ کی بنیاد پر ہوتی ہے؟ اکثریت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقیناً آپ کا جواب ہوگا نہیں......نہیں''۔

الغرض آپ کے اسلوبِ نگارش میں متانت، فکر وخبر، تحقیق ونظر، تفہیم کی وسعت، الفاظ کی جامعیت کے ساتھ ساتھ ادبیّت، واقعہ نگاری و منظر کشی، طنز وتنقید کا عکس اور ترتیب وتسہیل کا توازن دکھائی دیتا ہے، کسی موضوع پر جب آپ قلم اٹھاتے تو کہیں اس میں تسہیل سے کام لیتے اور کہیں مسجع مقفع کلام کا استعمال کرتے تھے، اور اساطین علم وفن کے اقوال ذکر کرکے اپنی بات کو محقق اور اسلوب کو فنی بنا کر پیش کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆

استاذ محترم کی انفرادیت

سید محمد عفان ندوی☆

ہمارے مشفق وکرم فرما استاذ محترم جناب مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی - رحمہ اللہ - کے اچانک سانحہ ارتحال نے ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، کافی دنوں تک یقین ہی نہیں ہوا کہ استاذ محترم اب ہمارے درمیان نہیں رہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کچھ ہی وقت میں مولانا درس کے لئے تشریف لائیں گے، اور ہم طلباء مولانا کے علمی، ادبی، فکری دروس سے فیضیاب ہوں گے۔

استاذ محترم ستودہ صفات کے حامل، ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ، کامیاب مدرس، ماہر مربی، انتہائی بردبار، دوراندیش، دوررس تھے۔

مولانا طلباء کی نفسیات سے بخوبی واقف، بڑے حساس مصلح ومفکر، باشعور ادیب، بے باک صحافی، عمدہ منتظم تھے یہ وہ خوبیاں ہیں جو نایاب نہ صحیح تو کمیاب ضرور ہیں، نیز استاذ محترم کے کچھ اوصاف ایسے بھی ہیں جن میں وہ منفرد نظر آتے ہیں:

۱- حقیقت پسندی: اللہ تعالیٰ نے مولانا کے اندر یہ صفت بدرجہ اتم رکھی تھی، یہاں تک کہ ان کی جسمانی ساخت بھی اس وصف کی عکاسی کرتی نظر آتی تھی، ان کا برتاؤ خیالات یا خواہشات کے بجائے دنیا کی حقیقتوں سے زیادہ تعلق رکھتا تھا، وہ حالات کا گہرائی سے تجزیہ کرتے اور قرآن وحدیث اور تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے حالات حاضرہ کے تناظر میں مسائل کا پریکٹکل حل پیش کرتے۔

وہ کاموں کو معقول طریقے سے انجام دینے کی کوشش کرتے اور عملی بنیادوں پر فیصلے فرماتے، ان کی نظر نتائج پر زیادہ ہوتی تھی، وہ علمی جواب سے زیادہ عملی وحقیقت پسندانہ جواب دینے کے قائل تھے، مولانا کی یہ امتیازی خصوصیت ان کے اقدامات، دعوتی واصلاحی خدمات میں صاف نمایاں ہوتی ہے۔

۲- آفاقی فکر: استاذ محترم ایک بلند پایہ مفکر تھے اور اکبر الہ آبادی کے توصیفی کلمات کے مکمل ترجمان نظر آتے ہیں ”اور ندوہ ہے زبان ہوشمند“، فکری لحاظ سے وہ اپنے والد مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمہ اللہ کے حقیقی وارث اور فکر بوالحسن کے سچے ترجمان تھے، مولانا نے قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ تاریخ کا اور مغربی افکار کا بخوبی مطالعہ کیا، انہوں نے مغربی تمدن کی ناکامی، اور مغربی مفکرین کی کج فہمی، مغرب زدہ علاقوں کی بے کیف زندگی، اور یورپ وامریکا میں اخلاقی گراوٹ کا بخوبی ادراک کیا اور وہاں کی اس صورتحال کو عیاں کرتے ہوئے اسلامی نظام حیات کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کیا، ان کی فکر صحیح اسلامی فکر کا نمونہ تھی جس کا عکس مولانا کی تقریر وتحریر میں صاف طور پر نظر آتا ہے، ان کے اردو مقالات کا مجموعہ ”دعوت فکر ونظر“، اور عربی مقالات کا مجموعہ ”خواطر“ میں اس فکر کی آفاقیت کو محسوس کیا جاسکتا ہے، اسی طرح مولانا فکرسازی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔

۳- حکمت: علم، تجربہ، سمجھ، عقل وبصیرت کا استعمال کرتے ہوئے سوچنے اور عمل کرنے کی صلاحیت کو حکمت کہتے ہیں، استاذ محترم کا طرز تحریر، اسلوب نگارش حتی کہ انداز گفتگو بھی حکیمانہ اور پرکشش تھا، ان پر جو ذمہ داریان عائد تھیں ان کو جس خوش اسلوبی سے انہوں نے انجام دیا اور جو فیصلے لئے وہ حکیمانہ پہلو کی ایک جھلک ہے: ”ومن يؤت الحكمة فقد اوتی خیراً کثیراً“۔

۴- وقت کو غنیمت جاننا: ”نِعمتان مغبونٌ فيهما كثيرٌ من النَّاسِ: الصِّحَّةُ والفراغُ“ استاذ محترم کی ایک بڑی خوبی تھی اس دور کے لوگوں کے لئے اور خصوصا ہم طلباء کے لئے جو عبرت کا سامان ہے وہ یہ کہ مولانا وقت کے ضیاع سے گریز فرماتے تھے، اور موبائل کا استعمال بالکل برمحل کرتے، ایسا استعمال موجودہ دور میں کم دیکھنے کو ملتا ہے، نو منتخب ناظر عام ندوۃ العلماء مولانا سید عمار حسنی ندوی دامت برکاتہم نے بتایا کہ وہ موبائل میں عربی ڈبیٹ، عربی خبریں اور علماء عرب کے خطبات سنتے تھے اور مسلسل اپنے علم میں اضافہ کی کوشش میں رہتے، مولانا اسفار میں بھی وقت کو ضائع نہ کرتے یا تو قرآن مجید سنتے ورنہ کسی کام میں مشغول رہتے۔

۵- داد ودہش: عموما اس بلند سطح کے لوگ دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتے چہ جائیکہ فقراء وغرباء سے دوستی کریں، لیکن اس بندۂ خدا کی اکثر دوستی غرباء ومساکین سے تھی، یہ استاذ محترم کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں وہ بالکل ہی منفرد نظر آتے ہیں، استاذ محترم کے گھر کے افراد سے یہ بات موصول ہوئی کہ تنخواہ کا ایک بڑا حصہ وہ نہایت پوشیدہ طور پر خیر کے کاموں میں خرچ کردیتے، کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے، بہت سی چیزیں ان کی وفات کے بعد آشکارا ہوسکیں، نیز اپنے بچوں کو بھی ”فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ“ کی نصیحت کرتے اور فرماتے کہ فقراء کی خوب مدد کرو اور اگر کوئی نئی چیز خریدو تو فوراً کچھ رقم صدقہ کردو۔

☆☆☆☆☆

☆متعلم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا رحؒ اپنے اخلاق و کردار کے آئینہ میں

قیس خان جالونی ☆

حدیث شریف میں صریح علامات قیامت میں سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا یعنی اس روئے زمین سے علمائے ربانیین اٹھتے جائیں گے۔

۱۵/جنوری ۲۰۲۵ء بروز بدھ بوقت عشاء معروف عالم دین، صاحب طرز عربی ادیب ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر رابطہ ادب اسلامی بر صغیر مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنی ندوی کے ساتھ رائے بریلی میں سڑک حادثہ کی خبر بجلی بن کر گری، لیکن کوئی مطمئن نہیں تھا، کشمکش کا ماحول تھا اور طلبہ اس بات کو ماننے کے لیے بالکل تیار نہ تھے، بالخصوص ہم بھی، کیونکہ آج ہی ہم ان کی صدارت میں تقسیم انعامات کے دعوت نامے کو تقسیم کر رہے تھے اور ہم ان کے دست مبارک سے بروز سنیچر انعام وصول کرنے والے تھے، خیر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا کیونکہ:

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی

اس کو پڑھ کر ڈھارس تو ہم باندھ رہے تھے؛ لیکن آگے اور درد وکرب تھا کہ:

تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

یعنی اسی سادگی کے ساتھ موٹر سائیکل سے سفر کرتے ہوئے اچانک اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے، جس میں انھوں نے پوری زندگی بسر کی تھی۔

مولانا ابھی ہمارے درمیان جدھر دیکھو بغیر کسی پروٹوکول کے ندوے میں اکیلے چلتے پھرتے سلام کرنے میں پہل کرتے نظر آتے تھے مولانا کے بارے میں کوئی سوچ بھی کیسے سکتا تھا کہ ان کا وقت اس دنیائے فانی سے ختم ہوگیا ہے ابھی تو مولانا کے ندوے میں کچھ ہی وقت گذرا تھا کہ جان جاں آفریں کے سپرد کردی، اور رب کریم کے جوارِ رحمت میں منتقل ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ والد محترم حضرت مولانا محمد واضح رشید رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ اور اپنے عم مکرم مرشد الامت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست گرفتہ تھے، اس لیے ان کے اندر والد محترم کی وسعت علم وفکر اور عم مکرم کی نظر شفقت و محبت کے روحانی اثرات نمایاں تھے۔

وہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آنے سے پہلے مدرسہ عالیہ عرفانیہ چوک لکھنؤ میں بحیثیت مدرس رہے، گویا تنخواہ زیادہ ہونے کے باعث مولانا کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور آپ نے ماہانہ تنخواہ تقسیم کرنے کا معمول بنالیا اور اپنی سادگی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا اور آپ اسی پرانی موٹر سائیکل سے ہی چلتے رہے اور ناظر عام بننے کے بعد بھی یہی معمول رہا، اور کسی طرح برتاؤ اور طور طریق میں بدلاؤ نہیں آیا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دار العلوم ندوۃ العلماء کو ان کے علم وفضل کا غیر معمولی فائدہ پہنچا، طلبہ نے تحریر وتدریس میں ان سے خوب فائدہ اٹھایا، مولانا کے ''الرائد'' میں شائع ہونے والے مضامین طلباء میں بہت مقبولیت کے حامل تھے، طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت بڑی حکمت وبصیرت کے ساتھ فرماتے، وہ پندرہ روزہ ''الرائد'' کے رئیس التحریر تھے اور ان کے فکری وادبی مضامین سے علماء، دانشوران اور طلبہ کو بہت فائدہ پہنچا۔

مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کے انتقال کے بعد وہ مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کی جگہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظر عام بنے اور نہایت خاموشی وسنجیدگی کے ساتھ تاحین حیات ہر ممکن اس کا حق ادا کرتے رہے۔ مولانا مرحوم اپنے دینی، دعوتی اور تربیتی مضامین کے ساتھ اسلام مخالف مضامین کو بڑے واضح اور مدلل انداز میں بے نقاب کرتے، ان کے وقیع مضامین ندوہ کے عربی رسائل ''الرائد'' اور ''البعث الاسلامی'' میں چھپتے تھے، اس کے علاوہ اردو میں ''تعمیر حیات'' اور راشٹریہ سہارا کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات میں شائع ہوتے تھے، انہیں اردو مضامین کا مجموعہ ''دعوتِ فکر ونظر'' کے نام سے منظر عام پر لایا گیا تھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا ایک ماہر عربی ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اسلوب ماجدی کے امین تھے، مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ لکھتے ہیں کہ انہوں نے عبدالماجد دریا بادیؒ کو اتنا زیادہ پڑھا ہے کہ ان کے اندر ان کا تحریری رنگ غالب آ گیا ہے۔

مولانا مرحوم ملک وبیرون ملک کے سیمیناروں میں بھی شریک ہوتے اور بڑے مفید اور معلوماتی مقالے پیش کرتے رہے، مولانا کے محاضرات بہت مقبولیت کے حامل تھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مولانا کے سامنے بشکل سامعین افکار والفاظ کا مجموعہ ہو اور آپ اسے دیکھتے ہوئے پڑھتے جا رہے ہوں۔

مولانا کے یہاں مرعوبیت بالکل نہ تھی وہ ڈٹ کر اپنا موقف بیان کرتے تھے، اسلام کی حقانیت واضح اور مدلل انداز میں پیش کرتے،

☆ متعلم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جب حکمراں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے بات کرنے کی نوبت آتی تو مختلف پہلوؤں سے ایسی پرازمعلومات باتیں اور نصیحتیں کرتے کہ وہ حیران رہ جاتے کہ ایک عالم دین ایسی ہمہ جہت معلومات رکھتاہے ، مولانا کی باتوں میں تنقید واستخفاف کا انداز بالکل نہیں تھا،اس لیے سامعین کوکسی طرح گرانی نہیں ہوتی تھی ، ہر جگہ اعتراف و آفریں ہی کے جذبات پائے جاتے تھے۔

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی زندگی ایک عملی آئینہ تھی،جس میں اخلاق وکردار کی بلندیاں واضح طور پر جھلکتی تھیں،ان کی شخصیت نہ صرف علمی حلقوں میں بلکہ عام انسانوں کے دلوں میں بھی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہی، ان کی وفات پر علمی ودینی حلقوں میں چھائی ہوئی ماتمی فضا ان کے اخلاقی اور عملی عظمت کا زندہ ثبوت ہے۔

مولانا جعفر مسعود حسنی رحمہ اللہ کی شخصیت کی یادیں ایک چراغ کی مانند ہیں، جوتاریک لمحوں میں روشنی فراہم کرتی ہیں۔ ان کی زندگی شرافت، نجابت، اورخلوص کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔راقم سطور کا استاد محترم مولانا محمد وثیق ندوی کے توسط سے ان سے تعلق بہت قریبی اور محبت آمیز تھا، مولانا سے دفتر،گھر اور مختلف مواقع پر ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے،ان کی محبت اور مہمان نوازی کے مظاہر خاتون منزل میں کئی بار دیکھنے کو ملے، جہاں وہ گلوب سے چائے اورانواع و اقسام کے ناشتے کے ساتھ ساتھ علمی وفکری گفتگو کے ذریعے مجلس کو جاندار بناتے۔

مولانا کا مہمانوں کے ساتھ خلوص ومحبت کا معاملہ اورسواری تک رخصت کرنے کا اصول ان کے دل کی وسعت کا آئینہ تھا۔ یہ رویہ صرف ہمارے یا چند قریبی لوگوں کے ساتھ خاص نہ تھا، بلکہ ہر ملنے والا یہی محسوس کرتا کہ مولانا انہیں ہی سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ان کا یہی انداز ان کی خاندانی تربیت اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے علمی وفکری ورثے کی جھلک تھا۔

مولانا جعفر مسعود حسنی کی ہمارے رواق ابوالحسن میں آمد ہمیشہ ایک یادگار موقع ہوتی تھی۔ کبھی افتتاحی پروگرام میں ان کی شرکت ہوتی، تو کبھی محاضروں کے ذریعے وہ طلبہ کوعلم وحکمت کے موتی عطا کرتے۔ ان کے آخری دنوں کی یادیں بھی ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔انتقال سے محض تین دن قبل مولانا کو ہمارے تقسیم انعامات کے پروگرام میں شرکت کرنی تھی۔ طلبہ بڑے اشتیاق سے ان کے دست مبارک سے انعام لینے کے منتظر تھے،لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مولانا کا آخری سفر رواق ابوالحسن میں ایک علمی پروگرام کا تھا، جس میں ''اسلام پر ہونے والے اعتراضات'' کے مدلل جوابات پر بحث کی گئی تھی۔ اس منفرد پروگرام کے انعقاد میں مولانا وثیق صاحب کی محنت اور لگن نمایاں تھی۔مولانا جعفر مسعود حسنی اپنی مصروفیات کے باوجود تشریف لائے، اور نہ صرف پروگرام کی ستائش کی بلکہ طلبہ کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق زبان وبیان کے ہنر میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دی، تاکہ معترضین کو ان کی زبان میں جواب دیا جاسکے۔ان کا یہ خطاب یوٹیوب پر آج بھی موجود ہے، جوان کے علم وبصیرت اور طلبہ کے لیے ان کی رہنمائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مولانا جعفر مسعود حسنی اپنے وقت کے ایک منفرد اور شریف انسان تھے۔ان کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوبی ان کی شرافت اور عاجزی تھی۔ وہ نہ بڑے عہدوں کے خواہاں تھے، نہ کسی علمی دعوے کے ساتھ منظرِ عام پر آتے تھے،مولانا کو مدرسہ عالیہ عرفانیہ کے اہتمام کی ذمے داری کے لیے زور ڈالا گیا آپ نے اس ذمے داری سے برأت کا اظہار کردیا، ندوے کی نظارت اس شرط پر بمشکل قبول کرنی پڑی کہ مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب نے ان سے یہ شرط لگا دی تھی اگر آپ قبول نہیں کریں گے تو میں بھی قبول نہیں کروں گا، بالآخر قدرت کو جومنظور تھا آپ نے وہی کیا، ان کی اصل شناخت ان کی شرافت اور انسان دوستی تھی، میزبان ایسے کہ کوء کسر ہی نہیں چھوڑتے حتی کہ ایک مہمان کو ایک دو مہینے قبل اسٹیشن چھوڑنے بھی چلے گئے۔

مولانا حسنی کی زندگی میں اخلاق اور کردار کی جھلک ہر پہلو سے نظر آتی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے شاگردوں کے لیے ایک مثالی استاد تھے بلکہ اپنے ساتھیوں اور عام لوگوں کے ساتھ بھی ایسا شفیق برتاؤ رکھتے تھے کہ ہر کوئی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا،مولانا کا مزاج یہ تھا کہ ندوے میں اکیلے چلتے پھرتے اور تمام طلباء سے سلام کرتے نظر آتے اور مسکراتے ہوئے تپاک سے ملتے، بارہا ایسا ہم نے دیکھا ہے کہ مولانا راستے سے گذر رہے ہیں اور راستے میں ایک نوجوان ملازم نے سلام ہی کردیا تو آپ نے بڑھ کر مصافحہ ہی نہیں کیا بلکہ مسکراتے ہوئے بولے:

اور عبدالغفور صاحب! سب ٹھیک ہے؟

کسی ادارے کے اتنے بڑے ذمے دار کا اپنے ملازمین کے ساتھ ایسا رویہ اس دور میں اس کی مثال ملنا شاید ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے۔

مولانا کے ایک شاگرد لکھتے ہیں کہ:

''ہم نے دینی اداروں میں اپنے اس مرحوم استاد سے بڑھ کر اتنا شریف اور عملی اخلاق کا حامل کسی کو نہ پایا''۔

یہ گواہی ان کی اخلاقی برتری کا منہ بولتا ثبوت

ہے۔مولانا حسنی کی شخصیت میں عاجزی اور سادگی کا عنصر اتنا نمایاں تھا کہ وہ ہر شخص کے دل میں اتر جاتے تھے۔اسی لیے ان کے بارے میں لکھا گیا:

"ان کی شرافت کی شہادت ان کے دوست سے زیادہ ان کے غیر دوست دیا کرتے تھے"۔

یہ بات ثابت کرتی ہے کہ وہ خواص کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کے دلوں میں بھی احترام پیدا کر لیتے تھے۔مولانا نے بیرون ملک ندوے کے روابط کو مضبوط کرنے کے لئے مختلف اسفار کیے جس سے ندوے کو خاطر خواہ فائدہ ہوا اور اس کے اثرات بھی دیکھنے کو ملے،فضلاء ندوہ نے بڑھ چڑھ کر استقبال کیا اور مولانا کے سامنے ہر خدمت کے لیے اپنے آپ کو نچھاور کر دیا۔

مولانا حسنی بطور استاد صرف علم کی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ اخلاق و کردار کا سبق بھی اپنی زندگی کے ذریعے سکھاتے تھے۔وہ شاگردوں کے لیے محض استاد نہیں، بلکہ ایک رہنما اور ہمدرد کی حیثیت رکھتے تھے۔مولانا جامع کمالات کے حامل تھے وہ ہر پہلو میں اپنی مثال آپ تھے،ان کی شخصیت کا سب سے خاص پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے عمل سے شاگردوں کے دل جیت لیتے تھے۔

مولانا حسنی کو عملی صوفیت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔وہ بنا کسی دعوے کے ایسے صوفی مزاج انسان تھے جن کی شخصیت ہر قسم کے تکلفات سے پاک تھی۔ان کی سادگی اور محبت بھرا رویہ ان کے صوفیانہ انداز کی عکاسی کرتا ہے۔"انسان کی اصل عزت عہدوں اور پیسوں میں نہیں بلکہ اخلاق و شرافت کی بلندی میں ہے"۔یہ ان کی زندگی کا بنیادی درس تھا۔

مولانا جعفر مسعود حسنی کی زندگی ایک مکمل نصاب تھی، جو ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ انسان کو شرافت، عاجزی، اور اخلاق کے ساتھ جینا چاہیے۔ ان کی وفات ایک ایسا خلا پیدا کر گئی جسے بھرنا مشکل ہے، لیکن ان کی زندگی کے نقوش ہمیشہ ہمارے لیے مشعلِ راہ رہیں گے۔مولانا علیہ الرحمہ کی شخصیت ان کے اخلاق و کردار کا آئینہ تھی۔ان کی زندگی کا ہر پہلو ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ انسان کی اصل عظمت اس کے اخلاق اور کردار میں ہے۔ ان کی عاجزی، شرافت،اور سادگی نے انہیں ایک عظیم انسان بنا دیا۔

اللہ تعالیٰ مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے،آمین۔

☆☆☆☆☆

..................بقیہ صفحہ ۱۴۲ کا

ڈی ٹی ایس میں عصر بعد کی مجلس میں حضرت مولانا کی ایک اور اہم صفت دیکھنے کو ملی وہ خوش مزاجی کے ساتھ چھوٹوں کی بات سننا اور قابل اصلاح باتوں کی بہترین رہنمائی کرنا تھی، موجود سبھی لوگوں کے تعارف کے بعد جب ہم نے اپنی کتاب تذکرہ الحاج حافظ محمد اقبال پیش کی تو کہنے لگے مجھے اس کی تقریب رسم اجرا میں رہنا تھا لیکن میں بھول گیا تھا، معذرت چاہتا ہوں آج تم نے کتاب دی تو بڑی خوشی ہوئی اور ندوے میں کتاب دکھی تھی لیکن وہ میں حاصل نہیں کر سکا، اس کے بعد ہمارے پوچھنے پر فرمایا کہ میں حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مستقل شاگرد نہیں ہوں البتہ جس وقت میں پڑھتا تھا اس وقت وہ شعبہ کے ذمہ دار تھے بس میری خوش نصیبی یہ ہے کہ ان کی سربراہی میں شعبہ چل رہا تھا اور کہنے لگے کہ ان کے بارے میں کیا تذکرہ کیا جائے وہ تو شخصیت ہی ایسی تھی کہ جتنا ذکر خیر کیا جائے گا اتنا کم ہوگا۔

پیام انسانیت کے تعلق سے جو تذکرہ ہوا، تو پوچھا، کیا ایکٹی ویٹی چل رہی ہے، آج کل؟ اور کہنے لگے ہاں کانپور کے تعلق سے تو آپ کا نام آتا ہے، اس وقت الحمد للہ پیام انسانیت کے کارکن اچھا کام کر رہے ہیں اور کام میں تنوع پیدا ہوا ہے، افادیت بھی نظر آ رہی ہے اور دوسرے مدارس و مکاتب حتیٰ کی تنظیمیں بھی اب اسکے کام کو کرنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں، اس اس ملک میں ہمارے لیے اس سے بہتر پلیٹ فارم اور کوئی نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمان اچھے اخلاق پیش کریں تا کہ بہترین پیغام لوگوں تک پہنچے۔

آخر میں ایک اہم پہلو کا تذکرہ بھی مفید ہوگا، جس وقت آپ ندوۃ العلماء کے ناظر عام نہیں تھے لیکن اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا کرتے تھے، اس وقت ہم لوگوں نے عالیہ رابعہ کی ڈائری بنوانے کے سلسلے میں ملاقات کی، مقصد تھا آپ کی نگرانی اور ذمہ داری میں چلنے والے ادارے، دار الرشید سے شائع ہو، جو آپ کی وجہ سے دیدہ زیب ٹائٹل، خوبصورت ڈیزائننگ، بہترین کاغذ لگانے کی وجہ سے مشہور تھا، اس وقت آپ نے بہترین رہنمائی فرمائی اور عالیشان ڈائری چھپی تھی:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

اللہ رب العزت حضرت مولانا کے انتقال سے ملت اسلامیہ کا جو خسارہ ہوا ہے، اس کو پورا فرمائے اور آپ کی بال بال مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے،آمین۔

☆☆☆☆☆

آہ جعفر چچا! کچھ یادیں کچھ باتیں

محمد معاذ مصباح ☆

۱۵ر جنوری کی شام راقم سطور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد کے باہر نکلا تو اچانک فون کی گھنٹی بجی پہلے تو سوچا کی فون نہ اٹھاؤں لیکن پھر خیال آیا کہ پتہ نہیں کیا کام ہو تو فون اٹھالیا اس نے برجستہ بولا کہ معاذ سنا ہے کہ حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی کا انتقال ہو گیا ہے یہ سننا تھا کہ مانو ایک دم بجلی سے گری اور ایک دم سکتا طاری ہو گیا اور پہلے تو یقین نہ ہوا اور اس سے الٹا دریافت کیا کہ یہ تم کیسے کہہ رہے ہو تمہارے پاس اس کی کوئی تصدیق ہے ابھی اسی سے بات کر ہی رہے تھے کہ ایک دم طلبہ کی بھیڑ دارالعلوم کے مہمان خانے کی طرف بھاگتی ہوئی نظر آئی تو میں بھی ان کے پیچھے ہولیا تو وہاں اساتذہ اور دیگر کو پریشان حال دیکھا تو تھوڑا یقین سا ہوا؛ لیکن پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا اور یقین ہو بھی کیوں؟ کیونکہ ابھی مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی کی جدائی کے غم سے آنسو خشک بھی نہ ہو پائے تھے کہ اجل سے دوسرا ابلاوا آگیا اور امید بھی یہ تھی کہ مولانا ایک کافی لمبے عرصے تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کو نئی بلندیوں تک لے جائیں گے اور مولانا کی سرپرستی میں دارالعلوم نئی بلندیوں کو چھوئے گا موت ایک حقیقت ہے جسے ہر ذی روح کو اس کا مزہ چکھنا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے: ''کل نفس ذائقۃ الموت''، اور اسی کے آگے اللہ تبارک وتعالیٰ سورہ رحمٰن میں یوں فرماتا ہے: ''کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربك ذو الجلال والاکرام'' موت یقینی ہے موت ایک اٹل حقیقت ہے، جس کا جام ہر ذی روح کو پینا ہے؛ لیکن جس شخص کے بارے میں کوئی وہم وگمان نہ ہو اور جس سے بہت امیدیں وابستہ ہوں اس کا اس طرح سے اچانک چلے جانا ایک بڑے سانحے سے کم نہیں چونکہ یہی جنوری کا مہینہ اور سن ۲۰۱۹ء کا سال تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم اور بے پناہ صفات کے حامل حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کا انتقال ہوا اور ۱۵ر جنوری سن ۲۰۲۵ء کو ان کے اکلوتے فرزند دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظر عام، رابطہ ادب اسلامی برصغیر کے صدر، دارالعلوم سے نکلنے والا مشہور جریدہ 'الرائد' کے چیف ایڈیٹر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن اور بہت سی تنظیموں اور اداروں کے سرپرست حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، یہ خسارہ مولانا کے خاندان اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ارباب انتظام کو بھی اور مجھے بھی ذاتی طور پر محسوس ہوا، مجھے مولانا کے اخلاق کریمانہ اور سادگی کے سبب ان سے خاص انس تھا، مولانا کا حسن سلوک ہی تھا جس کے سبب خبر سنتے ہی عجیب سی بے چینی ہو گئی اور مانو کہ اپنے خاندان کا اپنا ایک عزیز چلا گیا، آخرکار کچھ منٹوں میں سوشل میڈیا پر اور بعض احباب سے مولانا کے حادثاتی موت کی ویڈیوز دیکھنے کو ملیں جن سے مولانا کی رحلت یقینی ہو گئی کیونکہ کافی دیر تو یقین کر پانا مشکل تھا اور دل میں یہی تمنا تھی کہ کاش یہ خبر جھوٹی ہو؛ لیکن والد صاحب اور دیگر کے فون پر گفتگو سننے کے بعد یقین ہو گیا کہ مولانا داغ مفارقت دے گئے ہیں اور داعی اجل کو لبیک کہہ دیا ہے۔

حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بہت سادہ مزاج انسان تھے، سادہ زندگی اور بے لوث زندگی جیتے تھے، مولانا کم گو تھے؛ لیکن جو بولتے ہیں صاف صاف دوٹوک بولتے ہیں، مولانا کے اخلاق کی اگر بات کی جائے تو گویا کہ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ساری صفات ان کے اندر آگئی تھی کیونکہ مولانا سے میرا ذاتی تعلق تھا اور مولانا ایک گھر کے فرد کی طرح تھے جب بھی مولانا سے میری ملاقات ہوتی تو کافی دیر تک اور ایک دوستانہ انداز میں ہوتی، کبھی بھی مولانا سے مل کر یہ نہیں لگا کہ مولانا کسی منصب عالی پر فائز ہیں، کبھی بھی مولانا تصنع وتکلف کو حائل نہیں ہونے دیتے، مولانا جب بھی ملتے خوش اخلاقی، نرم روی اور اخلاق عالیہ کا بہترین مظہر پیش کرتے، مولانا سے مل کر اپنائیت سے محسوس ہوتی اور مولانا سے بعض معاملات میں مفید مشورے بھی دیتے اور مولانا سے ہر طرح کے سوالات چاہے ان کا تعلق سماجیات، سیاسیات یا کسی سے بھی ہوتا، مولانا ان کا بہت ہی خوش مندی اور چہرے پر بنا شکن آئے جواب دیتے، یہ بڑی خوبی ہے اور سینکڑوں خامیوں پر بھاری خوبی ہے، مولانا درس و تدریس سے سبک دوش ہو کر دارالعلوم ندوۃ العلماء آگئے تھے، اب وقت آیا تھا کہ تحریر وتقریر کے جوہر کھلتے اور دنیا ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتی، فکرو دعوت کے سوتے پھوٹتے، تاریخ ندوہ کے صفحات گواہ بنتے؛ لیکن افسوس! تقدیری فیصلوں کو کون ٹال سکتا ہے، تقدیر کے اس فیصلے نے تاریخ کے اس باب کا خاتمہ بالخیر لکھ دیا، مولانا تو ابھی آئے تھے، ابھی رونق بزم بنے تھے، کس نے سوچا تھا کہ اتنی جلدی محفل سے اٹھ جائیں گے، بزم سونی کر جائیں گے، یادگار بن جائیں گے کہ لوگ بس حیرت سے تکتے رہ جائیں گے۔

☆ متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

کوئی نالا کوئی گریاں کوئی بسمل ہو گیا
اس کے اٹھتے ہی دگرگوں محفل ہو گیا

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ اپنے والد محترم کی امانتوں کے امین تھے۔ علم وعمل کے جامع تھے۔ ندوۃ العلماء کی فکر کے حسین پرتو تھے۔ اتحاد و یگانگت کے داعی تھے۔ خانوادہ علم اللہی کے سرپرست ونگراں تھے۔ نام ونمود سے دور اور عہدہ ومنصب کی چاہ سے مستغنی تھے۔ علم و حکمت کے بحر بیکراں مفکر اسلام کے تربیت یافتہ اور ان کے امین و جانشین یکجاں دو قالب کے مصداق ندوہ کو ایک طویل عرصہ تک فیض پہنچانے والے اردو عربی کے یکساں ماہر سابق ناظم ندوۃ العلماء مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ اور سابق معتمدِ تعلیم ندوۃ العلماء مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمہ اللہ کے جانشین و پروردہ تھے۔ اردو میں اگر اسلوب ماجدی کے پرتو تھے تو عربی دانی بھی کم نہ تھی۔ مولانا کی تصنیف 'اخی العزیز' اور 'الرائد' میں مولانا کے قلم وقرطاس سے بکھرتے ہوئے جوہر دیکھے۔

جب بھی مولانا سے ملاقات ہوتی تو معاذ بھائی کہہ کر اور مسکراتے ہوئے ملتے بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ ہم مولانا کو دیکھ نہیں پائے اور مولانا سے کچھ دوری پر کھڑے تھے، مولانا خود چل کر آئے اور مصافحہ کا ہاتھ بڑھا کر مسکراتے ہوئے ملے تو اندر سے بڑی شرم سے محسوس ہوئی کہ مولانا خود اتنے بڑے ہوکر مل رہے ہیں؛ لیکن یہ مولانا کا تواضع تھا جس نے ہم کو مولانا کا اور گرویدہ بنا دیا، اس کے علاوہ مولانا کے ساتھ مختلف جگہوں کے اسفار ہوئے، وہاں بھی مولانا کی سادگی اور خوش اخلاق کی دیکھنے کو ملی، مولانا کے ساتھ رہ کر کبھی یہ نہیں لگتا کہ وہ اتنے بڑے عہدہ پر فائز ہیں اور جب بھی ملتے للک کر اور مسکرا کر ملتے، مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مولانا سے اور گہرا تعلق ہو گیا اور کوئی بھی علمی یا غیر علمی سوال ہوتا تو مولانا سے بے جھجک پوچھ لیتا تو بڑے غور سے سوال سنتے اور اس کے بعد مسکراتے ہوئے مختصر پر مغز جواب دیتے اور بعض دفعہ یہ ہوا کہ ایک علمی مسئلہ پیش آیا تو مولانا کو میسج کیا، چونکہ مولانا ندوہ میں موجود نہیں تھے اور شروع سے راقم کا یہ معمول رہا ہے کہ کسی کو فون کرنے سے پہلے اسے میسج کر دیا کرتا ہوں کہ پتہ نہیں وہ کس کام میں مشغول ہو اور میرا فون کرنا اس کام میں مخل ہو، ابھی میسج کیے کچھ وقت بھی نہ گزرا تھا کہ مولانا نے فوراً پلٹ کر فون کیا اور وہی اپنے انداز میں گویا ہوئے، اس کے علاوہ بھی معتدد بار اسکا تجربہ رہا کہ جب جب مولانا سے کچھ پوچھا تو مفید مشورہ دیتے، ایک مرتبہ مولانا سے گفتگو چل رہی تھی تو راقم نے مولانا سے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا کہ ایک غیر مکتبہ فکر کا لڑکا ہے اور اس کو ندوۃ العلماء کے بارے میں بتایا تو مولانا نے فوراً کہا کہ اس کو مجھ سے ملوانا، ہوسکتا ہے اس کا ذہن تبدیل ہوجائے اور مولانا کے سمجھانے کا طریقہ بھی بہت بہتر تھا، اسی طرح سے میں مُرشِد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا اور مولانا کے اندر مولانا رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تمام خصوصیات تھیں اور عربی زبان وادب میں اپنے والد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مثل تھی، حالات پر گہری نظر رکھنے والے اور کم گو تھے اپنے اسلاف کے سچے امین تھے:

موت کہتے ہیں جس کو اے ساغر
زندگی کی کوئی کڑی ہوگی

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی رحمۃ اللہ علیہ کا عکس تھے، انہیں کی طرح کم گو، دور اندیش و دوربیں تھے، مولانا بہت سادہ مزاج انسان تھے، سادگی سے جیتے اور ندوۃ العلماء کے ناظر عام بننے کے بعد بھی یہ سادگی مولانا کا شعار رہی، نہ کوئی کر و فر نہ کوئی نام ونمود کی خواہش اور بارہا اس کا مشاہدہ ہوا، ایک دفعہ کا واقعہ ہے: مولانا بلال حسنی ندوی اور مولانا جعفر صاحب کو ایک جلسے میں مدعو کیا گیا، مولانا کچھ دیر کے بعد جلسے میں پہنچے اور خاموشی سے آکر اخیر میں بیٹھ گئے، جب منتظمین کی نظر پڑی تو مولانا سے اصرار کیا؛ لیکن ان کے لاکھ اصرار کرنے کے باوجود مولانا اپنی جگہ پر بیٹھے رہے، نہ چہرے پر کوئی شکن اور مسکراتے یہی کہتے رہے کہ یہاں پر صحیح ہے، یہیں پر بیٹھا رہنے دو۔ مولانا سے راستے چلتے کوئی بھی سوال کرو، مولانا خوش اسلوبی اور نہایت خوش اخلاقی سے اس کا جواب دیتے ہیں، مولانا کے انتقال سے پہلے ۱۳ر جنوری کو میری مولانا سے ملاقات ہوئی، وہی اپنے پرانے انداز میں مسکراتے ہوئے ملے، کسی کو کیا پتہ کہ یہ آخری ملاقات ہے، گمان میں نہیں تھا کہ یہ ستارہ ٹوٹ جائے گا، چراغ جلنے سے پہلے بجھ جائے گا، یہی زندگی ہے۔

مولانا کے مزاج میں ہی سادگی نہیں تھی؛ بلکہ یہ سادگی ان کی تحریروں میں بھی نمایاں تھی، عربی انشاء پر انکو خاص دسترس حاصل تھی اور اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ 'الرئد' کے مدیر اور رابطہ ادب اسلامی کے صدر ہو گئے تھے۔

خدا تعالیٰ ان پر رحمتوں کی بارش کرے، اُن کے سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے، اپنے یہاں اعلیٰ وارفع مقام عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

بوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل

محمد نفیس خان ندوی ☆

زندگی اگر نعمت ہے تو موت بھی کسی نعمت سے کم نہیں، کیونکہ زندگی کا بھرم اگر کسی چیز سے قائم ہے تو وہ موت ہی ہے، امیدوں کے چراغ جلائے ہی جاتے ہیں بجھانے کے لیے، لیکن موت سے شکوہ اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب کم بخت وقت بے وقت آتی ہے اور امیدوں کا شیش محل چکنا چور ہوجاتا ہے، مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ کا انتقال بھی ایسا ہی صدمہ ہے، کسے معلوم تھا کہ انسانیت کا بے لوث خدمت گذار، اسرار قرآنی کا رمز شناس، زبان وبیان کا دھنی، ندوی افکار ونظریات کا ترجمان اور سعی وعمل کا یہ آتش فشاں اس قدر جلد خاموش ہوجائے گا، جس نے بھی سنا دم بخود رہ گیا، نہ کانوں کو یقین اور نہ دل ودماغ کو یاوری ع

تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے!

زمانہ چکر لگاتے لگاتے دور پر دور گذار دیتا ہے پھر کوئی نادر الوجود بروئے کار لاتا ہے، جو فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر نئے راستے ہموار کرتا اور کئی منزلوں کا نشان بناتا ہے، اس کے افکار ونظریات، اس کی غیر معمولی انسانی خدمات، اس کی ذاتی و انتظامی خصوصیات ایسا آئینہ بن جاتی ہیں جسے سامنے رکھ کر آنے والی نسلیں اپنے خط وخال کو آراستہ کرتی ہیں۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ کی شخصیت ہماری علمی وادبی اور معاشرتی وتہذیبی زندگی کے کئی حوالوں سے قابل تحسین ولائق مطالعہ ہے، ان کی ذات میں علم ودانش اور للّٰہیت وانسانیت کی ایسی اعلیٰ صفات یکجا ہوگئی تھیں کہ اب اس طرز کی شخصیت دور دور تک نظر نہیں آتی، جب تک رہے اخلاقی اصول وایمانی صداقت پر قائم رہے، زندگی کی کٹھن و پیچیدہ راہوں میں نہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ دور اختیارات میں کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ ہاں! ان کی شرافت وبصیرت، اور حسن اخلاق وحسن عمل کی حکمرانی ہم سب کے دلوں پر کل بھی تھی اور آج بھی ہے، ایسی حکمرانی جو دلنوازی و دل داری کے معنی سمجھاتی ہے، ادب واحترام کا سلیقہ سکھاتی ہے اور آدمی کو سچا انسان بناتی ہے۔ ایک جملہ میں اگر کہہ سکوں تو مولانا ایک جامع کمالات اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، یہ ہمہ جہتی اور ہمہ گیری اسلامی روایات کا حصہ ہے اور مولانا جعفر صاحبؒ اس روایت کے سچے نمائندہ تھے۔

مولاناؒ ایک باکمال عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محفل آرا، شگفتہ بیان، بذلہ سنج اور خوش طبع انسان تھے، ان کی شگفتگی اور خوش طبعی دراصل ان کی انسان دوستی اور انسان نوازی کا مظہر تھیں، ظرافت اور بذلہ سنجی نے ان کی شخصیت میں ایسی لچک اور لطافت پیدا کردی تھی جو ان کے وسیع اور وقیع علم کو خشکی اور بوجھل پن سے آزاد رکھتی ہے۔

مولاناؒ کی زندگی کے ہر پہلو میں انسان دوستی سب سے نمایاں نظر آتی ہے، وہ لوگوں کے ذہنی انتشار اور الجھنوں پر متاسف ہوتے، ماحول سے مایوس ہونے کے بجائے اس کو بدل دینے کی سعی کرتے، اپنوں اور غیروں سے بالکل انسانی سطح پر ملتے تھے، انداز گفتگو اور رویے میں غریب اور امیر عالم اور عاصی کے درمیان کبھی تفریق نہ ہوئی، ہر شخص سے بطور انسان سلوک کیا، نہ صرف گھر والوں بلکہ دوست احباب سے بھی بہت اچھی طرح پیش آتے اور جب تک کوئی نا اہل ثابت نہ ہوجاتا اس کی عزت کرتے اور اس کے نقطہ نظر کی تعریف کرتے۔

یوں تو میں ان کو برسوں سے جانتا تھا، گھنٹوں ان کے ساتھ محفلوں میں بیٹھا ہوں، شعر وشاعری، طنز ومزاح، ظرافت وسیاست، مولانا جعفر صاحبؒ ہلکی مسکراہٹ، نرم لہجہ اور غیر معمولی ذہانت کے ساتھ ان محفلوں کی جان ہوتے، ان کے ساتھ بیٹھ کر ایسا لگتا تھا ہم خود بھی اور زیادہ ذہین اور دلچسپ ہوگئے ہیں، مولانا کی زندگی میں سادگی عجز وانکسار بہت نمایاں تھا، نہ کسی پر علمیت کا رعب جماتے اور نہ ہی اپنے اپ کو بہت بڑا عالم وفاضل یا ذمہ دار گردانتے! میری یہ بات نہ انوکھی وضع ہے اور نہ مبالغہ پر مبنی ہے، ایک ایک وصف یا قدر کی مثالیں جستہ جستہ نہیں دستہ دستہ موجود ہیں۔

انتہا درجے کی ذہانت اور علمیت کے باوصف اخلاق حمیدہ کی فراوانی سے بھی اللہ نے انہیں نوازا تھا، وہ ایک شفیق باپ، بااخلاق بھائی، ہمدرد دوست، باوفا شوہر اور رحم دل منتظم تھے، طبیعت میں انکسار کا مادہ تھا، تواضع میں یوں دکھائی دیتے جیسے پھلوں سے لدا ہوا درخت نیچے جھکا جائے، جس بات کو سچ سمجھا اسے نامساعد حالات کے باوجود کر گزرے، اور جو بات اسلامی اصولوں کے خلاف نظر آئی تو بہت قیمتی شئی کو بھی تج دیا، علامہ اقبال نے ایسے جوانمردوں کے بارے میں کہا تھا:

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

کیا بوڑھا کیا بچہ، کیا امیر کیا غریب، کیا ہمتا یا پردیسی، کیا اپنا کیا پرایا، شاید ہی کوئی ایسا تھا جو ان کی خوش اخلاقی سے متاثر نہ ہوا ہو، آپ بردبار، متحمل مزاج اور رحم دل واقع ہوئے تھے، طبیعت میں انتہا درجے کی سادگی

☆ استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

تھی، کوئی کسی کی برائی کرتا تو اس کی بات پر کان نہ دھرتے، شاید یہی وجہ تھی جو ہر طبقہ میں ہر دل عزیز تھے، سخت سے سخت بات کو اس طرح کہہ جاتے کہ محسوس ہی نہ ہوتا، جھگڑوں سے کوسوں دور بھاگتے، اگر کبھی نقصان ہو بھی رہا ہوتا تو درگزر کرتے، اپنے دوستوں سے خلوص اور خندہ پیشانی سے پیش آتے، جس طرح پہلے دن سے کسی سے ملتے آخری دم تک اسی روش پر گامزن رہتے۔

مولاناؒ کی طبیعت، فکر اور وجدان دونوں سے یکساں طور پر ہم آہنگ تھی، اور یہ دو مختلف النوع صفات ان کی ذات میں ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک ہی وصف بن گئی تھی، وہ علم و شعور کے کسی بھی شعبہ میں قدم زن ہوں فکر اور وجدان ایک تخلیقی عنصر کی حیثیت سے ان کے ہمراہ نظر آتے ہیں۔

مولانا جعفر صاحبؒ ایک جوہر شناس انسان تھے، چہروں کے پڑھنے کا ہنر جانتے تھے، ہر شخص کی انفرادی صلاحیت کا اندازہ کرتے، اس کی قدردانی کرتے، اور اس کی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتے۔ ایک کامیاب منتظم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہو، ان کی ترقی و نشو و نما میں کوشاں رہے، ہر ایک سے وہ کام لے جو وہ دوسروں سے بہتر کر سکتا ہو، ہر ایک کو اپنے سے قریب رکھے اور کسی کو ایک کو دوسرے سے متصادم نہ ہونے دے۔ جعفر صاحبؒ جب ندوۃ العلماء کے ناظر عام مقرر ہوئے تو یہی وہ خوبیاں تھیں جنھوں نے ان کی کوششوں کو غیر معمولی کامیابی بخشی۔

مولانا قدیم صالح اور جدید نافع کا بہترین سنگم تھے، اس اعتبار سے ”قدامت پسند“ تھے کہ ان کے نزدیک تمام معاملات کا اصل ماخذ و مرجع کتاب و سنت ہے، اسی کی روشنی میں اپنے لیے تقدم و ترقی کا راستہ اختیار کرنا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہی وہ عصری تقاضوں اور دور جدید کے مسائل سے بھی کسی صورت میں روگرداں ہونے کو تیار نہیں، ان کا بنیادی نقطۂ فکر یہ تھا کہ کوئی فرد یا معاشرہ اپنے عہد کے مسائل اور اس کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے سفر حیات کی طویل اور کٹھن منزلیں ہرگز طے نہیں کر سکتا، پیش آئند مسائل کے حل و کشود کے لیے جہاں کتاب و سنت کی رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے وہیں جدید وسائل، نئے موضوعات اور تغیر پذیر سیاسی افکار و نظریات سے واقفیت بھی لازم ہے، اور یہ باتیں ان کے مضامین میں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔

مولانا جعفر صاحبؒ ایک باکمال عالم دین تھے، بہترین انشاپرداز، منجھے ہوئے قلم کار، اردو عربی دونوں زبانوں کے بیک وقت شہسوار تھے، اس پر مستزاد بہترین خطیب بھی تھے، عام طور پر تحریر و تقریر دونوں خوبیاں ایک شخص میں مجتمع نہیں ہو پاتیں، یہ مولانا کا ہی کمال تھا کہ پوری زندگی سفید اوراق پر اپنے افکار و نظریات کو اتارنے میں گذاری، ایک سیال قلم کار اور ایک ماہر مترجم کی حیثیت سے معروف رہے، کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کے پہلو میں ایک بہترین خطیب بھی سانسیں لے رہا ہے، ذمہ داریوں کا بوجھ جیسے ہی کاندھے پر آیا مولانا ایک ماہر خطیب کی حیثیت سے جلوہ نما ہوئے اور دیکھتے دیکھتے ملک و بیرون ملک ایک کامیاب داعی اور ندوۃ العلماء کے بہترین ترجمان بن گئے۔

مولانا کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحتیں وافر مقدار میں ملی تھیں جو کامیاب خطیب بننے کے لیے درکار ہیں، ان کے علم و فضل اور عربی و اردو پر ان کی قدرت کے سب معترف ہیں، طلاقت زبان اور قوت بیان کے ساتھ انہیں بے مثل حافظہ کی نعمت بھی حاصل تھی اور یہی چیزیں کامیاب و مؤثر خطابت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ مولانا جب لکھنے یا بولنے بیٹھتے تو کہیں سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ الفاظ کے انتخاب میں وہ کسی تکلف کو راہ دے رہے ہوں، ان کے قلم و بیان کی روانی سے یہی باور ہوتا کہ الفاظ اپنے وسیع حلقۂ الفاظ سے منتخب ہو کر نہایت ادب سے قطار بن کر ان کے حضور کھڑے ہیں، پھر ان کا قلم حسن آشنا انتہائی سلیقے اور دلکش ترتیب سے جملوں اور فقروں کو خوبصورت لڑی میں پروتا جاتا ہے، شروع سے آخر تک یہ سلسلہ پورے وقار اور تمام لوازم احترام کے ساتھ جاری رہتا، جو بات کہتے یا لکھتے اس میں ذاتی اپج اور اجتہاد کا رنگ ہوتا، ادبیات و اسلامیات کے ہر اہم مسئلہ پر اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے، مسائل کی تہ تک پہنچتے اور بہت سی ایسی ضمنی باتوں کی نشاندہی بھی کرتے جاتے جن پر عموماً لوگوں کی نظریں نہیں پڑتیں۔

جو لوگ مولانا جعفر صاحب کی صحبت سے فیضیاب ہو چکے ہیں وہ اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ جعفر صاحبؒ کی علمیت کا اندازہ ان کے مضامین سے ہرگز نہیں لگایا جا سکتا، علم و فضل کا یہ دیو کتاب کے قلعے میں مقید نہیں ہو سکتا تھا معمولی معمولی مسائل پر ان کی گفتگو علم کے دریا بہاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ نرم سیر دریا کی تہ میں سمندروں کی طغیانی پوشیدہ ہے، ذوق سلیم رکھنے والے اہل علم حضرات ان کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔

مختصر یہ کہ مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ مادر ندوہ کے قابل فخر سپوت تھے، وہ ایک دلکش اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے، بڑے شریف، دیندار اور باحمیت آدمی تھے، جوں جوں وہ اعلیٰ تر مدارج حاصل کرتے گئے ان کی خوش طبعی اور خوش خلقی اور انسانی ہمدردی کے جذبات و اوصاف اور نکھر کر ان کی شخصیت کی جاذبیت میں اضافہ کا باعث ہوتے گئے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کو ان کی نیکیوں کا اپنے شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

منظوم خراجِ عقیدت

ادیب الرحمٰن غزالیؔ ندوی
کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی، ندوۃ العلماء لکھنؤ

نبیؐ کے خانوادے سے جو رشتہ رکھنے والا ہے
چھڑا اس کے ہی دم سے آج اِک غم کا فسانہ ہے

عیاں کردار اِک ایسا ہے اس غم کی کہانی سے
ہے عالم محوِ حیرت جس کی مرگِ ناگہانی سے

زمین و آسماں خاموش ہیں اُس کی جدائی پر
اُداسی چھا گئی ہے جیسے دنیا کی جوانی پر

محبت جن کو تھی ہم سے رکھا تھا جوڑ کر ہم کو
یقیں آتا نہیں رخصت ہوئے وہ چھوڑ کر ہم کو

خموشی مجلسوں پر ہے تو سونی محفلیں ساری
خبر رحلت کی سن کر ایسا سکتہ ہو گیا طاری

سجھائی کچھ نہیں دیتا اندھیرا چھا گیا ایسا
چراغ اِک خاندان بوالحسنؒ کا گل ہوا ایسا

عمل میں علم میں اونچا تھا رتبہ، تھے بہت فائق
نمونہ تھے سلف کا اور ان کے جانشیں لائق

وہ خوش گفتار، خوش اطوار اور کردار کے غازی
وہ پابندِ صلاۃ و صوم دین اسلام کے داعی

قلم کی نوک سے جس نے بکھیرے ہر طرف موتی
چمک سے جس کی ہر سو روشنی ہی روشنی پھیلی

تری نسبت یہ تیری زندگی رشک زمانہ ہے
تو فرزندانِ ندوہ کے لیے بھی اِک نمونہ ہے

نگاہوں کو ترے جیسا یہاں کوئی نہیں دکھتا
ترا ہمسر نہیں دکھتا ترا ثانی نہیں دکھتا

بہت ہی جاں گسل پر سوز بھی ہے سانحہ تیرا
زبانِ اہل ندوہ پر ہے جعفرؒ تذکرہ تیرا

تمہاری پرورش کا مرحلہ کتنا نرالا تھا
کہ تو آغوش میں رابعؒ کے اور واضحؒ کے کھیلا تھا

نجابت سے ترے خلق حسن کو آشنائی تھی
تجھے حمزہؒ و عبداللہؒ کی حاصل رہنمائی تھی

جدائی سے ترے کتنے ہی زخموں کو لگے نشتر
بلالِؒ پارسا کا بھی ہے ریگِ گرم کا بستر

زبان عشق پر لیکن ہو اللہ احد ہی ہے
نگاہوں میں الٰہی بس تری ذات صمد ہی ہے

گلہ کچھ ہے زمیں سے اور نہ شکوہ آسماں سے ہے
مثال اِک مرد مومن کی نہیں آہ و فغاں سے ہے

عطا ہو صبر کا جام اے خدا ان ماہ پاروں کو
خلیلؒ و عبدحیؒ کو اور امینؒ کے چاند تاروں کو

ترے اعمال کا عقبیٰ میں جعفرؒ بول بالا ہو
خدایا جنت الفردوس میں تیرا ٹھکانہ ہو

غزالیؔ ہے مقامِ بندگی صبر و اطاعت ہو
اسی کی ہے رضا لازم، مصیبت ہو کہ راحت ہو

☆☆☆☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date May - June 2025

تاریخ مئی - جون ۲۰۲۵ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین ودنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا